تغزل

تیسری منزل

(افسانے)

ہاجرہ مسرور

تیسری منزل

حلیمہ بائی بلڈنگ کی چوتھی منزل کے خوبصورت فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے حلیمہ بائی کو ایک دم غصہ آ گیا۔ انہوں نے وفد کے لیڈر دلی والے کی فصیح و بلیغ شکایات سننے کے بعد سر ہلا کر کہا۔

"ہمن ہم کسی کو بولنے کا کس طرح ایک دم مان لیں گے........ فیر دیکھو بابا کوئی آ کر تمہارے گھر کر کچھ بولیں گا تو ہم پہلے اس کا تپاس کریں گا فیر (پھر)"

دلی والے ایک دم گرم ہو گئے۔

"پھر آپ اسے نہیں نکالیں گی تو ہم پولیس کی اطلاع دیں گے........ یہ بھی کوئی بات ہے کہ شریفوں کے رہنے کی جگہ پر........"

"او بابا گرم کیوں ہوئیں گا وہ ہمارا کے والا نہیں لگتا ہم بولا پہلے تپاس کریں گے........" یہ کہہ کر حلیمہ بائی نے اپنے کارندے کو بلایا اور اسے بظاہر سخت آواز میں تحقیق کرنے کا حکم دے دیا........ اس کے بعد دلی والے کی قیادت میں وفد والے حلیمہ بائی بلڈنگ سے نیچے اتر گئے۔

حلیمہ بائی نے زور سے دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ یہ ان کی دادی کی ملکیت تھی اسے دیکھ کر انہیں اپنی بوڑھی زرد رو دادی یاد آئی جس کے مرنے کا انہیں بہت عرصے انتظار کرنا پڑا تھا........ رابعہ بائی بلڈنگ بھی میلی زردی تھی۔ بدرنگ کھڑکیاں ٹوٹے شیشے اور ہلتے ہوئے چوبی زینے وہ ہمیشہ اپنے کارندے سے کہا کرتیں "یہ بلڈنگ گریں گے تو ہم اس جگہ آٹھ منزل کا بڑا بڑا فلیٹ والا بلڈنگ بنائیں گے آج کل کو چھوٹا چھوٹا کمرہ کرائے پر اٹھانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ بڑا ہو تو امریکی لوگ اصل سے دس گنا کرایہ دیں گا۔"

لیکن یہ بلڈنگ موجود تھی۔ اس میں بال روم ڈانسنگ کی ماہر مس ڈورتھی پریرا رہتی تھی........ اور ابھی جس کی شکایت لے کر اس کی بلڈنگ کے لوگ آئے تھے........ حلیمہ بائی کو افسوس سا ہوا کیونکہ مس ڈورتھی رابعہ بائی بلڈنگ کی سب سے پرانی لیکن سب

سے بہتر کرایہ دار تھی....... حلیمہ بائی کے کارندے نے جب بھی جھوٹوں کرایہ بڑھانے کو کہا' ڈورتھی نے اسے قبول کر لیا۔ وہ سالانہ سفیدی وغیرہ کے روپے بھی کرائے میں نہ کاٹتی۔

"اکیلی ہے مگر اس کے گھر کبھی کوئی دنگا بھی نہیں ہوا" حلیمہ بائی اپنے جی میں کہہ رہی تھیں....... ان کی آنکھیں بار بار مس ڈورتھی کے کمروں پر اٹھتیں' جن کی پیشانی پر اس نے نیلا پینٹ کرا رکھا تھا....... جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے سارے شیشے سلامت اور صاف تھے۔

مگر یہ گندگی کا قصہ نہیں تھا۔ اگر ایسا سوال اٹھتا تو دلی والے کے کمرے کے سامنے کوریڈور میں سب سے زیادہ گندگی بکھری رہتی تھی....... بلکہ ساری بلڈنگ ہی گندگی کی پوٹ تھی....... گراؤنڈ فلور پر "فینسی شو میکرز" کے ہاں سے پھینکی ہوئی چمڑے کی کترنیں فٹ پاتھ پر بکھری رہتیں' دوسری منزل کی بوہرہ خاتون جھینگا مچھلی کی ٹانگیں اور مونچھیں توچ کر ہمیشہ زینے پر پھینک آتیں۔ اور ان کے پڑوس کے کمرے میں رہنے والے مسٹر ڈگلس وائلن کی مشق کرتے کرتے کھانستے تو ہمیشہ دوڑ کر بوہرہ خاتون کے دروازے پر تھوکتے....... پھر تو شاید تیسری منزل کی بھولی بھالی میمن زینب بائی بھی اس چکر میں آجاتی جو ایک اچھی پڑوسن تھی۔ لیکن اپنے بچے کا پاخانہ کاغذ میں لپیٹ کر ڈورتھی کے گھر کے سامنے پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں چپکے سے ڈال دیا کرتی تھی۔

"تو لوگ کا دماغ پھر گیا ہے اپنا کام نہیں کرتا......." حلیمہ بائی نے رابعہ بائی بلڈنگ کے رخ پر کھلنے والی کھڑکی کا پردہ گھسیٹ دیا اور بیٹھ کر اپنے سیاہ دوپٹے پر فیتہ ٹانکنے لگیں۔

حلیمہ بائی کا کہنا ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔ مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں میں سوائے مس ڈورتھی پریرا کے کوئی ایسا نہ تھا جسے صرف اپنے آپ سے مطلب ہو۔ یہاں مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ اس لیے ہر شخص خود کو بھول کر دوسرے کو کھوجنے کی فکر میں رہتا....... لیکن مس ڈورتھی پریرا اپنے آپ میں اتنی مست رہتی کہ لوگوں کے لیے پراسرار حد تک دلکش بن گئی....... مرد اس پر عاشق تھے اور عورتیں حاسد۔ بلڈنگ کی سب عورتیں ڈورتھی کی چال ڈھال اور لباس کی نقل کرتیں۔

وہ عموماً دن بھر اپنے گھر میں رہتی۔ ململ پوڈر میں بسی بڑے بڑے پھولوں والے پرانے جاپانی کمونو میں ملبوس لکڑی کی جاپانی کھڑاؤں پر وہ یوں چلتی جیسے سمندری لہروں پر کوئی بادبانی ڈونگا' جانے یہ جاپانی کھڑاؤں کے تلے کی تراش کی وجہ سے تھا یا کیا' بہر حال یہ چال غیر معمولی تھی۔ جسے اس کی پڑوس کے دلی والے کی جوان ہوتی ہوئی بیٹی بہت غور سے دیکھتی اور اپنی ماں رضیہ بیگم کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی کہ "اے بی اس کا مٹکنا کیا آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی ہو....... اس سے تو پردہ جا کرہ ہے......." مگر مس

ڈورتھی کو کس پردے وردے کا خاک خیال آتا....... وہ صبح صبح اٹھ کر کوریڈور سے اپنے ملازم چھوکرے کو اٹھاتی اور پھر نہ صرف اپنے فلیٹ کی صفائی آپ کرتی بلکہ اپنے سامنے چھوکرے کو اٹھاتی اور پھر نہ صرف اپنے فلیٹ کی صفائی آپ کرتی بلکہ اپنے سامنے چھوکرے سے کوریڈور کی بھی خبر لوا ڈالتی....... اس بلڈنگ کی جمعدارنی تو ایسی کام چور تھی کہ فلش بھی ٹھیک طرح دھو کر نہ جاتی کجا کوریڈور کی صفائی؟....... رضیہ بیگم اس صفائی پر برا مانتیں' کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ سب اپنے یاروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حالانکہ ڈورتھی کی دوسری پڑوسن میمن زینب بائی کا کہنا تھا کہ اگر مس ڈورتھی کے ہاں آنے والے اس کے یار ہوتے تو کبھی رات کو تو رکتے؟

"دن کو جو آتے ہیں؟ اے بی یہ بھی کوئی بہو بیٹی ہے کہ رات کے اندھیرے میں میاں صورت دیکھے جیسی تو حرام ہے......."

رضیہ بیگم منطق چھانٹتیں۔ اور زینب بائی جھلا کر چپ ہو جاتیں۔

اب اس بات پر کیا بحث؟ یہ تو ساری بلڈنگ والے جانتے تھے کہ مس ڈورتھی کے گھر جہاں کبھی کوئی مرد آیا تو کمرے کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا نظر آنے لگا....... دروازہ بند ہوتو سمجھو ڈورتھی گھر میں اکیلی ہے۔ اور جب وہ اکیلی ہوتی تو اس کی پڑوسنوں کو خبر ہوتی کہ وہ یا تو سو رہی ہوگی یا ناچ کی مشق کر رہی ہوگی۔

رابعہ بائی بلڈنگ میں آنے کے بعد شروع شروع میں مس ڈورتھی ناچ والی بات کو یہاں کے رہنے والوں سے چھپاتی مگر جب اس کے ڈرائنگ روم کے چھت تلے رہنے والی بوہرہ عورت نے اوپر کی بے تحاشہ کھٹ کھٹ کی شکایت کرنی شروع کی تو مس ڈورتھی نے صاف کہہ دیا کہ ناچ اس کی زندگی ہے۔ وہ ناچے گی اور ضرور ناچے گی۔ نہیں ناچے گی تو زندہ کیسے رہے گی؟....... جب جھگڑا بڑھا تو بوہرہ عورت کے پڑوسی مسٹر ڈگلس وائلن والے نے اس سے اپنا کمرہ بدل لیا....... اس لیے اب مس ڈورتھی اوپر ناچتی تو نیچے مسٹر ڈگلس اپنے وائلن پر ناچ کے مطابق دھن بجایا کرتا۔ بڈھا ڈگلس جس کے سفید کوٹ پر ہر دوسرے تیسرے مہینے کالے رنگ کی ماتی چٹ سلی ہوتی....... اور جو کام کی تلاش میں عموماً بے کار رہتا تھا....... مگر مس ڈورتھی ڈگلس سے بھی کوئی واسطہ سوائے "ہیلو" کے نہ رکھتی....... ہاں سال میں ایک بار کرسمس کے موقعے پر وہ اسے ضرور اپنے ہاں لنچ پر بلاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دوسری منزل پر رہنے والے نوجوان بابو نے ڈورتھی کے ملازم چھوکرے کے ہاتھ سے چٹھیں لے کر کئی بار پڑھیں جس میں ڈگلس کو مخاطب کر کے لکھا ہوتا کہ

"فلاں ہوٹل میں یا فلاں فلم کمپنی میں وائلن بجانے والے کی ضرورت ہے۔ فوراً پہنچو۔ شاید کام بن جائے......."

ان چٹھیوں کی وجہ سے بہاری نوجوان بابو ڈگلس کو ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھتا۔ اور راتوں کو ڈگلس کے دروازے پر کان لگائے

رکھتا کہ اب بڑھاپا چکے سے تیسری منزل پر جانے کے لیے نکلے گا........ لیکن جب دوسرے دن وہ دفتر جانے کے خیال سے جلدی سے بڑبڑا کر اٹھتا تو بڑے مزے ڈگس کا دروازہ بند دیکھ کر اس کا کلیجہ مسلنے لگتا....... دیکھا ابھی تک سو رہا ہے۔ رات جگا ہو گا نا!

اسی چکر میں ایک رات یہ بابو صاحب ڈورتھی کے کمرے پر پہنچے...... رات کے سناٹے میں ان کے ہولے سے کھٹکھٹانے پر ایک دم دروازہ کھلا اور پھر ڈورتھی نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔

"ہم تمہارے کو پولیس میں دیں گا....... بولو تم ہم کو کیا سمجھ......." ڈورتھی کے ہاتھ میں بابو کی ٹائی تھی۔ بڑی مشکل سے دلی والی اور میمن دکاندار نے اس کو چھڑوایا تھا۔

دلی والی رضیہ خانم نے اس قصے کے بعد سینہ ٹھونک کر رابعہ بائی بلڈنگ میں منعقد ہونے والی محفل میں دعوے کیا۔

"اے بی ہمارے میاں نے جو عورت بولٹن مارکیٹ میں کر رکھی ہے۔ اس نے ایک دن ایسا ہی شور کیا تھا....... اس پر ہمارے میاں کو اس کا یقین آ گیا اور نکاح کر بیٹھے سمجھو اب یہ مس ڈورتھی بھی کہیں ہاتھ مارے گی....... اے ایک چھٹی ہوئی "بمبئی والی" ہے۔

بمبئی کی زیب بائی بے وجہ ہی برا مان کر بولیں۔ "مس ڈورتھی بمبئی کا کدھر ہے۔ وہ تو "گوا" کا ہے۔"

مس ڈورتھی گوا کی تھی۔ یہ بات اس کے کپ چھپائی تھی....... وہ تو کئی بار کوریڈور میں کھڑے کھڑے زیب بائی اور رضیہ بیگم کے سامنے بتا چکی تھی کہ وہ جب چھوٹی سی تھی تو گوا سے اپنی ماں کے ساتھ بمبئی آئی اور بمبئی اسے بہت پسند تھا....... بہت زیادہ

"ادھر ہم اسکول پڑھا ادھر ہمارا مدر ایک بوہت بڑا سیٹھ کے بچوں کا گورنیس تھا......." اس بیان پر ڈورتھی دیوار سے ٹک جایا کرتی اور اس کی آنکھیں دور دیکھتیں

"گورنرتھی....... تمہاری ماں" ایک بار رضیہ بیگم نے جل کر پوچھا۔

"گورنیس........ مطلب بچوں کا دیکھ بھال کرنے والا....... اس کا گورنیس بولتا انگلش میں۔" ڈورتھی نے نرمی سے سمجھایا۔

"آیا سمجھو۔" رضیہ بیگم نے قصہ مختصر کیا تو ڈورتھی اپنے جاپانی کھڑاؤں پر کھٹ کھٹ ڈولتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی .... اس کے پیچھے زیب بائی اپنے بچے کو گود میں اٹھائے پہنچ گئی تھیں کیونکہ اس وقت مس ڈورتھی ان کے بچے کو ٹافی کا پیکٹ دینے کے بعد ہی تو اپنے بچپن اور اپنی ماں کا ذکر کرنے لگی تھی

اس دن وہ کتنی دیر تک زیب بائی کو اپنے بارے میں باتیں رہی تھی۔

"ادھر بمبئی میں ہمارا کتنا کام تھا۔ ادھر ہم بال روم ڈانسنگ سیکھا....... ڈانسنگ اسکول کا مالک ہم کو دوسرا کر لوگ کا پارٹنر بننے کا کتنا بہت روپیہ روز کا دیتا تھا پر ہم بولا تم بالی وڈ جانا مانگتا پن ہمارے کو اتنا کرایہ نہیں جڑا....... فیر ادھر بمبئی میں ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا بڑا حرامی سب کا قرض کھا گیا۔ ہم سے بھی قرض لیا۔ ہم مانگا تو بولا ہمارے سنگ پاکستان چلیں گا تو ادھر کام بنیں گا۔ ادھر ڈائرکٹر بھی مانگتا اور ہیروئن بھی....... فیر (پھر) ہم ادھر کراچی آ گیا....... ادھر کا فلم والا بھی ہمارا بیوٹی کو نہیں سمجھا تو لوریٹا ینگ کو دیکھا ہے بائی" گارڈن آف اللہ" والی؟" وہ اپنی داستان کہتے کہتے زینب سے پوچھنے لگی۔ مگر زینب بائی نے کبھی کوئی انگریزی فلم نہیں دیکھی تھی وہ مایوس ہوگئی وہ اکثر مایوس ہو جایا کرتی تھی۔

"ادھر کا چھوکرا لوگ بھی لوریٹا ینگ کو نہیں دیکھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ اور پھر اپنے سنہرے بالوں میں سے پنیں کھول دیں۔ ایک دم اس کے سانولے چہرے کے گرد سنہرے ریشمی بال دھوپ میں گرتے ہوئے آبشار کی طرح پھیل گئے۔

مگر مسز ڈگلس نے لوریٹا ینگ کی فلمیں دیکھیں تھیں اور بمبئی میں ڈورتھی پریرا کو بھی دیکھا تھا....... "نمبر ون پاپلر ڈانسر تھی....... اس کی ماں سیٹھ کے بچوں کو رکھتی اور یہ اسکول میں پڑھتی۔ پھر ایک دن اس کی ماں سیٹھ کے مکان میں بہت چیخی کہ سیٹھ نے میری بچی کو اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے....... میں نے اس کی ماں کو بہت سمجھایا۔ چپ رہو۔ پھر وہ چپ ہوگئی....... اور ڈورہوا سے باتیں کرنے لگی....... میں ان دنوں سیٹھ کے ایک بیٹے کو وائلن سکھاتا تھا....... چھوٹی سی گڑیا سی لڑکی تھی....... اب انگل سے بولتی بھی نہیں....... پر بے چلتی ہے....... مسٹر ڈگلس اپنے مرجانے والے عزیزوں کی تصویروں کے درمیان بیٹھا ڈورتھی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پرزوں کو دیکھ کر تنہائی میں بڑبڑایا کرتا....... اس کی ایک بیٹی لکھنو میں تھی اور اس نے کسی سکھ سے شادی کر رکھی تھی۔

"میں اگر لکھنو میں ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا؟" مسٹر ڈگلس "فینسی شو میکرز" کے مالک حنیف سے بات کرتے ہوئے کہا کرتا......."

انسان کو اپنے مذہب میں ہی شادی کرنا چاہیے۔"

"بے شک....... بے شک......." حنیف نہایت یقین سے کہتا۔

"لیکن غیر مذہب والی سے عشق میں کیا ہرج ہے......." حنیف جی ہی جی میں اپنے آپ کو قائل کرتا....... کیونکہ وہ اس دن سے ڈورتھی پریرا پر باقاعدہ مرنے لگا تھا جب سے ڈورتھی کو دیکھ کر ایسے بوکھلائے تھے کہ صف بستہ کھڑے ہو گئے ایک تو ڈورتھی اس پر سے موٹر سے اتری ہوئی۔ اور پھر وہ بول بھی رہی تھی۔

''دیکھو ہم ایسا فٹ گولڈن سینڈل مانگتا۔ ادھر بازار میں نہیں ملیں گا'' ڈورتھی نے اپنے بٹوے سے مارلین منرو کی نیم برہنہ تصویر نکالی اور ایک کاریگر کی طرف بڑھادی سینڈل منرو کے پاؤں میں تھی۔

''میں پروپرائیٹر ہوں۔'' حنیف نے بمشکل آواز نکالی تھی۔ اس کے بعد چند لمحے میں قیمت طے ہوئی اور ڈورتھی اپنی مخصوص مترنم کھٹ کھٹ کرتی رابعہ بائی بلڈنگ کا زینہ چڑھ گئی تھی...... لیکن حنیف کی روح ڈورتھی کے ساتھ ساتھ کھنچی چلی گئی ...... حنیف نے کبھی تیسری منزل پر قدم نہیں رکھا تھا۔ حالانکہ دلی والے صاحب کئی بار کہہ چکے تھے کہ میاں دلی لکھنو کی لڑائی بند اب تو کراچی ہی سب کچھ ہے کسی دن ہمارے ہاں آؤ تمہاری خالہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہیں کہ بڑا شریف بچہ ہے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ لیکن حنیف کو اپنے کام سے فرصت ہی کب ملتی۔ دوسرے رضیہ بیگم (تمہاری خالہ) اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ اتنی بار برقعہ الٹ الٹ کر اس سے اپنی بیٹی کے سینڈل بنانے کو کہہ چکی تھی کہ حنیف کو ان سے ڈر لگنے لگا تھا...... آخر وہ انہیں اتنی بار بتا چکا تھا کہ وہ پرائیویٹ آرڈر نہیں لیتا۔ اس کے بنے ہوئے جوتے لینا ہیں تو دکان سے جاکر ہمیں کوئی موچی مقرر کیا ہے؟''

مگر اس دن کا جی بے ساختہ چاہا تھا کہ رضیہ بیگم کے گھر ہی چلا جائے' آخر تو وہ گھر بھی تیسری منزل پر ہی ہے...... تیسری منزل جہاں ڈورتھی پری رہتی تھی۔ جس کے گھر کی سجاوٹ اور صفائی کے بڑے چرچے تھے...... جو موٹروں میں بیٹھ کر آتی جاتی تھی...... موٹریں جو اس کی نہیں تھیں' بلکہ زینب بائی کی زبانی یہ روایت عام تھی کہ یہ موٹریں فلم کمپنیوں کی ہیں۔ جہاں ڈورتھی ہیروئنوں کی ناچ سکھانے جاتی ہے۔ اور خود بھی فلموں میں ناچتی ہے...... یہ کون سی فلمیں تھیں ان کا نام کوئی نہیں جانتا تھا ......ایک بار حنیف نے کراچی کی ایک فلم کے گروپ ڈانس میں ڈورتھی کی سی جھلک دیکھی تھی اور وہ اپنے ساتھ کے لڑکے کو بتانے ہی لگا تھا کہ وہ غائب ہوگئی

''سنا ہے یار ہزاروں لیتی ہے......'' اس کے ساتھ کے لڑکے نے مرعوب ہو کر کہا تھا...... ''ویسے اپنا یار کلو خان کہہ رہا تھا کہ ہوٹلوں میں لونڈوں کے ساتھ ناچتی ہے۔ اس کے بھی بڑے پیسے ملتے ہوں گے؟ کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ ناچنا تو بہانہ ہے کماتی ہے......'' حنیف کا ساتھی لڑکا اطلاعات پر اطلاعات بہم پہنچاتا رہا۔ اسے خبر نہ تھی کہ حنیف تو جانے کب سے ڈورتھی کا مداح تھا۔ اگر تیسری منزل پر دوسری منزل کے بابو صاحب کی بے عزتی کا قصہ نہ ہوتا تو حنیف کب کا اظہار عشق کر چکا ہوتا۔

''یار پتہ نہیں چلتا لوگوں کا...... کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ......'' حنیف جب جوتے بنانے والے کاریگروں سے ڈورتھی کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں سنتا تو اکثر کہا کرتا تھا...... لیکن جب حنیف نے اپنے اصولوں کے خلاف مس ڈورتھی کے

دیئے ہوئے نمونے کی سینڈل خود بیٹھ کر بنانا شروع کر دی تو استاد کاریگر بندو معنی خیز ہنسی ہنس کر بولے تھے۔

"کیوں میاں کانٹے میں سینڈل کا چارہ لگا رہے اور......."

اور سچ یہ سینڈل چارہ بن گئی

یہ بھی اتفاق تھا کہ حنیف اس رات سنہری سینڈل کی کتر بیونت میں پھنسا رہا اور حیدر کلو لکھنوی کے تنور پر دیر سے پہنچا کھانا ختم ہو چکا تھا صرف چنے کی دال گوشت کی ایک رکابی بچی پڑی تھی....... وہ کھا کر اپنی شو فیکٹری میں بستر بچھا کر لیٹا تو مس ڈورتھی کی دی ہوئی مارلین منرو کی تصویر سینڈل کا نمونہ ذہن میں اتارنے کو پکڑ لی۔ بس پھر اس نے اتنی رات گئے تک ڈورتھی کی پسندیدہ سینڈل دیکھی کہ وہ پوری ٹانگ ہی اسے ڈورتھی کی ٹانگ لگنے لگی....... اس گڑ بڑ میں ہاضمہ بگڑ گیا....... صبح صبح اپنے گراؤنڈ فلور کے مشترکہ غسلخانے کی طرف بھاگا....... غسلخانے اندر سے بند پا کر دوسری منزل پر مشترکہ چیزوں کو گالیاں دیتا گیا....... مسٹر ڈگلس اسے دیکھ کر باتیں کرنے کے موڈ میں آنے لگے تو وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا غسل خانے کی طرف چلا گیا مگر ایک فلش خراب تھا اور گندگی کے سمندر میں تیر رہا تھا اور دوسرا بند....... تیسری منزل پر ایسی کیفیت میں جانے کا تصور اس کے ذہن میں کیسے آ سکتا تھا مگر وہ سوچے تیسری منزل پر تھا....... جونہی اس نے دروازے کے ہینڈل کو ہاتھ مارا....... اندر سے چٹخنی کھلی اور وہ باہر نکلی ہوئی مس ڈورتھی پر یا اسے ٹکرا گیا....... مس ڈورتھی کے منہ سے آدھی سلگی ہوئی سگریٹ اس کے جاپانی کمونو پر سے ہوتی زمین پر گری اور المونیم کا مگ دروازے سے ٹکرا کر بجا

"ہلو!" ڈورتھی کے منہ سے گھبرا کر نکلا لیکن وہ غسلخانے میں بند ہو گیا غلطخانے کی عجیب سی بو اور سگریٹ کا دھواں....... "یہ مشترکہ چیزیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ حنیف کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح خیال آیا۔

اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ عجیب سی کیفیت میں ہنس پڑا....... کچھ حیرت کچھ مایوسی اور کچھ ہمدردی کی سی کیفیت مس ڈورتھی کو اسے یہاں ملنا چاہیے تھا یا نہیں....... یہ الگ بات ہے۔ مگر حنیف ڈورتھی سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ سسرے فلم اور ناول والے ناحق ہیرو ہیروئن کو ملانے کے لیے سندر باغ اور موٹریں ڈھونڈتے ہیں۔ تب ڈورتھی اسے انگریزی میں گالیاں دینے لگتی ہے۔

ہاں تو حنیف نے وعدے کے مطابق اس شام سینڈل تیار کروالی۔ صبح کے واقعہ کے بعد جانے کیوں وہ خود اس سینڈل کو ہاتھ نہ لگا سکا....... اللہ جانے یہ محبوب لوگ انسان کے ذہن میں کیا بن کر گھستے ہیں کہ بعد میں صدمہ ہی اٹھانا پڑتا ہے!

اگر اس شام حنیف سینڈل کا ڈبا اٹھائے تیسری منزل پر نہ جاتا تو قصہ یہیں ختم ہو جاتا۔

حنیف پہنچا تو ڈورتھی کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا

نیلی روشنی میں ہر چیز نرم نرم اور خوابناک نظر آ رہی تھی۔ گلابی کرے لگے پردے نیلی دری، سرخ سوتی قالین، گدے دار کرسیاں اور کاغذی پھول....... اور گدے دار کرسی میں دھنسا ہوا گدلے جیسا ایک آدمی....... حنیف کو ایک دم یاد آیا کہ نیچے ایک موٹر کھڑی ہے۔ اور اسے اپنے پاؤں میں پڑا ہوا جوتا بیچ دبا تا محسوس ہونے لگا۔

دوسرے لمحے ڈورتھی گولڈن سینڈل پہنے یہ دیکھ رہی تھی کہ کاٹتی تو نہیں۔ اس وقت اس کے جسم پر سیاہ کامدانی کی ساری تھی۔ حنیف کو اس کے بنوں سے کٹے ہوئے سنہری بال سیدھی مانگ اور سانولے چہرے کے ساتھ عجیب سے لگے۔

"بیوٹی فل چوائس۔" موٹا اسے خوابناک نظروں سے دیکھ کر بولا

"کیا قیمت ہے؟" پھر وہ حنیف سے مخاطب ہوا تھا۔

"کس کی؟" حنیف نے طنزاً پوچھا۔

"چالیس روپے ڈیر......." ڈورتھی نے اپنا بٹوا کھولتے ہوئے جواب دیا۔ اور موٹے نے دس دس کے پانچ نوٹ حنیف کی طرف بڑھا دیئے۔

"سب رکھ لو انعام ہے" موٹے نے کہا اور حنیف کے پیروں تلے جیسے اسپرنگ آ گئے....... وہ اچھلا اور اس نے موٹے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا....... ڈورتھی نئی سینڈل کی ایڑیوں پر توازن کھونے لگی۔

"کیا سمجھا ہے ہم تیرے نوکر ہیں بھڑوے.......؟ حنیف چیخا....... اور ساری خوابناک فضا بدل گئی....... موٹا گردن نکال کر ہاتھ اٹھانے لگا۔

"آئی ایم ویری سوری....... مسٹر....... پلیز......." ڈورتھی دونوں کے بیچ میں آ گئی اور اس نے ایک دم حنیف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا....... دوسرے لمحے حنیف تیسری منزل سے اتر رہا تھا....... ہتک کے احساس سے تلملایا ہوا۔ اس نے فٹ پاتھ پر بکھری چمڑے کی رنگین کترنوں پر سے گزرتے ہوئے اس موٹر کو دیکھا جس میں بیٹھ کر ڈورتھی اس موٹے کے ساتھ جانے والی تھی....... اس نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کالی موٹر پر ماری اور پھر آگے بڑھ کر مٹی پر لگی ہوئی گرد کی تہہ کو پھونک مار کر اڑا دیا۔

"سالے نے ہمیں موچی سمجھا ایسا ٹھونکتا کہ بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ وہ اگر بیچ میں نہ آ جاتی تو؟" حنیف ایرانی کے ہوٹل کی

طرف جاتے ہوئے دانت کٹکٹا رہا تھا۔

"اماں حنیف تمہیں بے وقوف ہو خواہ مخواہ نواب میرزا حسن صاحب کی مثال سامنے رکھ کر یہ جوتے سازی شروع کر دی ۔ بہت کہا کرتے تھے کہ موتی موتی رہے گا نواب موتی جوتیوں میں ٹانک لو۔ یہاں کراچی میں تمہیں کوئی کیا جانے کہ بڑا خاندانی تھے میاں پڑھ لیتے تو باوا کی طرح دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہوتے ... نویں پاس کر کے دسویں کرنے میں کون سے پہاڑ ڈھونا پڑتے؟"

لیکن جب حنیف رات کو کئی گھنٹے ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی فیکٹری کو خواب گاہ بنائے رہتا تو وہ اپنے آپ کو سمجھا چکا تھا ... ... (ہو بہ بڑے بڑے لوگ آج کل قسم قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ وہ اپنے سید صاحب کھالوں کا کاروبار نہیں کرتے؟" پھر اس نے باہر نکل کر اپنے کمرے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا "فینسی شومیکرز" اور اس سے اسے بہت تسلی ہوئی۔ شکر ہے کہ ملک میں یک ایسی زبان موجود ہے ... جس میں برے سے برا مفہوم بھی کچھ بھلا لگنے لگتا ہے۔ ... اگر اس جگہ فصیح اردو میں لکھا ہوتا "عمدہ جوتے بنانے والے موچی" تو جی پر کیا گزرتی۔

تب اس نے لات مار کر اپنا لپٹا ہوا بستر کھسکایا اور اس پر ایسے تکلف سے بیٹھ گیا جیسے کسی ڈرائنگ روم کے صوفے پر لگا ہو۔

"پروپرائیٹر فینسی شومیکرز" اس نے زیر لب دہرایا ور دیوار کی طرح یوں دیکھنے کی ڈرائنگ روم کے صوفے پر لگا ہو۔

"پروپرائیٹر فینسی شومیکرز" اس نے زیر لب دہرایا اور دیوار کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے ڈورتھی اس کے سامنے ہو۔ "آپ کی تعریف؟

"مس ڈورتھی مگ والی۔ ۔ ۔ " اس کے دل میں ایک دم ابھرا اور وہ مشفقانہ انداز سے ہنس کر اپنے جوتے اتارنے لگا ... ... ور پھر کپڑے ..... وہ اس وقت اتنا پراعتماد تھا کہ ڈورتھی سچ مچ اس کے سامنے ہوتی تو وہ ذرا نہ کانپتا

لیکن ڈورتھی اس وقت آئی جب حنیف سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی بیوی وہاں آ گئی ہیں..... .. کراچی میں اسے پگڑی دیئے اپنے کارخانے کے قریب ایک کمرہ مل گیا ہے.... .. بیوی اور ماں جو لکھنؤ سے آ کر ابھی تک اس کے ماموں کے ہاں راولپنڈی میں پڑی کراچی پہنچنے کے لیے دن گن رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی پاس بیٹھی ہے وہ چومنا چاہتا ہے تو شرما کر سر ادھر ادھر کر لیتی ہے ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

تب اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بدستور روشنی تھی اور ڈورتھی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہد رہی تھی۔

"ہم ادھر اکیلا تم (پورے وقت) پریشان ہوا ۔۔۔ آئی ایم ویری سوری۔ ۔۔۔ وہ تمہارا انسلٹ کیا۔ ہم کو بہت کسہ ہوا۔ تم اپنا چالیس روپیہ ہمارا فلیٹ میں چھوڑ آیا تھا۔ یہ لو مسٹر ۔۔۔ ڈورتھی الگ کھڑی جانے اور کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ اس کے سنہرے بال پنوں کی قید سے کہیں کہیں آزاد ہو کر لمبے ہونے کی چغلی کھا رہے تھے ہونٹ خشک اور آنکھوں میں نیند کے ساتھ ہمدردی کی آنچ آتی ہوئی۔ حنیف کو لگا کہ ابھی تک وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

"تم اب ناراض نہیں ہوئیں گا۔ ہمارے کو لنگ کا دل ہرٹ (دکھانا) نہیں مانگتا۔ ہم ادھر کسی کا روم میں کبھی نہیں گیا پن ہم سوچا ادھر ضرور آئے گا۔ کسی کو مت بولنا ..... ہم کسی کا انسلٹ نہیں مانگتا اس کا واسطے ہم ادھر کو سوری بولنے آیا اپنا پیسہ لو..... "

ور جانے کیسے حنیف کا چکراتا ہوا سر گھٹنے پر آ گیا ..... ایک بار پھر اسے اپنی بے عزتی کا واقعہ ڈی جی مسوستانا ..... یا پھر جانے کیا بات تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا رو پڑا۔ ڈورتھی تڑپ کر اس کے قریب آ گئی ..... اس نے جھک کر اس کے گال پر بوسہ دیا

"نہیں روئیں گا..... نہیں ..... " ڈورتھی بول رہی تھی۔

مگر حنیف کے اندر دھم سے لاوا پھٹ پڑا۔ ڈورتھی اس کے کمرے میں تھی۔ اس لیے پولیس کو بلانے کی دھمکی نہ دے سکی۔

"آئی لو یو۔ مس ڈورتھی۔ آئی لو یو" جدوجہد کرتی ہوئی ڈورتھی کو لپٹانے کی کوشش میں حنیف کے منہ سے انگریزی کا یہ فقرہ بار بار ٹپک پڑتا۔

"خر ڈورتھی نے ہار کر جیسے خوف حفاظتی کے لیے چاقو کا پھل چمکایا۔

"تب تم چالیس سینٹس کا چھوڑیں گا ورنہ اور دیں گا... "

ریجو بائی بلڈنگ کے مکینوں کو اس رات کے سودے کی خبر نہ ہوئی تو کیا ہوا بعد میں جو سودے ہوئے ان کا تو رضیہ بیگم کو ہی علم تھا۔ ڈورتھی کے پیروں میں جو روز نئے نئے سینڈل ہوتے وہ کہیں چھت سے تو نہ گرتے ظاہر ہے کہیں سے آتے ..... اور وہ جو روز صبح ڈورتھی کا چھوکرا سلیقے سے لگی ہوئی چائے کی ٹرے میں لے کر نیچے جاتا اور نیچے سے تورے چپاتی کی ٹرے لاتا وہ کس کا رہا ہو تو نہ تھا۔

رضیہ بیگم سینہ ٹھونک کر کہتیں۔ "ایسی عورتیں مردے چائے بنوا کر پیتی ہیں اے بی صاحب وہ مرد کو چائے بنا کر بھیجنے لگیں تو سمجھو کہ کم بخت جان کو چمٹیں"

رضیہ بیگم کی یہ تھیوری کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا ـــــ بے شک حنیف کئی بار تیسری منزل پر ڈورتھی کے ہاں آیا تھا ـــــ مگر بیٹھا کھلے دروازے کے سامنے .. رضیہ بیگم منہ پر دوپٹے کی آڑ کئے کئی بار ایسے موقع پر غسل خانے جانے کے بہانے ادھر جھانکیں ـــــ لیکن کسی قابل اعتراض نظارے سے محروم رہیں۔ ـــ پھر بھی انہیں یہ غم تھا کہ حنیف جیسا بھلا آدمی خراب ہو کر رہے گا۔ اور دیکھنے والے دیکھتے کہ حنیف کے خراب ہونے میں کسی بھی کیا رہ گئی تھی۔ یا تو تمام دن چلتے پھرتے انہیں جنوں کی چوٹیاں سی گوندھتا رہتا۔ اب استاد بندو کاریگر رابعہ بائی بلڈنگ کے ہر مکین سے حنیف کے کاروباری مستقبل کی تباہی کی پیشین گوئی کرتے رہتے... واقعی وہ تو یکسر بدل گیا تھا۔ جانے ڈورتھی اسے چائے میں کیا الوکی دم گھول کر بھیجتی تھی.. .... جب دیکھو تیسری منزل پر دھما دھم چڑھتا سوٹ ڈالے ہاتھ میں ٹائی پکڑے چلا آ رہا ہے۔ ڈورتھی اسے روز ٹائی باندھنا سکھاتی لیکن وہ روز بھول جاتا اور پھر ڈورتھی سے بندھواتا...... وہ دونوں کبھی کبھی رکشہ میں بیٹھ کر باہر بھی جانے لگے..... مگر ڈورتھی رات کو تو اکثر اکیلی ہی فلم کمپنی کو جاتی۔ ـــــ اگلی صبح حنیف ڈورتھی کی بھیجی ہوئی چائے واپس کر دیتا۔

"فلم کمپنی کو تو جانا ہی ما نگتا.. حنیف بہت گلتی کرتا (غلطی)۔ تم یوں ہی ہم تا پچے گا ہم تو مر جائیں گا .... تم جانتا ہائی ہم کو ناچ کا بہت شوق ہیگا. .. " ڈورتھی چائے واپس آنے پر اداس ہو کر زینب بائی سے شکایت کرتی..... اور پھر کواڑے بند کر کے اپنی صبح صبح کی مشق شروع کر دیتی. ــــ اس کا دیوانوں کی طرح مست ہو کر ناچنا زینب بائی تک کو بھلا لگتا. اس پر سے دوسری منزل کے مسز ڈگلس کا وائلن جیسے پکارنے لگتا۔ ڈورتھی ناچ رہی ہے! ڈورتھی ناچ رہی ہے! اس اطلاع پر حنیف کے گلے شکوے مٹ جاتے اور زینب بائی دیکھتیں کہ حنیف دروازے میں کھڑا ڈورتھی کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے اس پر مسمریزم کیا گیا ہو۔

ڈورتھی جب حنیف کے ساتھ گھر سے نکلتی تو اس کی ساری کے ساتھ ہم رنگ سینڈل ہوتی۔ وہ ترنم سے کھٹ کھٹ کرتی زینہ اتر جاتی۔ . . تو تیسری منزل کی عورتیں اپنے کمروں میں جھانکنے لگتیں. .... ایک دن رضیہ بیگم کی بچی نے زینب بائی کی موجودگی میں بڑے چاؤ سے کہا۔ "اے اماں جان ڈورتھی جیسی سرخ سینڈل ہمیں بھی خوا دو ہم کہیں جا کر حنیف بھائی سے ......؟"

اس پر رضیہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا ، .... "لو بھئی اب ہماری لڑکیاں اس کی ریس کریں گی اور یہ حنیف خدا کی مار ہو اس پر شریفوں سے تو یوں بھاگتا ہے جیسے کاٹ لیں گے میری بچی کی سینڈل نہ بنا کر دی کبھی... اور اس حرفہ کے پیچھے دور جنگل میں ڈبے دہائے حاضر "

یہ پہلا موقع تھا کہ رضیہ بیگم چپکی چاپ بیٹھی نہیں۔ بلکہ انہوں نے برقعہ اوڑھ کر پوری رابعہ بائی بلڈنگ کے بال بچے دار لوگوں کو

نظر سے ستا گا وکیا۔

"ڈائن بھی اپنا پڑوس چھوڑ کر کھاتی ہے" ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہی تھی۔ دوسرے دن وہ وفد بن گیا جس نے رابعہ بائی بلڈنگ کی مالک حلیمہ بائی سے شکایت کی اور حلیمہ بائی کے کارندے کو تحقیق کے لیے تیسری منزل پر آنا پڑا۔

ڈورتھی کا نیلے پینٹ اور چمکتے ہوئے ہینڈل والا دروازہ بند تھا۔ . زینب بائی کو خوشی ہوئی کہ اس وقت ڈورتھی اکیلی ہے۔ وہ سانس روکے اپنے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ... اور رضیہ بیگم اپنے میاں کے پیچھے دوپٹہ منہ پر ڈالے لیکن سینہ کھولے کھڑی سوچ رہی تھیں۔ "دیکھیں سب باتوں پر "نہ" کردے مگر حنیف کے قصے کو کیسے ٹکرتی ہے؟

دوسری منزل پر دواکس بج رہا تھا اور تیسری منزل کے بند کمرے میں ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں سے ڈورتھی ہسپانوی خانہ بدوش ناچ کی دلدادہ ہو گئی تھی۔

حلیمہ بائی کا کارندہ اپنے بید سے کوریڈور میں تال دیتا رہا۔ اس کے پیچھے بلڈنگ کے بیشتر مکین مرصف بستہ تھے ... . دواکس بند ہو گیا۔ کھٹ کھٹ ہوتی رہی پھر کارندے نے اپنے بید کی مٹھ سے دروازہ ٹھوس دیا۔

زینب بائی کا دل دھڑکتے دھڑکتے رک گیا۔ ڈورتھی بند دروازے کے پیچھے آج اکیلی نہیں تھی۔

وہ حنیف کی گردن میں بانہیں ڈالے ابھی تک ایڑیاں بجا رہی تھی جیسے ذبح کی ہوئی مرغی پھڑک رہی ہو۔

"دیکھو دیکھو یہ رنڈی خانہ بنا رکھا ہے . " دلی والے صاحب سب سے پہلے بولے۔

باہر نکالو اس رنڈی کو . . . "دوسری منزل کے بابو صاحب آگے بڑھ کر چیخے ڈورتھی اچھل کر الگ ہو گئی۔ پھر وہ چھوٹی سی نکری اور بیٹ کھلے بلاؤز میں سینہ تان کر باہر آ گئی۔

"تم ہمارا ڈور کیوں کھولا امین بھائی... . "بلڈنگ کے لوگوں نے پہلی بار ڈورتھی کی اونچی آواز سنی وہ کارندے سے مخاطب تھی .... "تم خود بند کریں گا ہمارا دروازہ بند کرو ہم بولا بند کرو . ... "ڈورتھی چیخی۔

"ہاں تاکہ تم یہاں مزے کرو . .... "دلی والے صاحب دانت پیس کر آگے بڑھے۔

"تم بھی اپنے گھر میں مزا کرنا، نکما سوبی صاحب . "ڈورتھی چیخی۔ "یہ ہمارا گھر ہے ہم اس کا کرایہ دیتا ہے۔"

"بڑی آئی ہمارے منہ لگنے والی کیسی رنڈی حرافہ شریفوں کے محلے میں " رضیہ بیگم اپنے میاں کی بے عزتی برداشت نہ کر سکیں اور بیچ میں کود پڑیں

اس کے بعد وہ ہوا جو نہیں ہونا تھا   ڈورتھی نے شریفوں کے محلے کو دہلا کر رکھ دیا اسے انگریزی اور بمبیا اردو میں جتنی گالیاں آتی تھیں وہ سب بک ڈالیں.. .. اس نے الزام لگایا کہ رضیہ بیگم خود حنیف کو پھانسنے کی فکر میں تھی   . نتیجہ عورتوں کی مار پیٹ کی صورت میں نکلا

"ہاں ہم حنیف پر مرتا۔ وہ ہم پر مرتا ہم اپنا جان بھی اس کو دیں گا   .. . ڈورتھی رضیہ خانم کے پتھر جیسے جسم میں جنبش ہوئی .... . وہ کوریڈور میں آگئی اور جھپٹ کر ڈورتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خبردار جو کسی نے اب میری عورت کی طرف آنکھ اٹھائی ..... "حنیف آنکھیں نکال کر گھمبیر آواز میں بولا۔

"مگر یہ تمہاری عورت نہیں" بابو صاحب پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ گئے۔ اسی وقت نیچے سے حنیف کے سارے کاریگر بھرا مار کر اوپر پہنچ گئے.... .... اب حنیف اور اکڑ گیا۔

"یہ میری عورت نہیں؟ اچھا!" حنیف کا منہ لال ہو گیا۔ پھر اس نے بندو خان کاریگر کو دیکھا ... . "اے بھائی بندو خان پیچھے کسی کو دوڑا تو ذرا لڈو لے آئے.... آپ بچے سو تا دلی لکھنو کا جھگڑا تو وہیں رہ گیا ... اب ہم کراچی میں ہیں...... وہ بول پڑھا دیجئے۔ اللہ آپ کی مشکلیں آسان کرے گا"

یہ کہہ کر اس نے ڈورتھی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہلکا سا دھکا دے کر اسے کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

حمیدہ بھابی کے پاس کارندہ گیا تو نکاح کے لڈو لے کر ..   حلیمہ بائی کو سارے قصے سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ ڈورتھی آئندہ بھی ان کی کرایہ دار رہے گی۔

مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں کی ساری دلچسپی جوں کی توں تھی۔

استاد بندو کاریگر حنیف کے کاروبار مستقبل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکر مند رہتے.. ....وہ کہا کرتے۔" دیکھ لینا میاں ایک دن جو خود بیٹھ کر حساب لگاؤ گے تو بڑھیا بیٹھی نظر آوے گی۔ میاں جوتا سازی تو جبھی ہووے ہے کہ مالک سر پر بیٹھا رہوے... . اب میں کام کر رہا ہوں تو کاریگروں کے ہاتھوں پر نظر بھی رکھ رہا ہوں.. ...." مگر حنیف پاجامہ پہنے چپلیں گھسیٹا تیسری منزل پر چلا جاتا اور ڈورتھی کو تورمہ کباب پکانے کی صحیح ترکیب بتانے لگتا۔ ڈورتھی یوں تو بڑی ذہین تھی لیکن مرچ مصالحے کا صحیح توازن قائم رکھنا بھی کوئی بچوں کا کھیل نہیں.   روز کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ ہاں جب وہ گھٹنوں پر ایپرن باندھے انگیٹھی کے سامنے کھڑی جھپا جھپ چپاتیاں اتارتی تو حنیف کو پہلی بیوی کے ہاتھ کی چپاتیاں یاد آجاتیں۔ بیوی جو کراچی آنے کے لیے بے تاب تھی

اور ہر دوسرے تیسرے دن اس کی ماں کی طرف سے خط لکھوا دیا کرتی تھی۔ اور یہ خط حنیف کی جیب سے ڈورتھی کی اسپرنگ والے پلنگ پر گر جاتے تو وہ انہیں اٹھا کر رضیہ بیگم کے پاس لے جاتی۔ ہر خط میں ایک ہی بات پڑھوا کر سننے کے بعد وہ اکتا سی جاتی لیکن ایک ہی سی ہمدردی کرنے سے رضیہ بیگم نہ اکتاتی تھیں۔"

"ہائے بے چاری کو کتنی دور ڈال رکھا ہے حنیف نے پھر تمہارا دل کیا کہتا ہوگا؟ ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ حنیف بال بچے دار ہے تو"

"تو واٹ فیر کیا۔ سب چلتا..... .." ڈورتھی شانے اچکا کر کہتی اور کمونو کے اندر ملدی جلدی میں چھڑکا ہوا ٹیلکم پوڈر ہاتھ ڈال کر سینے پر ملنے لگتی۔

"وہ بوت ہمارے کو اکھا جان سے پیار کرتا۔ جب سے وہ ہمارے کو دیکھا ... کیا ہو لے سکتا؟ ...... پن دیکھو ادھر کراچی میں پگڑی بنا روم نہیں ملتا ..... ادھر بمبئی میں بھی پگڑی چلتا تھا .... ہم ادھر تین روم کا فلیٹ واسطے تین ہزار پگڑی دیا تھا .... "ڈورتھی کی نظریں کہتیں جیسے وہ ابھی بمبئی سے ہو کر آئی ہے.... پھر وہ یک دم ہنی جاپانی کھڑاؤں پہن کر ڈولتی اپنے فلیٹ میں غائب ہو جاتی۔ ... اور جب رضیہ بیگم اس امید پر غسل خانے کا چکر لگاتیں کہ دیکھیں سوکن کے سلسلے میں وہ حنیف کی خبر کس طرح لے رہی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی مایوس ہوتیں کہ ڈورتھی برش لیے دری پر سے حنیف کے جوتوں کا نشان جھاڑ رہی ہے۔

جانے اب حنیف باوجود اس کی ہدایت کے جوتے سمیت مونج کی چٹائی پر گزرتا کیوں بھول جاتا ہے! ڈورتھی بڑے پیار سے زینب بائی سے شکایت کر چکی تھی

حنیف کا کیا؟ اب دیکھیے کہ حنیف تو ڈورتھی کے قبضے میں آ کر محل ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ کاریگروں کا استاد بندو کے سپرد کر آرام سے کام نمٹانے کے لیے چمڑے کی لمبی لمبی رنگیں اور رو پہلی سنہری چٹوں کا گچھا لیے اوپر آتا ... مشین تو بہت پہلے سے اوپر ہی رکھی ہوئی تھی۔ وہ چمڑا مشین پر ڈال کر دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور آواز لگاتا۔

"ڈارلنگ جلدی کھانا دو آج بہت کام کرتا ہے..... " ڈورتھی دوسرے کمرے میں جلدی سے اپرن کھول کر دوبارہ ٹیلکم پوڈر کمونو کے اندر چھڑکتی۔ چہرے پر پف مارتی اور آ کر مصنوعی غصے سے چلاتی۔

"تم ہندوستانی زمین پر بیٹھیں گا تو ہم کھانا نہیں دینے مانگتا .. " وہ منہ بناتے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی۔ اندر جو دوسرے کمرے میں اس نے ننھی سی میز سجا رکھی تھی اسے بیکار کیسے چھوڑ دیتی۔

"اوہ بھول گیا تھا میم صاحب بھول گیا تھا۔" حنیف اسے چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا اور کھانے پر ٹوٹ پڑتا ..... اس

کے بعد "بہت سا کام" بھول کر ڈورتھی کے پلنگ پر ایسے سوتا کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ ڈورتھی کب اٹھ گئی۔ کب اس نے حنیف کے جھوٹے برتن دھوئے اور کب اس کے میلے والے سوٹ پر استری کی کب جوتے پر پالش کی۔

"ام بولتا کیسا کلی (بے وقوف) ہے حنیف" وہ میلا جوتا اٹھاتے ہوئے ہمیشہ بڑبڑاتی۔ "لوگ بولے گا آ جوتا فیکٹری کا پروپرائیٹر اور وتنا ڈرٹی (گندہ) شو پہنتا شام کو کدھر پکچر یا ہوٹل جانے کے ٹائم اسی ماقی مائین میں گا"

ڈورتھی کو شام اس کے ساتھ باہر جانے کا خطرہ ہر روز ستاتا....... مگر حنیف یہ بھی بھول جاتا۔

"ہمارے کو دیکھ کر سب کچھ بھولیں گا۔ کلی' اپنا بزنس تو کرتا ہی ماتھی....."

ڈورتھی مشین کے پاس چمڑے دیکھ کر اور بھی خفا ہونے لگتی پھر مشین پر جھک کر چمڑے کی چپلوں پر بخیے کرنے لگتی۔

مشین کی آوازیں کر کئی بار زینب باجی اس کے پاس آ گئی تھیں..... ایسے موقع پر ڈورتھی ان کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھول دیتی۔

"یہ حنیف ہمارے کو پا کر سب کچھ چھوڑ دیں۔ کھا دن ادھر رہیں گا.. پھر بولتا بڑا لاس (نقصان) ہوتا ... وہ اپنا حساب کتاب بھی نہیں کرنے کو مانگتا۔ ہم اس کا سپاہی کا مل دکان پر جا کر نہ مانگے تو کاریگر لوگ کو شام میں پیسہ بھی نہیں ملیں گا۔ تم بولو باجی اب کیسے چلیں گا؟" ڈورتھی مشین پر جھکی مسلسل بولتے جاتی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ زینب باجی کا بچہ کہاں ٹھنکتے جا رہا ہے۔ دراصل حنیف کے ساتھ رہ کر وہ خود بھی بھلکڑ ہو گئی تھی... خود ہی سویرے جب بید کی ٹوکری لٹکائے سبزی گوشت کے لیے کاریڈور میں سے کھٹ کھٹ کرتی گزرتی تو بچے سے کہہ جاتی... "بے بی تمہارا واسطے نانی لائیں گا.." پھر جب واپس آتی تو یہ وعدہ قطعی بھول جاتی

"تم کسی کو نہیں بولیں گا۔ ہم جانتا حنیف کا بزنس خراب ہو گیا..... " ہو گئی ہی بار زینب باجی کو بتا چکی تھی۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ فینسی شو فیکٹری میں کاریگروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ور حنیف بے فکر بنی پڑوسی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر وہ کمرہ چھوڑ دے تو وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ پگڑی دینے کو تیار ہے.... "آخر نئے کاریگروں کو بیٹھنے کی جگہ چاہیے تھی ہزار روپیہ پگڑی دینے کو تیار ہے... آخر نئے کاریگروں کو بیٹھنے کی جگہ چاہیے تھی اس وجہ سے رضیہ بیگم اور ان کے میاں کا کہنا تھا کہ حنیف ڈورتھی کی کمائی بھی کھاتا ہے "یہ لکاج تو پردو والے لئے کو تھا" رضیہ بیگم چپکے سے کہا کرتیں۔

"باجی ہم کس طرح بولیں گا۔ ڈورتھی تو ظلم گھنٹی جاتا بھی چھوڑ دیا شام کو." زینب ہوئی پریشانی سے سر ہلاتیں۔

"اے چلو رہنے دو۔ دن کو جو بن ٹھن کر جایا کرتی ہے؟" رضیہ بیگم کے پاس منطق موجود تھی۔

"او بی بی ہم کو پتہ ہے۔ حنیف کا بزنس بل لینے جاتا۔ اور سبزی گوشت بھی تو بازار سے رہتا۔ چھوکرا بھی تو نکالا ہے ڈورتھی نے۔" زینب بائی بتاتیں

"ہونہہ! سب بہانے ہیں بی بی۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو یہ روز روز ناچ کی کھٹ کھٹ نہ بند ہو جاتی اور نیچے اب بھی بڈھا کھٹ کھٹ کے ساتھ انگریزی سارنگی کی ٹوں ٹوں کرتا ہے۔۔۔! رضیہ بیگم پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں جا کر پان منہ میں ٹھونس لیتیں۔ اور زینب بائی ایک بار پھر یہ بتانے کو بے چین رہتیں کہ ڈورتھی نے حنیف سے کہہ دیا ہے کہ ناچ تو اس کی زندگی ہے۔۔ وہ نہیں ناچے گی تو مر جائے گی۔ پھر حنیف کی بھی اس کے ہپ لوی ناچ پر جان جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ ہاتھوں میں ننھی ننھی مجریاں، جسم پر ذرا سی جھالروں والی گھگری اور چولی۔۔۔ زینب بائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ناچ کے وقت حنیف پاجامے کے بجائے سوٹ پہن کر بیٹھتا اور ڈورتھی اس کے سامنے ناچتی۔

"ہمارے کو پاجامہ اچھا نہیں لگتا پن حنیف پہننے کو مانگتا۔ ہم بولتا کھاون سوٹ پہنے گا تم۔" ڈورتھی زینب بائی سے شکایت کرتی۔ اور خود ہی کہنے لگتی۔ "حنیف کا بزنس ڈاؤن ہے۔۔۔ کام بہت کرتا تھک جاتا۔۔۔۔ اس کرکے ہم اس کا بزنس کا بہت کھیال کرتا۔ بزنس اچھا ہوئیں گا تو ہم منیجر رکھیں گا پھر ہم دونوں روز ایوننگ کو باہر جائیں گا ہوٹل پکچر فنکشن۔۔۔" ڈورتھی یہ سب کہتے کہتے اپنی کالی آنکھیں نیم وا کر لیتی۔ اس کے جبڑوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے دبے ہوئے رخساروں کی ندی سی نمایاں ہو جاتیں اور چوڑا دہانہ ذرا سا کھل جاتا جس میں سے سونے سے منڈھا ہوا دانت چمک اٹھتا۔

کرائی نے اپنا کمرہ حنیف کو دے دیا۔ کاریگروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ڈورتھی کے کھانے کی چھوٹی سی میز بچھ گئی۔ یہاں بیٹھ کر اب حنیف ناولیں پڑھتا جاتا اور کام کی نگرانی بھی کرتا جاتا۔ مال سپلائی کرنے کے جو آرڈر آتے انہیں بھی لیتا۔۔۔۔۔ مگر اس موقع پر ڈورتھی کو دوڑنا پڑتا۔ جیسے ہی کوئی موٹر یا موٹر سائیکل رکشہ نیچے رکتی ڈورتھی ہزار کام چھوڑ کر نیچے بھاگتی۔

"دیکھ یار آئے ہیں پرانے۔۔۔" رضیہ بیگم ہانک لگاتیں۔ اور زینب وہی جواب دینا ضروری سمجھتیں۔ اب یہ ان کی بد نصیبی تھی کہ ڈورتھی کی ان سے دوستی تھی۔ اور وہ انہیں ہر بات بتاتی تھی۔

"ڈورتھی نیچے مال مانگنے والے کے سامنے جا کر ایڈوانس کے واسطے انگریزی بولیں گا بائی۔ حنیف نہیں بولنے سکتا

. ڈورتھی بتاتا بغیر انگریزی لوگ ایڈوائس نہیں دیتا ۔" زینب بائی بتاتیں اور رضیہ بیگم کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اتنا ہنستیں کہ ان کے آنسو نکل آتے

دوسری منزل کے بہاری بابو صاحب بنی بوہرہ پڑوسن کو قسم کھا کر بتا چکے تھے کہ حنیف نے نوکری کے ڈیڑھ ہزار روپے اس کے بینک ہی سے نکلوا کر قربانی کو دیئے۔ اور بینک میں اکاؤنٹ ڈورتھی کے نام کا تھا۔

"اور اب دیکھو اسے چلاتا ہے...... کیسا بے غیرت..... .." بابو کہتے

نیکی مسز ڈگلس ہمیشہ بوہرہ عورت سے کہتے۔" دیکھا عیسائی وائف اپنے ہسبینڈ کی کتنی مدد کرتی ہے۔ اس نے حنیف کو کیا بنا دیا ...... پھر تم کو پتہ ہے وہ ہسپانوی ناچ کتنا اچھا ناچنے لگی ہے۔ ... وہ تو ہمیشہ سے ناچ کی دیوانی ہے۔ جب ذرا سی تھی سیلون کی لڑکیوں کو دیکھ کر منٹ بھر میں ناچ کی نقل کر لیتی ۔ ... تھی ...

ور بوہرہ عورت بڈھے ڈگلس کو یوں دیکھتی جیسے وہ پاگل ہو۔ یہ پاگل پن کی بات نہ تھی تو کیا کہ ڈورتھی کھٹ کھٹ کے سے وہ ہمیشہ نیچے ہوتا پھر بھی اسے علم تھا کہ ڈورتھی کیسا ناچ رہی ہے۔

پھر یک دن رضیہ بیگم کے لکھے ہوئے خط کے جواب میں راولپنڈی سے حنیف کی بیوی، ماں اور دونوں بیٹیاں آگئیں۔ روتی پیٹتی کرتی وہ سیدھی تیسری منزل کے کاریڈور میں آ کر برقعے اتار کر بیٹھ گئیں۔

"ارے کیا کر ڈالا ۔ ارے پردیس میں ڈال کر منہ پھیر لیا۔ .. ارے کرانچی میں راس رچالیا" حنیف کی بیوی نے سینے پر ہاتھ مار مار کر ایسے درد سے بین کئے کہ رضیہ بیگم، زینب بائی اور بلڈنگ کی دوسری عورتیں بھی اس کے گرد اکٹھا ہو کر رونے لگیں۔ . . حنیف کا چہرہ غصے سے سرخ تھا ۔ وہ اب اتنی عورتوں کے سامنے اپنی بیوی کا منہ تھپڑوں سے تو بند کرنے سے رہا تھا۔ ... اس نے بیوی کو گھسیٹ کر ڈورتھی کے فلیٹ میں ڈال دیا اور پھر آہستگی سے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"اماں کیا کروں یہاں مکان نہیں ملتا۔ ورنہ آپ کو پہلے بلا لیتا۔..."

تب ڈورتھی سبزی گوشت کی ٹوکری اٹھائے تیسری منزل پر نمودار ہوئی۔ عورتیں اب تک کوریڈور میں جمع تھیں۔

"حنیف بھائی ڈورتھی آ گئی ..." رضیہ بیگم نے منہ پر دوپٹہ ڈال کر باآواز بلند یوں اعلان کیا جیسے بھاگا ہوا چور پکڑا گیا ہو

ڈورتھی اندر آ گئی... سب منتظر تھے... . پھر سب مایوس ہو گئے۔

ڈورتھی نے اپنا ایک کمرہ خالی کر دیا ـــــ بیچ میں سے دروازہ بند ہو گیا۔

"کیا ہو سکتا۔ ادھر بنا پگڑی روم نہیں ملیں گا۔ اور حنیف کا بزنس ڈاؤن ہے۔ کاریگر مزدوری بہت مانگتا۔ لیبر دوپہر کا ٹائم کھانے کا چھٹی مانگتا۔ ایک دو گھنٹہ کھانا کھاتا رہتا ـــــ اور ادھر کا کام بند رہتا۔ ـــــ ہم استاد بندو بولا یہ بات گڑبڑ کا ہے۔ وہ بولا کھانا تو مانگتا ہم بولا سمجھو ادھر ہم کینٹین بناتا۔ دوپہر کا کھانا ہم دیں گے۔ ... کھانے کا پیسہ مزدوری میں کٹواؤ ـــــ سب بڑا فیکٹری میں کینٹین ہوتا۔ ... اب ادھر ایک روم ہے۔ پن ہم گزارہ کریں گا۔ ... فیر جب حنیف کا بزنس "ناں" نہیں کریں گا تو ہم پگڑی پر بڑا فلیٹ لیں گا۔ ..." ڈورتھی نے اپنے ڈرائنگ روم کو سیٹ کر کے کونے میں کر دیا اور پردے کے پیچھے اسپرنگ والے پلنگ کے پاس تین جڑی میز پر بڑے سے دیگچے میں گوشت بھر کر انگیٹھی دھونکنا شروع کر دی۔

"فو! حنیف اس کو کبھی پسند نہیں کیا..... وہ بولتا بہت سست عورت ہے۔ پھر حنیف کا کھیال نہیں کیا کبھی.... " ڈورتھی ہاتھ جھٹک کر مطمئن انداز سے بولی۔

شام کو بڑی دیر تک مسٹر ڈگلس انتظار کرتے رہے کہ وائلن چھیڑیں۔ .. پھر جب وہ مایوس ہو کر اپنا سفید کوٹ پہنے ایک سیٹھ کے ہاں ٹیوشن کے لیے جانے لگے تو ڈورتھی کے کمرے میں کھٹ کھٹ شروع ہو گئی.... مسٹر ڈگلس اچھل کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے اور وائلن بجانے لگے۔ ونڈرفل اونڈرفل! وہ بڑبڑاتے رہے۔

ادھر حنیف کی ماں اس کھٹ کھٹ سے گھبرا کر رضیہ خانم کے پاس پہنچیں اور جب انہیں پتہ چلا کہ اس کھٹ کھٹ کا مطلب کیا ہے تو انہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

"ارے حنیف کیا اگلم کر رہا ہے۔

حنیف ماں کو نہ سمجھا سکا۔ ورا سے ڈورتھی سے بات کرنا پڑی۔

"پر مسٹر ڈگلس ہم بولا حنیف ناچنا ہمارا شوق ہے ... ہم ناچیں گا اور تم دیکھیں گا۔ اس کے بنا ہم مر جائیں گا..... فیر حنیف بولا ڈارلنگ تم ہمارا مدد کو نہیں جانتا ... اس کر کے تم روز ناچ واسطے مسٹر ڈگلس کے گھر جانا تھا .... مے آئی ڈانس ہیر؟ (کیا میں یہاں ناچ سکتی ہوں)" ڈورتھی بڑے پیار سے مسکرا کر بولی۔

ڈورتھی نے ایک کونے میں جا کر کھڑکی اور چوبی سی اور کرسی پر بیٹھ کر حنیف کا انتظار کرنے لگی۔ پھر حنیف سوٹ پہنے تالی ہاتھ میں لیے مسٹر ڈگلس کے گھر آ گیا اور ڈورتھی دیوانہ وار ناچتی رہی۔ .. ناچتی رہی

فیکٹری میں کام کی دیکھ بھال کے لیے منیجر آ گیا۔ یہ حنیف کا سالا تھا۔ ڈورتھی کو کینٹین چلانے اور سینڈوچوں کے نئے ڈیزائن تیار کرنے سے اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ آرڈر بک کرنے اور بل وصول کرنے جا سکتی۔ اس لیے اس کام کے لیے حنیف کے سالے کی رائے سے ایک اینگلو پاکستانی لڑکی کو پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیا گیا۔

پھر انہیں دنوں رضیہ بیگم کی بیٹی سے حنیف کے سالے کی شادی کی بات پکی ہو گئی ساتھ ہی حنیف کی والدہ کی رائے ہوئی کہ حنیف کی بڑی لڑکی ماشاءاللہ چودہ برس کی ہو گئی ہے اور ماحول اچھا نہیں اس لیے اسے بھی چلتا کیا جائے..... رضیہ بیگم نے اس سلسلہ میں مدد کی اور حنیف کی لڑکی کی بات بھی طے ہو گئی۔

کاروبار پھیلایا جائے تو نفع یوں بھی کم ہوتا ہے اس پر سے شادیاں آ پڑیں۔ حنیف کی لڑکی کا جہیز ایک مسئلہ بن گیا۔ ایک دن وہ بغل میں پوٹلی دبائے ڈورتھی کے کمرے میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ کافی دیر سوچنے کے بعد اسے وہ انگریزی لفظ یاد آیا جس سے اسے ڈورتھی کو مخاطب کرنا تھا۔

”چھپر ڈارلنگ! بے بی ہونا“ ممی دکھلوادی ہم کو شادی واسطے یہ کپڑے دے دیتا ہم دیکھ ڈارلنگ! ہم کو بہت شیم ہوا (شرم)۔ تم کچھ کرنا مکتا ڈارلنگ۔“ ڈورتھی نے اس رات جہیز کے معاملے میں دخل دینا چاہا۔ مگر حنیف ڈیٹ گیا۔

”میں کیا کروں تم خود ہی تو بزنس پھیلوا رہی ہو .. میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ ”ایک بات بولیں گا ڈارلنگ۔ تم غصہ تو نہیں کریں گا ہم تمہارا دیا ہوا چاروں ساری ”بے بی“ کو دے دیا۔ ور گولڈن سینڈل بھی۔ .“

ور حنیف نے غصہ کیا .. ڈورتھی سے چوتی رہی ڈوا پنے آپ کو چھڑا کر باہر چلا گیا ...... یہ اس کے رکنے کا وقت تھا کیونکہ ڈورتھی اس وقت ڈگلس کے ہاں جا کرنا چاہتی تھی۔

تب ڈورتھی دھم دھم کرتی کوریڈور سے گزری اور ڈگلس کے ہاں جا کر اتنا ناچی کہ بے دم ہو گئی۔

دونوں شادیاں ہو گئیں... کینٹین چلتی رہی ...... حنیف کی بیوی کو تیسرے آٹے کی بیمار ہو گئی اس لیے کینٹین کا کھانا ادھر بھی جانے لگا

اور پھر ایک رات بلی کی طرح ایک نوزائیدہ بچہ ڈورتھی کے دوسرے کمرے میں رو دیا۔

اسی دن جلیبہ بائی کا کارندہ ڈورتھی کے دروازے پر آیا کہ کچھ کرائے میں اضافہ کر دو . ڈورتھی آج اپنے کمرے سے چولی گھگری میں ملبوس مجیریاں انگوٹھیں میں پہنے بغیر کسوٹو کے باہر آ رہی تھی۔

کارندے کے منہ سے کرائے میں اضافے کی بات سن کر وہ ایک دم ویسی ہی بن گئی جیسی پانچ سال پہلے اس وقت ہوگئی تھی جب کارندہ حلیمہ بائی کی طرف سے اس کے خلاف بدکاری کی شکایت لے کر آیا تھا

"کیا بولا کرایہ بڑھائیں گے . ہاں ہمارا کھال کھینچ لو . وہ سینہ ابھار کر کولھوں پہ ہاتھ رکھے اس کی طرف بڑھی . کارندے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"کیا یہ بولتا... ہم بولتا ہے یہاں ہمارا دس سال کا وہائٹ واشنگ اور پینٹ کا پیسہ واپس کریں گا... بھاگ جاؤ اپنا حلیمہ بائی کو بولو ہمارا پیسہ دیں . ... کیا ہمارے کو دیکھتا؟" ڈورتھی نے برا سا منہ بنا کر اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکیاں بجائیں وہ کارندے کے منہ میں جو آیا وہ بکنے لگا.... . یہ اچھی باتیں نہ تھیں .... . رضیہ بیگم زینب بائی اور حنیف کی ماں سب اپنے کمروں سے جھانکنے لگیں۔

وہ ڈورتھی برابر گالیاں بکتی حنیف کو بلانے اتری

مگر فیکٹری کی چابیاں لیے حنیف کا سالا اوپر آ رہا تھا اس نے بتایا حنیف مس ہما کے ساتھ آرڈر بک کرنے گیا ہے۔

تب ڈورتھی مسٹر ڈگلس کے کمرے میں گالیاں بکتی گھسی

یس مسٹر ڈگلس . "

مسٹر ڈگلس ساری تفصیل سنتے ہوئے اپنا وائلن رومال سے صاف کرتے اور سر ہلاتے رہے

پھر مسٹر ڈگلس نے وائلن پر گز پھیرا... . ڈورتھی کھڑے سے بیٹھ گئی۔ دھن بڑھی تو کرسی پر سر ڈال دیا اور ٹانگیں پھیلا دیں۔

مسٹر ڈگلس نے دیکھا اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں پر بھدی کی جھینپیں تھیں اور کوئلے کی کالک . . ان کا گز اور تیز ہو گیا۔

ڈورتھی نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں اور ہاتھ کرسی کے ہتھے سے گرا دیے۔ مسٹر ڈگلس نے دیکھا کہ اس کے پالش اڑے ناخنوں میں سوکھا ہوا آٹا بھرا ہوا تھا... اور پھر گس سے پھریاں فرش پر گر گئیں۔

"آئی ایم ٹائرڈ ... .. آئی ایم ویری ٹائرڈ . .." (میں تھک چکی ہوں) ڈورتھی بڑبڑائی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں

. مسٹر ڈگلس نے وائلن بکس میں رکھ دیا اور کالی پٹی والی سفید کوٹ پہن کر ٹیوشن کے لیے چلے گئے.. پر جانے آج ان کا سر بار بار اس طرح کیوں ہل رہا تھا جس طرح وہ اپنے کسی عزیز کی موت کی خبر پر ہلاتے تھے۔

"رات بھر بلی کی طرح کوریڈور میں پھرتی رہی تھی کم بخت . زینب بائی نے کہتی تھی کہ بچہ میں رکھوں گی بڑے والی

عورتیں بچے کو رکھنا نہیں چاہتیں ـــــ بے ناذات کی آیا؟ ـــــ بچے کو اس سے بچا کر رکھنا اسے پی اس کا کوئی ٹھیک نہیں ـــــ "
رضیہ بیگم حنیف کی ماں کو چپکے چپکے بتا رہی تھیں۔

تب حمیدہ بائی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی رابعہ بائی بلڈنگ جو انہیں اپنی دادی کی طرح نظر آتی تھی' بوسیدہ و زرد محل ـــــ پھر انہوں نے آنکھیں میچ کر دور تک کے کمروں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ نیلا رنگ اڑ چکا تھا شیشے ٹوٹے اور دھواں لے!

"اچھا تو دور تک ایسا ہوا . . . "انہوں نے مڑ کر اپنے کارندے کو دیکھا اور تھک کر بولیں "امین بھائی اب اس بلڈنگ کو گرانا ہی پڑے گا...... ایک کرایہ دار بھی اچھا نہیں رہا .... اب ادھر نیو بڑا فلیٹ بنائیں گا...... گورا لوگ جتنا کرایہ مانگو دیں گا..... "

◆◆◆

موج اور تہہ

"دیکھو، ملک فصیل کی اوٹ میں چاند کیسا سا معلوم ہوتا ہے نا؟" دارا نے کھڑکی سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے موج میں آ کر کہا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اگر وہ چاہے تو شاعر نہ سہی کم سے کم اچھا خاصا افسانہ نگار ضرور بن سکتا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے اس ٹائپ کے لوگوں کی حکام کے حلقے میں رسائی دیکھ دیکھ کر وہ خواہ مخواہ ادب سے مرعوب سا تھا...... ہنہ۔ .. مگر اسے ضرورت کیا ہے اس قصے میں پڑنے کی۔ وہ تو پہلے ہی ایک اچھا بھلا افسر ہے .... اس نے سوچا ... مگر پھر بھی قدموں میں پڑی ہوئی خدا داد صلاحیت کے احساس سے اسے بے حد فرحت ہوئی اور اس نے وہسکی کا ایک ڈبل گھونٹ حلق میں اتار لیا۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو ہر برسرِ روزگار کنوارے عام طور سے موج میں ہوتے ہیں .. تو وہ بھی صبح سے موج میں تھا۔ وہ کافی پرانا کنوارا تھا۔ ایک بہن تھی وہ بڑے گھر سے بیاہی ہوئی تھی۔ ماں باپ سے چھٹی تھی۔ اس لیے مہینے کے بقیہ انتیس دن کا خیال بھی یہ موج سر سے نہ اتار سکی۔ اس طبقے کے کنوارے اس عمر تک پہنچتے پہنچتے یا تو تجربہ ہو کر کسی قسم کی انجمن وغیرہ کی بنیاد ڈال کر سوسائٹی کا خلیفہ بننے کو ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں یا پھر تر ہے کتاب جب کو ورق کی بے مقصد سیر کے قائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ کچا تو تھا (اور اس کچ کی وجہ سے وہ لڑکیاں جو اسے پسند آئیں وہ کسی اور کو پسند کر لیتیں) مگر مجھ کچیر و نہیں تھا۔ اس لیے سے خلیفہ بننے کا خیال اب تک نہیں آیا تھا۔ کتابیں وہ ضرور پڑھتا کیونکہ اچھا خاصا بڑا سرکاری افسر اب کوئی کلرک کی طرح رات دن قلم تو گھستا نہیں، چند فائلوں پر دستخط کیے اور پھر کھلا فرصت۔ رہے دفتر کے اوقات میں آنے جانے والے ان کی بھیڑ ذرا سی میں چھٹ جاتی کیونکہ وہ خود بے حد کم گو تھا۔ وہ غیر معمولی آدمی نہیں تھا۔ مگر اسے پسند تھا کہ لوگوں میں ممتاز نظر آئے۔ .. سگریٹ سبھی پیتے ہیں اس لیے وہ اپنے چھوٹے سے قد کے ساتھ لمبا سا سگار پیتا ... سو وہ اس وقت بھی اپنے اسکول کے زمانے کے ساتھی ملک کے ساتھ وہسکی پیتے ہوئے سگار پی رہا تھا۔

ہاں تو موج میں ہونے کی بات سر پہ سوار تھی۔ شام کو مال روڈ پر ٹہلنے کے بعد یک بڑی فیشن ایبل دکان کے اندر جاتے ہوئے اسے ملک مل گیا جو وہاں سے ریڈی میڈ سستی سی بش شرٹ کا پیکٹ لیے باہر نکل رہا تھا۔ ملک یک معمولی سی ملازمت پر تھا۔ اس کے زین کے پتلوں کی کریز ہمیشہ بگڑی رہتی۔ اور سر پر کھچڑی بال خشکی ہونے کی وجہ سے کھڑے ہوئے معلوم ہوتے۔ دارا ملک کے

ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دکان میں گھس گیا۔ اس نے مالک سے نہ ملنے کے شکوے کرتے ہوئے اتنی بہت سی چیزیں خرید ڈالیں کہ مالک کو بار بار چیزوں کے مہنگا ہونے کی طرف اشارہ کرنا پڑتا۔ اور دارا کو اپنی اس فضول خرچی پر یک ہلکا سا نشہ محسوس ہونے لگا۔ مرد کی ضروریات کی کتنی اشیو نگ کریم سے شروع ہو کر ٹائی پر ختم۔ لیکن دارا نے فوراً ہی اس کے لیے یک عدد سلیپنگ سوٹ بھی خرید ڈالا۔ مالک نے بہت ناں ناں کی مگر دارا آج اتنا موج میں تھا کہ وہ کسی اور کو بھی خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ آج اس کے پاس کی لڑکی نے اسے چائے کی پیالی دیتے ہوئے قصداً اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس کر دی تھی۔

شام بہت دھلی دھلائی تھی دوپہر اچھی خاصی بارش ہو چکی تھی۔ اور اب ٹھنڈی فضا میں چاندی روشنی پارے کی طرح رگوں میں اتر کر ناچ رہی تھی۔ وہ بیڈن روڈ کے نکڑ کے ساتھ پی رہے تھے۔ وسکی میں پانی کم ملایا جا رہا تھا اور نکڑوں میں مرچیں بہت تھیں۔ مگر سوچ چڑھ رہی تھیں۔ کھلی کھڑکی سے چاند نظر آ رہا تھا۔ اور مالک دارا کے سامنے اپنی زندگی کے دکھڑے رونے کے بعد اب آہیں بھر رہا تھا ۔ وہ تین سال سے رنڈوا تھا اور چھ بچوں کا باپ۔ بچے جنہیں اس کی بیوہ بہن اس کی معمولی سی تنخواہ پر پال رہی تھی۔

اور دارا اسے قیمتی وسکی پلا رہا تھا۔ اسے اپنے پرانے غریب دوستوں کو اس طریقے سے ممنون کرنے میں ویسا ہی مزا آتا تھا جس طرح اپنے کسی ملنے والے کی مسلسل باتوں کے جواب میں دانتوں تلے سگار دبا کر ان سنی سوچنے میں۔ وہ کسی کو قرض نہیں دیتا تھا۔ اس کے بجائے قرض مانگنے والے دوست کو کسی بڑے ریستوران میں سینڈوچز اور کافی پلا کر اپنی اقتصادی حالت زار کا اظہار کر دیتا۔ تو وہ اس وقت نیوڈریسنگ گون پہنے اپنے آپ کو بالکل نیا نیا سا محسوس کر رہا تھا۔ اور مالک کو بڑے ہمدردانہ طریقے سے دیکھ رہا تھا۔ جو اب اس کے غسل خانہ میں نہا کر اس کا دلوایا ہوا نیا سلیپنگ سوٹ پہنے عجیب انداز سے گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اور بار بار اپنے سینے پر ہاتھ پھیر کر نئے کپڑے کی چکناہٹ محسوس کر رہا تھا۔ مالک کی اس ادا سے دارا کو اچانک ایک عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے چائے کی پیالی کے تلے سے وہ لمبی مخروطی انگلیاں مچل کر نکلیں اور ننھی رنگین مچھلیوں کی طرح اس کے سارے جسم کے اندر تیر گئیں۔ اسے بنا سینہ کش دوہرا محسوس ہوا۔

تبھی اس نے ایک دم اپنے آپ کو بے حد عظیم محسوس کیا۔ وہ اٹھ کر نوکر کے پاس گیا۔ دارا سے سائیکل پر شہر کی طرف دوڑایا۔

"تمہارے لیے منگوائی ہے مالک" دارا نے دوبارہ اندر آ کر یوں کہا جیسے ایک بہت بڑے مجمع سے مخاطب ہوا۔ اور پھر اپنے سگار کی راکھ وسکی کے گلاس میں جھاڑ کر کتابی فلاسفروں والے انداز سے کسی دھیان میں غرق ہو گیا۔

"اور اپنے لیے بھی؟" مالک نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ ـــــ" دارا نے مستحکم انداز سے جواب دیا۔ اور بچی ہوئی شراب حلق سے اتار گیا۔

"میری ایک بڑی خوبصورت تعلیم یافتہ اور بڑے باپ کی بیٹی سے دوستی ہے بس کافی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے دارا کو ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ یہ قصے بے حد قبل از وقت اس کے دماغ میں تیار ہو گیا ہے۔

"نہیں نہیں۔ ۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" مالک پر رقت طاری ہونے لگی دراصل وہ دار کی اتنی بڑی قربانی سے بھونچکا سا رہ گیا تھا۔

"میرا کیا ہے بہت کچھ دیکھ لیا دنیا میں۔" دار نے اپنے گلاس میں بوتل انڈھاتے ہوئے کہا۔ ہاں واقعی وہ کوئی بچی ضرورت کے لیے ترسا ہوا تھا مالک کی طرح۔

"کیسا معاملہ ہے۔" "مالک" نے والے "معاملے" پر ذرا سوچا۔

"گھریلو" دارا نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ـــــ "مجھے یہ بازاری معاملے پسند نہیں۔ تمہارے لیے بھی نہیں۔"

واقعہ یہ گھریلو معاملے کچھ تو لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ چاہے ہوں کچھ۔ گرمٹی کے نئے گھڑے کی طرح پانی کا سامنا ہوتے ہیں بڑے سوندھے طریقے سے سنسناتے ہیں۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ دار نے سوچا جانے گھریلو زندگی سے اتنا دور بھاگنے کے باوجود وقتی تفریح میں بھی گھریلو رکھ رکھاؤ اس کیوں پسند ہے اور وہ کھڑکی میں پیپل کی اوٹ سے چھپتے ہوئے تیکھوں چاند کو دیکھنے لگا۔

دروازے پر منہ زور گھوڑے کی ٹاپیں اور گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو زور سے بجے۔ دارا نے منہ سے سگار ہٹا کر مالک کو دیکھا۔ مالک کی پیشانی پر پسینہ جیسے پھوٹ پڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں گلاس کانپ رہا تھا۔ وہ یوں استقبال کے لیے اٹھا جیسے اس کا افسر آ رہا ہو۔

"گھریلو معاملہ اندر آ گیا تو اس کے ساتھ کے لونڈے نے ضد شروع کی کہ آپا میں تو سینما دیکھوں گا.... اور ادھر سے انکار۔ ہائے نہ جاؤ۔ ابھی چائے پی کر چلتے ہیں۔"

مالک اس لڑکے کی طرف بس ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ واقعی اس کا گھر بگاڑنے پر آمادہ ہو۔ دارا نے عین وقت پر مالک کی مشکل آسان کر دی۔

پانچ روپے کا نوٹ لڑکے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور وہ چل دیا۔ پرائیویٹ معاملے کی یہ پہلی قسط تھی!

مگر یہ معاملہ صوفے پر پنجوں کے بل براجمان ہو گیا۔ برقع جوں کا توں جسم سے لپٹا ہوا۔

گرمی ہے برقع اتار دیجیے۔ دارا نے مالک کی ایک اور مشکل آسان کر دی۔ کیونکہ مالک کی نظریں یوں برقع کا طواف کر رہی تھیں جیسے پرانی کہانیوں کا شہزادہ دو دروازے کے محل کے گرد چکر لگا رہا ہو۔

"پئیں گی؟" دارا نے اپنا گلاس اٹھا کر پوچھا۔

"چائے۔" جواب ملا۔ بے باک ہنسی۔ بے حد دھلی ہوئی آنکھیں۔ "معاملہ" گھریلو تھا یا نہیں۔ یہ بات تو دارا کا پرانا ملازم ہی جانتا ہوگا۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ اس "معاملہ" کے گھر کی سب دیواریں ڈھے چکی تھیں۔

دارا نے نشے میں بھی پہچان لیا کہ سڑک کے نل سے پیاس بجھے گی میں، مالک کی۔ پھر اسے اپنے نوکر پر غصہ آیا۔ اس نے ضرور اس عورت سے کمیشن لیا ہوگا۔

مگر رات اتنی نرم اتنی سہانی اور اس قدر مہکی ہوئی تھی کہ اس کا غصہ چند ہی گھونٹوں میں حلق کے اندر کہیں کھو گیا۔ اور پھر وہ نہایت شائستہ انداز سے سگار کے دانتوں کے تلے دباتے ہوئے غسل خانے میں چلا گیا۔

جب وہ کمرے میں واپس آیا تو مالک اپنے "معاملے" کی زلفیں سلجھا رہے تھے۔ اور چسکیاں لے رہے تھے۔ دارا کو فوراً اپنے پاس کی لڑکی کے گھنگریالے بال یاد آ گئے۔ اور اس نے خود کو اس ماحول سے الگ تھلگ سا محسوس کیا

"آیئے جی آپ بھی بیٹھئے۔" موٹے موٹے سرخ لب ایک ادا سے کھلے دانتوں کی کوندی ہوئی اور سرخ زبان منہ کے اندر شعلے کی طرح لپکتی سرکتی نظر آئی۔

"ہاں تم بھی بیٹھو یار۔" مالک نے زلفوں میں ناک گھساتے ہوئے کہا۔

دارا جیسے مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑا نیچے دیکھتا رہا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ بلندی پر سے نیچے دیکھنا بھی تو ہمت کا کام ہے۔ بہت سے لوگ چکرا کر گر پڑتے ہیں۔ وہی ہوا۔ کیوٹکس لگے ہاتھ کے اشارے پر دارا دوسرے لمحے اوپر سے لڑھک آیا۔ اب وہ آنکھیں بند کیے "معاملہ" اپنے پہلو میں گھسیٹ رہا تھا۔ اور مالک کیوٹکس لگا ہاتھ اپنی طرف گھسیٹ گھسیٹ کر چوم رہا تھا۔ اس کے چند لمحے بعد دارا کے حصے میں صرف کیوٹکس لگا ہاتھ رہ گیا۔

یہ ایک مدہوش کر دینے والا کھیل تھا۔ دارا کے لیے ایک نیا تجربہ۔ دارا کو یوں لگا جیسے وہ اور مالک قدیم زمانوں کے جنگلی ہیں۔ جلتی لکڑیوں پر پرندہ بھن چکا ہے اور اب وہ دونوں بیک وقت اسے کھانا چاہتے ہیں۔ جلتا جلتا پرندہ ایک کے ہاتھ میں آتا ہے اور دوسرے

دانت اس میں پیوست کر دیتا ہے۔ اور دوسرے سے بھنے ہوئے گوشت پر سے جو کبھی پہلے کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے دوبارہ اس پر سے دانت گاڑ دیتا ہے۔ دارا کے دل میں اس الو کے ہیجان خیز احساس نے ایک چبھن سی پیدا کر دی۔ کیونکہ وہ ایک مہذب آدمی تھا۔

شاید احساس اس لیے پیدا ہوا کہ یہ عورت سخت گھٹیا قسم کی رنڈی ہے۔ دارا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ وہ ادھر کئی برسوں سے مہنگے داموں صرف چار دیواری والی لڑکیوں کا عادی تھا جو اپنے گھر یاد کرنے کے باوجود بھول جاتی تھیں، جو ایک رات کے لیے آتیں تو دلہنوں کی طرح شرماتیں صبح بستر کی چادر جھاڑ کر بیویوں کی طرح دوبارہ بچھاتیں۔ سگار کی راکھ پلو سے صاف کر کے میز چمکا دیتیں۔ (کئی تو باورچی خانے سے چائے کی ٹرے بھی اٹھا لاتیں) اور جاتے وقت یوں جاتیں جیسے پھر بدلے تو کہہ رہی ہوں۔

دارا نے کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی کی طرف دیکھا۔ اور اپنے اندر گھٹتے ہوئے ہیجان کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر ہر چیز تنگ ہو چکی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے (اگر دکانوں سے خریدیں تو دکانیں بند ہو جائیں گی) اور سماجی مجبوریوں پر لعنت بھیجنے کے لیے اس "کمرشیل معاملے) سے کمرشیل قسم کے سوالات بھی نہ کر سکا۔

تم نے یہ کام کیوں شروع کیا؟

تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟

میرا شادی کا ارادہ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ اسے وہ تقریباً بند سے لگے جواب سننے کا ہوش رہا۔

اس وقت دروازے پر دھڑ دھڑ شروع ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ دارا نے ناگواری سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"کیوں بھئی تو بچے ہی مر گئے۔" برآمدے کے روشنی میں اس کا عزیز دوست نعیم کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے بنڈل تھے...... بنڈل زمین پر گر گئے مگر نعیم دارا سے گلے مل ہی رہا۔ دارا کو بڑی کوفت ہوئی کہ آخر وہ کیسے بھول گیا کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نعیم اپنی بڑی سی موٹر کار میں لاہور آتا ہے اور ایک رات اس کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ اور یہ بنڈلوں والی شاپنگ جانے کے سلسلے میں ہوتی ہے۔

"کیوں بے اکیلے اکیلے پی لی ہمارا انتظار نہ کیا۔" نعیم نے بنڈل میز پر پٹخ کر گلاسوں کی طرف دیکھا اور پھر برقع اور دوپٹے کی طرف جو ابھی تک صوفے پر پڑے ہوئے تھے۔

"یہ ... یہ ایک عورت کے ہیں۔" دارا نے اعتراف جرم کے طور پر کہا۔ جب نعیم گھر آتا تو وہ دونوں مل کر یہ سارے راس

رہا چکے تھے۔ مگر جب سے نعیم کی شادی ہوئی تھی۔ دارا کو یوں لگتا جیسے ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ نعیم اب آتا تو عورت کی کمر اور گردن کی بجائے بوتلوں کی کمر اور گردن کی خوبصورتی پر بات کرتا اور دارا نے بغیر کسی کوشش کے نعیم اور اپنے درمیان کی اس اوٹ کو قبول کر لیا تھا۔

اب اس وقت دارا کو شرم آ رہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نعیم اس بات کو پسند نہ کرے گا۔ وہ کئی بار اپنی گذشتہ لغزشوں کو یاد کر کے شراب کے نشے میں توبہ کر چکا تھا۔ اسے اپنی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیوی سے بے حد محبت تھی۔ وہ لاہور آتا تو اپنی بیوی کے لیے بے شمار تحائف خرید کر لے جاتا۔ دارا کے پاس رات رکتا۔ مگر شراب یوں پیتا جیسے دارا نے اس سے بے حد اصرار کیا ہو۔ مگر خوب پینے کے بعد وہ اپنی بیوی کے حسن اور شرافت کی باتیں کرتا۔ اور ہر بار کہتا کہ وہ شراب کو برا سمجھتی ہے۔

پھر اسی عالم میں وہ دارا کو نصیحت کرتا کہ جلدی سے شادی کر لو دنیا میں جنت مل جائے گی۔

"ادھر کمرے میں مالک ہے۔" دارا نے یوں کہا جیسے وہ تو اب تک شراب ہی پیتا رہا تھا۔ وہ صراحی میں سے ایک اور گلاس اٹھا کر نعیم کے لیے انڈیلی۔ اور پھر اپنے لیے۔ اس کا نشہ کمزور پڑ چکا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کرے۔

"اچھا میاں مالک کی مدارات ہے۔ وہی تو میں حیران تھا۔" نعیم نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے پتلون کے بکلس ڈھیلے کیے اور دروازے سے دور کرسی پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

دارا عجیب سی کوفت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دماغ خالی تھا۔ حتیٰ کہ اس نے باس کی لڑکی کے بارے میں سوچنا چاہا تو وہ خیال بھی نہ جما۔ اسے حیرت ہوئی کہ شام سے وہ آخر کیوں اتنا خوش تھا۔ اب تو اس کا پینے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نعیم اپنی چار سالہ بچی کی شرارتیں سنا رہا تھا۔ اور وہ دانتوں تلے سگار دبائے آنکھیں نیم وا کیے بیٹھا رہا۔

"میں تمہارے کھانے کے لیے بھی کہہ دوں۔" دارا کو بکائی سی آئی وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

نعیم نے لمبے لمبے گھونٹ لیے اور پھر یک دم کوندی ہوئی اور کمرے میں سستے ہیر آئل کی تیز بو پھیل گئی۔ نعیم نے پھیلی ہوئی آنکھوں اور گھومتے ہوئے سر کے ساتھ ایک ایسی عریانی دیکھی جس کے کپڑوں کے ساتھ جیسے کھال بھی اتر گئی ہو۔

"تنگ کر دیا جی۔ میری قمیض پھٹ کر دی۔ لیڈی ہملٹن کی نئی قمیض خراب کر دی۔ اب پڑے ہیں نٹ!"

نعیم کو لگا کہ صوفے پر اس کے قریب کوئی چیز دھنک سے گر پڑی۔ اور اس کا سر لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ پھر اسے ایک اذیت ناک سا احساس ہوا کہ گویا کوئی مٹھائی ڈال کر اس کے بھیجے کو متھ رہا ہے۔ اور اس نے بڑی بے بسی سے خواہش کی کہ دارا ابھی کمرے میں ہوتا

تو تو

دھر غسل خانے میں دارا جانے سے قے کر رہا تھا یا نہا رہا تھا۔ پانی بہرحال اندھا دھند بہہ رہا تھا۔ جب دارا کمرے میں داخل ہوا تو نعیم نے اپنا سر ہاتھوں میں لے لیا۔ جیسے وہ اپنے سر کو ٹٹول کر پوچھنا چاہ رہا ہو یہ اسی کا ہے یا کسی اور کا!

جب کھانا آیا تو مالک کو منہ پر چھینٹے ڈال کر جگایا گیا۔ ان تینوں دوستوں نے بس تھوڑا کھایا۔

وہ تینوں چپ نہیں رہنا چاہتے تھے جیسے خاموشی انہیں نگلنے اشارے کرتی ہو۔ اس لیے وہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔ کاروبار سے لے کر سیاست تک کی باتیں۔ ... نشے ٹوٹ چکے تھے لیکن عورت اپنی گیلی لیڈی ہملٹن کی قمیض پہنے مسلسل کھائے جا رہی تھی۔ اور جب وہ ڈھیر بھر کھا چکی تو دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ مالک نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں کو کھولتے ہوئے دارا کی طرف خوف سے دیکھا۔

"وہاں تمہاری کوئی چیز نہ اٹھا لے۔"

اور دارا نے دبے قدموں اٹھ کر اندر جھانکا۔

"بال سنوار رہی ہے اسے منع کرو دھونا پڑے گا کنگھا مجھے۔" دارا نے واپس آ کر مالک سے بڑی ناگواری سے کہا۔ اور پھر مالک کو نہ اٹھتے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر باتیں کرنے لگے۔

عورت دری پر بھاری بھاری قدم رکھتی اندر آ گئی۔ اور وہ صوفے پر دارا کے قریب بیٹھ گئی۔ پہلے وہ ان سب کی طرف طرح طرح کے انداز بنا کر دیکھتی رہی۔ پھر انہیں متوجہ نہ پا کر اس نے صوفے کے قریب میز پر پڑے ہوئے نعیم کے سامان میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھ لیا۔ وہ سب کو متوجہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"اس میں کیا ہے جی؟" اس نے موٹے موٹے ہونٹ کھول کر پوچھا۔

"کچھ نہیں رکھ دو اسے۔" مالک نے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا۔

"واہ میں تو کھول کر دیکھوں گی۔" اس نے کاغذ کھول ڈالا۔ اس میں سفید نگوں کے زیور کا ایک سیٹ جگمگا اٹھا۔ عورت اب بغیر بناوٹ کے کھل کر ہنسی۔

"میرے لیے؟"

"ارے یہ نعیم صاحب کا ہے۔" دارا نے آہستہ سے کہا۔ اسے اس عورت کی حرکتیں بری معلوم ہو رہی تھیں۔

"تو کیا وہ خود پہنیں گے؟" عورت نے بہت بن کر برا ماننے کا نشہ بتایا "میں پہن کر دیکھوں؟"

وہ بڑے انداز سے مسکرائی اور وہ جیز دھیز بھاگتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نعیم سخت بے چین ہو کر اٹھا اور پھر اسی عالم میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ دارا نے کڑی نظروں سے نعیم کو دیکھا اور نعیم نے نظریں جھکا لیں۔ "کہیں وہ زیور لے کر بھاگ نہ جائے!"

مالک کا نشہ ہرن ہوا۔

دار مالک کی باتوں سے سخت کوفت محسوس کرنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ دروازے پر بے حد قلمی انداز کا پوز بناتے ہوئے نمودار ہوئی۔ اس کے کانوں گلے اور ہاتھوں میں نگ چمک رہے تھے۔

"میں کیسی لگتی ہوں جی؟" اس نے دوپٹہ ایک کندھے پر ڈالے لہراتے ہاتھ ملا کر پوچھا۔

تینوں نے اسے بیک وقت دیکھا اور یوں دیکھا جیسے دیکھنا دوبھر ہو۔

دارا نے باورچی خانے میں جا کر اپنے نوکر سے کہا۔ کہ عورت کو بھیجنے کا انتظام کرے۔ اور پھر وہ آ کر اپنے آفس کی باتیں کرنے لگا۔

عورت بور ہو کر وہیں صوفے پر بڑے اسٹائل سے دراز ہو گئی۔ اور جب چاند بلند ہو کر قلمی کے پتوں کو عورت کے ہاتھ اور گلے میں پڑے ہوئے نگوں جیسی روشنی بخشنے لگا تو دروازے پر "یا آپا" پکارنے کی آواز آئی۔ دارا کو لونڈے کی اس ڈھنڈورا پیٹنے والی حرکت پر پھر غصہ آیا۔

عورت صوفے پر پاؤں سمیٹے ابھی ابھی سوئی تھی۔ قالین پر مالک اپنے نئے سلیپنگ سوٹ پر تے کے دھبوں کے ساتھ جانے کب کا سو چکا تھا۔

دار نے عورت کو جگایا۔ وہ اوں، ہوں کر کے پھر سو گئی۔

"چلو۔" لڑکے نے نیند سے بھری ہوئی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ اور عورت کو جھنجوڑا۔

"یہ جا تو ای میں سووں گی۔ ہر وقت چلو چلو۔" عورت نیند میں بڑبڑائی اور دھک سے صوفے پر سیدھی پڑ گئی۔

"اٹھیے اب جائیے یہاں سے" دارا نے سخت لہجے میں کہا۔

عورت اٹھ کر بیٹھ گئی اور گہری نیند سے ایک جھکورا سا لے کر سنبھلی۔

''سویرے چلی جاؤں گی۔ اس وقت راستے میں پولیس ٹوکے گی۔'' وہ بولی۔ ''مگر یہاں تے آدمیوں کے سونے کی جگہ نہیں۔''

دارا نے رسان سے کہا۔ ''اچھا پیسے لاؤ۔'' عورت نے ہاتھ پھیلا دیا۔

وہ دارا نے ایک بڑا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نعیم ایک قدم بڑھا اور پھر رک گیا۔

''بس ......!'' وہ غنودگی سے چونک کر بولی۔ اس کی لپ اسٹک اتر چکی تھی اور منہ سے شراب کی بو کا بھپکا اٹھ رہا تھا۔

''بس یہ بہت ہے'' دارا نے سخت آواز میں کہا۔ اس کا جی چاہا یہ بھی کہہ دے کہ تم منڈی کا مال ہو۔ مگر وہ یہ نہ کہہ سکا۔ وہ اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

''خیر جی!'' عورت نے نوٹ قمیص کے گریبان میں اڑس لیا اور برقع اوڑھنے لگی۔ اس وقت تک اس کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ اور بڑی ادا سے ہونٹ کھول کر منہ جھکائے برقع کے بٹن بند کر رہی تھی۔

''یہ سیٹ اتار دو۔'' دارا نے نعیم کے منمنانے پر جاتی ہوئی عورت سے کہا۔

''واہ مجھ پر نہیں اچھا لگتا؟'' عورت نے ٹھٹک کر پوچھا۔ اور پھر ایک تنی ہوئی جمائی لی اور بڑے ناز سے دارا کی طرف دیکھا۔

''دیکھئے یہ آپ دے دیجئے۔ معمولی نقلی نگوں کا سیٹ ہے صرف پچیس روپے کا'' نعیم نے باقاعدہ درخواست کی۔

''میں تو نہیں دوں گی۔ دیکھو مجھ پر یہ اچھا نہیں لگتا؟'' عورت نے سر کی حرکت سے بندے ہلائے اور ہنس پڑی۔ دارا دروازے پر جانے کے لیے بے چین کھڑا تھا۔ نعیم کا منہ اتر گیا۔

''جانے دو یار انہیں پسند آ گیا ہے۔'' دارا نے قصہ ختم کرنے کو کہا۔ اسے نعیم کی یہ سب بچگی پسند نہ آئی۔ بھلا معمولی سی چیز کے پیچھے اتنی بحث کی کیا ضرورت۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ فوراً سونا چاہتا تھا۔

''کچھ انعام بھی تو ملنا چاہیے۔'' عورت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور جانے کو مڑی۔ اس لمحے نعیم نے بے تابی کے ساتھ دارا کا سرد ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

''میرا سیٹ مجھے واپس کرا دو۔'' نعیم نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''جی آپ نے کہا نہیں تھا کہ میری گردن بڑی خوبصورت ہے۔ میرے گلے پر کھلتا کتنا ہے یہ ہار؟'' عورت ایڑیوں پر گھوم کر ان کی طرف مڑی اور ٹھنک کر بولی دارا کو اس کی یہ ادا بھائی۔ مگر نعیم کی آنکھیں بھیگی رہیں۔

''آپ دو منٹ بیٹھ جائیے۔'' نعیم نے اس کے قریب جا کر جھکتے ہوئے کہا۔

"جاؤ کے تو تانگے میں بیٹھ میں بھی آ گئی۔" عورت نے کہا اور واپس آ کر نعیم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر نعیم نے کانپ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ دارا کو یہ سارا منظر بے حد برا لگا۔ وہ ان عورتوں میں اپنے گھر کو بیٹھوں کا گھر مشہور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ الجھن میں اس نے سگار اٹھا کر سلگا لیا۔

میرا یہ سیٹ واپس کر دیجئے۔ نعیم نے اسی قطعی انداز میں عورت سے کہا۔

"کیوں جی آپ پہنیں گے؟ صورت پر کھلے گا بہت!" عورت نے ہنس کر جواب دیا اور نعیم کا ہاتھ پکڑنے لگی۔

"اس کے بدلے آپ سو روپے لیں۔" نعیم نے ہانپ کر کہا۔

"پھر تو یہ ہزار کا ضروری ہوگا۔ عورت نے پر مسرت انداز سے آنکھیں پھاڑیں۔

"یہ رسید دیکھ لیجئے۔ یہ صرف پچیس روپے کا ہے۔" نعیم نے جیب سے رسید نکال کر اس کے سامنے کر دی تو دارا نے بھی آگے بڑھ کر 25 کا ہندسہ پڑھا۔

"پھر تو آپ کے 75 روپے کا نقصان ہو گا جی۔" عورت اٹھلا کر بولی اور ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگی۔ "آپ کو مجھ پر اچھا نہیں لگتا یہ سیٹ؟"

"جانے دو نعیم معمولی بات ہے۔ حماقت نہ کرو۔" دارا نے سخت بیزاری سے تنگ آ کر کہا۔

"مگر یہ میں نے اپنی بیوی کے لیے خریدا ہے۔" نعیم عورت کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔ "یہ عورت اسے نہیں پہن سکتی۔"

عورت صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نہیں پہن سکتی... کیوں؟" عورت اپنے سارے انداز بھول گئی۔ اور اس کے بعد اچانک کمرے سے شائستگی رخصت ہو گئی۔ عورت نے بیوی کی پوزیشن پر بے حد فحش انداز سے بکنا شروع کر دیا۔

دارا گر دار بیچ میں نہ آ جاتا تو وہ عورت نعیم کے ہاتھوں بری طرح پٹ جاتی۔ "دیکھئے یہ اتار دیجئے۔ ... روپے لے لیجئے" دارا نے عورت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تھپکا۔ "یہ بیوی کا معاملہ ہے اور پھر میں اپنے گھر میں چیخ پکار پسند نہیں کرتا۔"

عورت غصہ بھری نظروں سے نعیم کو گھورتی رہی اور پھر ایک دم اس کے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے اس نے اپنے ہاتھ سے زیور گلے میں ٹٹولا۔ دونوں کو باری باری دیکھا اور پھر زیور گلے سے اتار دیا۔

دوسرے لمحے وہ جانے کو قدم بڑھانے لگی تو دارا نے زیور کے معاوضے کا نوٹ بڑھایا۔ عورت نے نوٹ کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے کھٹ پٹ کرتی برآمدے میں غائب ہو گئی۔

منہ زور گھوڑے کی ٹاپیں اور گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو پہلے قریب ہوئے اور پھر دور ہوتے گئے۔

نعیم نے نقلی زیور کے سیٹ کو دوبارہ احتیاط سے ڈبے میں رکھا اور کاغذ لپیٹ کر دھاگہ باندھ دیا۔

پھر وہ دونوں صوفہ سرکا کر قالین پر سونے کے لیے لیٹے تو دارا نے نعیم کی طرف کروٹ بدل کر کہا۔ ”میرا خیال ہے اسے بُرا لگا۔ اس نے تمہارا نوٹ بھی نہ لیا۔“

ور جواب میں نعیم سسکیاں لینے لگا۔ ”میری بیوی کا ہار اس نے پہنا..... اس عورت نے ...... وہ بڑبڑایا۔ نیند اور خمار میں سسکتا ہوا نعیم دارا کو بڑا پیارا نظر آیا۔

چند لمحے بعد وہ سو گیا۔ صبح سویرے سے اپنے گھر جانا تھا۔

دارا نے سگار دانتوں تلے سے نکال کر ایش ٹرے میں رکھ دیا اور روشنی گل کر کے اندھیرے میں لیٹ گیا۔ اب چاندنی پیپل کے درخت کی پھننگوں میں چمک رہی تھی۔ لمبی سڑک پر تانگے کے گھنگھروؤں اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں ابھی تک سنی جا سکتی تھیں۔ مگر دارا نے اس پر غور نہیں کیا۔ وہ تو غور کر رہا تھا اپنے باس کی لڑکی کی بیوی بنانے کے امکانات پر !

◆◆◆

مول تول

میرے ہاتھ میں منشی فاضل کے کورس کی کتابیں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے ناک تھوک کے بلبلوں سے بچائے ہوئے غرارے کے پائنچے سامنے سے بس آ رہی تھی جو مجھے "پنجاب سے امتحان پاس کرنے کا رزلٹ دینے والے کالج" تک پہنچا سکتی تھی۔ بندر روڈ کا ٹریفک اور پھر شام کا وقت' میں اندھادھند بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے سڑک پار کرنے لگی اور اسی وقت کسی نے میرے دوپٹے کا پلو پیچھے سے کھینچا ۔ جب سے یہ منشی فاضل کے پاس کرنے کا سلسلہ ہوا تھا اور مجھے گھر سے اکیلے آنے جانے کی اجازت مجبوراً دے دی گئی تھی تو ایسے واقعات سے کئی بار دوچار ہونا پڑا تھا۔ میرے بھائی جان نے کئی بار مجھے سمجھایا تھا کہ کراچی میں ماشاءاللہ ایک سے ایک نازک مزاج اور قدامت پسند غنڈہ موجود بن کر پہنچ گیا ہے اس لیے حتی الامکان ایسی حرکتوں پر صبر کر کے اپنی راہ لگ لیا کرو ورنہ اغوا ہونے سے لے کر چھری تک کھانے کے امکانات موجود ہیں۔ مگر میں جواب نہایت فرانسیسی زنانہ رسائل سے رٹے ہوئے عورتوں کی آزادی وغیرہ کے مسائل پر بحث کر سکتی تھی' تو یوں ہی کیسے چپ رہ جاتی؟

دوپٹہ کھینچے جانے پر میں نے پلٹتے پلٹتے زور سے گالی دی۔ "الو" اور جب دیدے نکال کر غصے سے ادھر ادھر دیکھا تو وہ کوئی بدمعاش الو نہیں بلکہ گلو میاں تھے۔

"ارے ہائے گلو میاں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ اور ہم دونوں ایک تیز رفتار ٹرام کی زد سے بچ کر اور ایک بڑی سی امریکی کار سے کنی کترا کر سڑک پار کر گئے۔

ظاہر ہے میری بس جا چکی تھی۔ گلو میاں حیرت سے گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ذرا لطف آیا۔ میں سمجھ گئی کہ میرے اچھے کپڑے لاپروائی سے سر پر پڑا ہوا دوپٹہ اور بے نقاب چہرہ گلو میاں کو مرعوب کر چکا تھا۔ میں نے بڑے وقار سے اپنی کتابیں پہلو میں سنبھالیں۔

"آپ تو بالکل بدل گئیں۔ کراچی آ کر تو آپا۔" گلو میاں نے ذرا گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔ مگر تم بالکل نہیں بدلے!" میں نے ذرا حقارت آمیز بے پروائی سے جواب دیا۔ دراصل مجھے اس وقت گلو میاں

کے منہ سے "آپا" کا تخاطب سن کر تکلیف سی ہوئی۔ لکھنؤ میں وہ لڑکا ساتھ۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ مگر اب پورا مرد۔ دور میں نے بھی منشی فاضل کے امتحان کے لیے فارم پر کرتے ہوئے اپنی عمر صرف سولہ سال کی لکھی تھی۔ پرانے واقف جب کسی نئے ماحول میں ملتے ہیں تو وہ تکلیف دہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا احساس اس لمحے مجھے شدت سے ہوا۔

میں نے دور تک بندر روڈ پر نظر دوڑائی کہ کوئی بس آ رہی ہے یا نہیں۔

"آپ تو اسکول جانے لگیں نجو آپا۔" گلو میاں نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں کالج جاتی ہوں۔" میں نے کالج پر زور دیا۔ اور پھر بس کو آتا دیکھ کر مجھے ایک دم گلو میاں پر رحم آ گیا۔ وہ میرے بے کس قدر اشتیاق سے سوال کر رہا تھا اور میں نے اب تک اس کا حال چال تک نہیں پوچھا۔

"کب آئے اور سب کہاں ہیں؟" میں نے جلدی سے سوال کیا۔

"ارے تو آپ کو لکھنؤ سے خبر نہیں ملی۔ میں تو اماں اور بجیا کو لے کر چھ مہینے سے پاکستان آیا ہوا ہوں۔ وہاں بھائی جان سے تو آپ کو معلوم ہے کہ ہماری۔ ۔ ۔ "گلو میاں تفصیل میں جانے لگے اور بس قریب آ رہی تھی۔

"ہائے اللہ! بس آ گئی۔ تم ہمارے ہاں ضرور آنا گلو میاں۔ پتہ لکھ لو۔ اچھا ٹھہرو میں دیتی ہوں پتہ۔ ...." میں نے جلدی سے ایک کتاب کھولی۔ کیونکہ مجھے یاد آیا کہ میرے پتے کا ایک عید کارڈ صفحات میں نشانی کے طور پر استعمال ہو رہا تھا

"یہ لو۔ اس پر گھر کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ ... آنا ضرور . . . اچھا۔ . میں نے کہا اور کارڈ گلو میاں کو تھما کر جلدی سے بس میں سوار ہو گئی۔

بس چل پڑی تو مجھے خیال آیا کہ میں نے یہ معلوم کیے بغیر گلو میاں کو اپنے گھر کا پتہ دے دیا ہے کہ ان کے پاس رہنے کا ٹھکانہ ہے یا نہیں۔ دو ایک بار ایسا ہو چکا تھا کہ تین کمروں کے ہمارے فلیٹ میں اسی طرح کئی کئی ماہ کے لیے پاکستان ہجرت کرنے والے عزیز رشتے دار آ کر مہمان رہ چکے تھے۔ ان میں سے ایک تو ہمارا آدھا فلیٹ اپنے نام الاٹ کرانے کی اسکیم بھی بنا چکی تھی.... . . اس کے بعد اماں کا حکم تھا کہ اب ایسی مروت بند۔ نئے ملک میں پرانے قاعدے برت کر کوئی خود بے گھر ہوتا ہے۔ میں ڈری۔ لیکن پھر سوچا کہ گلو میاں چھ مہینے سے یہیں کہیں ہوں گے کہ سڑک پر تو نہ بیٹھے ہوں گے۔ بہرحال اماں کے خیال سے مجھے الجھن سی ہو گئی۔

میں نے گھر پہنچ کر گلو میاں کے ذکر کے ساتھ دبی زبان سے اپنی پتہ دینے والی حماقت کا بھی ذکر کر دیا۔

مگر ہمارے سب خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے گلو میاں ہمارے گھر پہنچے ہی نہیں اور مجھے نامعلوم سا دکھ ہوا۔

گو میں دور کے رشتے سے میرے بھائی ہوتے تھے مجھے یاد ہے کہ جب ان کے ابا ایاز خان زندہ تھے تو ان لوگوں کی بھی خاصی گزر بسر ہوتی تھی۔ ایاز خان تھے تو معمولی سے سرکاری ملازم مگر ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا کہ خاصے خوشحال لوگ ہیں۔ ان کے مرنے سے چند سال پہلے جب دوسری جنگ عظیم چھڑی اور پٹرول کی قلت ہوئی تو انہوں نے کہیں سے ایک پرانی موٹر بھی سستے داموں خرید ڈالی۔ یہ موٹر ایاز خان کی پرانی "بائی" کشادہ ڈیوڑھی میں کھڑی پٹرول کی قلت کا رونا روتی نظر آتی۔ ایاز خاں اسی طرح اپنی پرانی سائیکل پر دفتر آتے جاتے۔ کبھی کبھار جب وہ اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جاتے تب یہ موٹر ضرور استعمال ہوتی۔ اور نتیجے میں خاندان والوں پر سخت رعب پڑتا۔ ویسے تو خاندان میں سب ہی ان سے جلتے لیکن ان سے ملے بغیر بھی کسی کو قرار نہ آتا۔ ایاز خان کے بڑے لڑکے شہباز خان جب بی۔ اے پاس کیا تو رشتے داروں کو گھر گھر اس پورے خاندان کی دعوتیں ہوئیں۔ اخر تو ہر گھر میں کنواری لڑکیاں اچھے لڑکوں کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی سوکھی ماری امیوں کی طرح زرد ہو رہی تھیں اور شہباز بی۔ اے پاس کنوارا تھا۔ ویسے شہباز کے ساتھ میرے بھائی جان نے بھی بی۔ اے اسی سال پاس کیا تھا۔ مگر ان کی پوچھ کہیں نہ ہوئی۔ میری اماں نے اپنی سونے کی انگوٹھی رہن رکھ کر شہباز کو مع اس کے گھر والوں کے مدعو کیا۔۔ وہ لوگ موٹر میں بیٹھ کر ہمارے ٹوٹے پھوٹے گھر میں آئے۔ .... مجھے یاد ہے تمام دن سل پر مرچ مصالحے رگڑتے رگڑتے میرے ہاتھ سرخ ہو کر سوج گئے تھے اور میں پانی کے کٹورے میں ہاتھ ڈالے شام تک کوٹھری میں بیٹھی یہی سوچتی رہی تھی کہ آج کیا ہوگا۔ جب شہباز (جنہیں سب شبو میاں کہتے) اپنے ابا اماں اور بھائی بہن کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تو میں نے کوٹھری میں کواڑ کی اوٹ سے انہیں کئی بار دیکھا تھا۔ شہباز کا معصوم سا سانولا چہرہ اور سیدھے سیدھے بال مجھے کتنے عجیب لگے تھے۔

ماں نے مجھے آواز دے کر بلایا تھا کہ آؤ شہرو تم بھی سب کے ساتھ آ کر کھانا کھاؤ۔ اس دن اماں بے حد آزاد خیال ہو گئی تھیں۔ کیونکہ شہباز کے ابا ایاز خان ظاہر ہے کہ آزاد خیال تھے۔ جبھی تو ان کی بیٹی زہرہ مسلم اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اور جو اس دن ہمارے سب کے ساتھ بیٹھی چمچے سے پلاؤ کھا رہی تھی۔ جی ہاں چمچے سے! وہ چمچے جو ہم نے خاص طور سے اس دعوت کے لیے پڑوس سے ادھار مانگ لیے تھے۔

اس رات بہت دیر تک اماں چارپائی پر بیٹھی چپکے چپکے بھائی جان سے باتیں کرتی رہیں۔ باتیں کیا بس یہی کہ بنو کے لیے شبو میاں اور میرے بھائی جان کے لیے زہرہ۔ جوڑ خوب رہیں گے

حالانکہ بعد میں سنا کہ شبو میاں کا رشتہ پہلے ہی ایاز خان اپنے ایک وازنی والے افسر کی بیٹی سے طے کر چکے ہیں۔

آخر تو ایاز خان رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے وہ جانتے تھے کہ کیا چیز کہاں سجے گی اور موٹر میں پٹرول نہ ہو تو چھکڑا اور موٹر برابر ہے۔ چالاک دکاندار بھاؤ تاؤ کرنے کے بجائے اپنی چیزوں کو سجا کر رکھتا ہے۔ اور ان پر قیمت کا کارڈ لگا دیتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی آبائی ڈیوڑھی پر موٹر کا جھومر سجایا اور گویا اپنے بچوں کے مستقبل کی قیمت لگا دی۔ مگر جب ایاز خان اچانک حرکت قلب بند ہونے سے چل بسے تو اس ایک چنگاری سے ساری رونق سلف ہو گئی۔ پرانی موٹر دوسرے ہی دن استاد صدیق کی گیراج میں پڑ کر گاہک ملنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہی نہیں کہ بات یہاں ختم ہو جاتی۔ استاد صدیق نے ڈیوڑھی پر آ کر بھرے رشتے داروں میں اندر کہلوایا۔

"بہن! خان صاحب تو دکی وں ہی میں لے گئے شبو میاں تو ماشاءاللہ بی۔ اے پاس ہیں لیکن گل میاں بے چارے اب کس کے سہارے پڑھیں گے۔ ابھی ان کا لڑکپن ہے۔ میری گیرج میں آ لیں جا ئیں گے تو انشاءاللہ ہنر سکھا دوں گا۔"

مگر استاد صدیق کی یہ مخلصانہ پیش کش گلو میاں کی اماں کے دل پر چوٹ دے گئی۔ یا تو عورتوں میں گھری روری تھیں یا کڑک کر بولیں۔

"اے کیا کمی ہے گھر میں؟ . اللہ رکھے میرا گل بی۔ دے چھوڑ ایم۔ اے پاس کرے گا۔ ولایت جائے گا۔ صدیق سے کہا بیگم کہتی ہیں تم تو بس موٹر بکوا دو۔ یہ ان کی یادگار مجھے دلاتی ہے۔ اللہ میرے بیٹوں کو عمر دراز کرے وہ نئی موٹر لے لیں گے۔

یہ تڑک بھڑک دیکھ کر دو ہر دو سب مرعوب ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود جب تم ہم لوگ لکھنؤ رہے ہم نے ان کی ڈیوڑھی سونی ہی دیکھی۔

شبو میاں اپنے سسر کے زور پر جلدی ترقی کے وعدے پر کلرک لگ گئے۔ گل میاں نے لڑھکا کر میٹرک پاس کر لیا۔ اور ان کی بہن زہرہ تو اپنے ابا کی زندگی میں ہی میٹرک تھرڈ ڈویژن میں پاس کر چکی تھی۔ وہ بقول بڑی اماں "اب ماشاءاللہ گھرداری سیکھ رہی تھی گھر بیٹھی۔"

اس زمانے میں ہم لوگ ان کے گھر زیادہ جاتے کیونکہ شبو میاں کی دلہن جہاں بچے پیدا کرنے میں تیز تھیں وہیں گھر کا بھانڈا پھوڑنے میں بھی طرار ... وہ ہمیشہ ہر آنے جانے والے سے یہ شکایت کرتی رہتیں کہ "ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی" ... ان کے گھر آنے دن داستان کُل رہتی اور رشتے داروں کو لطف آتا . گلو میاں کی اماں جواب بھی نہایت نفاست سے اس رکھ رکھاؤ کی نقاب میں بنیل بوٹے کاڑھا کرتیں۔ وہ دم کے دم میں کھسوٹ کر پھینک دی جاتی۔ زہرہ کونوں میں سر جھکائے خاموش بیٹھی گھرداری سیکھتی رہتی۔ اور گلو میاں بے کار پڑے پڑے چارپائی پر کروٹیں بدلا کرتے۔ یا پھر ہم جیسے رشتہ داروں سے نہایت

خلوص کے ساتھ اپنے گھریلو مسائل پر بات کرتے۔

پھر دلی میں فساد ہو گیا۔ اور ہم لوگ پاکستان چلے آئے۔ بھائی جان کالج میں لیکچرر ہو گئے اور ہم جیسے پچھلی تکلیفوں کو بھول گئے۔ مجھے وہ شبو میاں کبھی یاد نہ آئے جنھوں نے دعوت ہمارے ہاں کھائی تھی اور شادی کہیں اور کی تھی، جنھیں میں نے کواڑ کی اوٹ سے بڑے ارمانوں کے ساتھ جھانکا تھا۔ اور تصور ہی تصور میں میں نے جن کے بچے کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ ... اب تو یہی بات عجیب سی معلوم ہوئی کہ بچوں کو دودھ پلایا جائے.... ہمارے فلیٹ کے اڑوس پڑوس کی کئی عورتیں بچوں کو بوتل کے دودھ پر کیا مزے سے پال رہی تھیں آخر..... مجھے اپنے ماحول اور ذہنی تبدیلیوں کے احساس سے جو خوشی ہوتی تھی۔ وہ پرانے جاننے والوں اور رشتہ داروں سے مل کر اور بھی چمک جاتی۔

پھر اگر گلو میاں کے نہ آنے سے مجھے دکھ سا ہو تو عجیب بات نہ تھی۔

ایک دن میں اور بھائی جان کہیں جانے کے لیے گھر سے نکلے تو گلو میاں کو بندر روڈ پر منہ اٹھائے جاتے پکڑ لیا۔

"ارے گلو میاں! اِدھر آئے کیوں نہیں ہم نے انتظار کیا تمہارا۔" میں نے کہا۔

"فرصت نہ ہوئی۔ پھر سوچا جانے آپ کو بھی فرصت ہوگی یا نہیں۔" گلو میاں کے چہرے پر شکایت بڑی معصوم معلوم ہوئی۔

"ارے واہ جیسے غیر ہو تم تو" میں نے خفگی جتانی چاہی۔

واقعی اس پچھلی ملاقات پر میں بے حد اپنے خول میں رہی تھی۔ اور گلو میاں اب شاید سمجھنے لگے تھے ایسی باتوں کو۔

بہرحال بھائی جان نے ان کی اماں اور بہن وغیرہ کو پوچھ کر گلو میاں کے خلوص کو دوبارہ جیت لیا۔ معلوم ہوا کہ نئی نمائش والے میدان میں جھونپڑی ڈالے پڑے ہیں اور باقی سب خیریت ہے۔ بھائی جان نے روزگار کا پوچھا تو چہک کر بولے۔ "اماں منٹ میں انسپکٹر ہو گیا ہوں۔"

ان کا یوں عام فہم انداز میں کہنا لطف دے گیا۔ پھر ہم لوگ انھیں اپنے فلیٹ پر لے آئے اماں ہمیشہ کی طرح لکھنؤ والوں کو دیکھ کر وطن کی یاد میں رونے لگیں۔ اور گلو میاں ایسی محبت سے ان کے گلے لگ کر ساتھ روئے کہ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ حالانکہ مجھے لکھنؤ کبھی یوں یاد نہ آیا کہ رو سکوں۔

ایک پیالی چائے کے بعد گلو میاں نے وعدہ کیا کہ وہ ہم لوگوں کو آئندہ اتوار اپنے ہاں لے جائیں گے۔ سو ہم لوگ اپنی نئی زندگی اپنے اوپر جیسے اوڑھ کر وہاں گئے اور گلو میاں یوں اپنے ٹھکانے پر لے گئے جیسے بڑی قیمتی چیزیں ہوں ہم سب۔ ایک خاصے

بڑے قطع زمین کو کھجوری چٹائیوں سے گھیر کر انہیں چٹائیوں اور ٹین کی چادروں سے دو کمرے، باورچی خانہ غسل خانہ اور پاخانہ بنایا گیا تھا ... باہر بڑی شان سے گلومیوں کے پورے نام اور عہدے کی تختی لگی ہوئی تھی۔

ن کی اماں بے چاری کو زمانے نے بہت جھکا دیا تھا۔ اس کے باوجود ان کے کپڑے صاف تھے۔ اور گھر کی ہر چیز سے سلیقہ شائستگی ٹپکتی تھی۔ گلومی زہرہ پہلے کی نسبت زیادہ دبلی اور زرد ہو گئی تھی۔ مگر اس نے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کے ثبوت میں دو چوڑیاں خوب کس کر گوندھ رکھی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرا اور بھی دبلا اور زرد لگ رہا تھا.... جب ہم لوگ دھلی ہوئی دری اور سفید براق چاندنی پر آلتی پالتی مار کر پرانی چینی کے خوبصورت سیٹ میں چائے پینے بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ زہرہ پکوڑوں پر چٹنی ڈال کر بڑی نفاست سے چمچے کے ساتھ پکوڑے کھا رہی تھی۔ ن کی اماں کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ اور بار بار جتا رہی تھیں کہ یہاں جھونپڑیوں میں بڑے امیر لوگ رہتے ہیں۔ مگر ہم لوگ پھر بھی ان سے ہمدردی کرنے سے نہ چوکے . . انہیں دیکھ کر بار بار ان کے میاں کے زمانے کی کئی باتیں دل پر اچھل اچھل کر جو لگتی تھیں۔ شاید اگر وہ اپنا کفر روتیں تو ہمارا یہ رد عمل نہ ہوتا۔ مگر وہ صاف پہلو بچا جاتیں۔ لیکن گلومیاں اتنے سیدھے تھے کہ ہماری ساری کمینی ہمدردیاں دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے رہے۔

"اے ہے کیا وقت پڑا ہے آپ پر ... وہ لکھنؤ کا زمانہ یاد آتا ہے۔" ہماری اماں یک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"ہاں۔ گر گلومیوں کو خدا سلامت رکھے ان کے افسر جو ہیں وہ ان کے ابا کے ہاتھ تلے کام کر چکے ہیں۔ بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ بڑی عزت ہے۔ پھر صرف گلومیاں کی تنخواہ ہی تو نہیں ہے ماشاء اللہ سے جان صاحب کے وقتوں کی کمائی بھی چلتے چلتے چلے گی

"گلومیاں کی اماں اپنے سونے کے "جھمکے کرن پھول" سر کے جھٹکے سے جھلا کر بڑی پر اسرار مسکراہٹ سے بولیں۔

"مگر اماں یہ آپ کے چند زیور تو بچا کے رکھے ہیں . . . میں تو کہتا ہوں انسان اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھے بس . .... اب دیکھیے ہم جو کراچی آئے تو شبیر ندوی کی شبو بھائی کہتے تھے کہ ارے بھائی اکڑ فوں میں کراچی چلے ہو وہاں تو اللہ لٹتے پاؤں آؤ گے مگر دیکھئے جس اللہ نے منہ چیرا ہے وہ کھانے کو بھی دیتا ہے نیت چاہیے نیک شبو بھائی کی طرح تھوڑی کہ ..... "گلومیاں کہتے کہتے رک گئے۔ کیونکہ ان کی اماں گھر کے راز فشا ہوتے دیکھ کر انہیں گھور رہی تھیں۔

"زہرہ تم بھی نوکری کر لو کسی پرائیویٹ اسکول میں۔ تعلیم کس کام آئے گی؟" بھائی جان نے زہرہ کی طرف دیکھے بغیر مشورہ دیا۔

"زہرہ کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اور گلومیاں مشین گن کی طرح تڑتڑانے لگے۔

"کیوں جب تک میں زندہ ہوں اس کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بانے انہیں اس خیال سے تھوڑی پڑھایا تھا کہ

نوکریاں کریں "گلومیاں کا چہرہ درد سے جوش کے گہرا سانولا ہو گیا اور ہونٹ کانپنے لگے گویا بھائی جان نے انہیں گالی دے دی ہو۔ بھائی جان نے کالی کی اور بتایا کہ وہ ذاتی طور پر عورتوں کی اقتصادی آزادی کس قدر قائل ہیں۔ مگر گلومیاں اڑے رہے۔

"جناب ہم چٹنی روٹی کھاتے ہیں آخر مہینے میں۔ مگر بیبیاں بھلا نوکری کیوں کریں" گلومیاں کہے گئے اور ان کی ماں کا چہرہ ستے گیا۔ وہ بے بسی سے گلومیاں کی طرف دیکھتی رہیں جو ان سے اور ہم سب سے الگ تھے جیسے نازک کانچ کے درمیان پرانے دکنی پہاڑوں سے نکلا ہوا پتھر کا ایک سیاہ ٹکڑا۔ ٹھوس مضبوط اور نہ بدلنے والا۔

دل کے ایک گوشے میں گلومیاں مجھے کچھ برے سے لگے۔

گلومیاں جو بچے تھے۔ وہ چھوٹے ہی تھے کہ ان کے ابا چل بسے۔ وہ رکھ رکھاؤ۔ وہ دوسروں سے چھپ کر تکلیف اٹھانا انہوں نے سیکھا تھا ...... جب انہیں سمجھ آئی تو کھانے کی میز ستھرے میز پوش سے سجی رہتی۔ گلدانوں میں نیم کی ٹہنیاں ذرہ روز بدلی لیکن کرسیوں پر شبو میاں کی دلہن ضد میں اپنے ننھے کے پوتڑے ڈال کر ضرور رکھتی تھیں اور سب باورچی خانے میں گھس کر تنی ہوئی چپاتیاں برائے نام بگھاری ہوئی دال اور پودینے کی چٹنی سے چھوچھو کرا کر دو بیٹھ کر کھا لیتے۔ ان کی اماں جان جل کر بہو کو ستانے کو کہا کرتیں ..... کہ ارے بس بیٹھیں کھاؤ بیٹھ کر کون سے پلاؤ قورمے کھاتا ہیں جو میز کرسی پر بیٹھا جائے ...... خواہ مخواہ میز پوش میلا کرنے سے کیا حاصل......؟

لیکن جب گھر میں کوئی رشتہ دار آ جاتا تو رہبری کھچڑی کی چٹنی کی قاب میں سجائی جاتی اور میز پر رکھ کر کھائی جاتی اور آنے والے پر بار بار یہ جتایا جاتا کہ واہ رہبری کھچڑی جب تک ہفتے میں ایک بار نہ کھائی جائے زندگی کا لطف ہی کیا۔ مگر یہ دور رفتہ پن گلومیاں پر سے اوپر ہی اوپر نکل گیا۔ انہیں تو معلوم تھا کہ شبو بھائی کی تنخواہ تھوڑی سی ہے اور ان کے ہاں بچے ہر سال ہوتے ہیں۔ بو بھی ہمیشہ قسمت کو روتی ہیں اماں ور بہن جو اندھیری کوٹھریوں میں چھپ چھپ کر روتی ہیں تو یوں ہی تقریباً نہیں وہ انہیں حقیقتوں کے پروردہ تھے۔ ان کی یہ سادگی یہ کھرا پن مجھے یوں ہی سا بھلا معلوم ہوتا۔ ویسے بھی وہ مجھ سے اس قدر مرعوب رہتے کہ ان کے سامنے مجھے اپنی شخصیت کی تکمیل ہوتی محسوس ہوتی ...... جب وہ تو ہمارے ہاں آتے تو اور سب چاہے بور ہو کر الگ جا بیٹھیں مگر میں ان سے گپ شپ میں لگی رہتی۔ اماں نے کئی بار کہا کہ "دیکھو گلومیاں کو تنا منہ لگاؤ۔ کل کہیں یہ نہ چاہیں کہ تمہارا بھائی ان کی بہن کو سیٹ کرے۔ نہ بھئی ماشاء اللہ تمہارا بھائی پروفیسر ہے اچھی سے اچھی دولت مند لڑکی مل جائے گی اسے۔"

ماں کے اس زاویہ نظر پر میں چڑ جاتی اور گلومیاں کے گھرانے کی حمایت کرنے لگتی۔ اور فوراً شبو میاں کی دعوت والا طعنہ دیتی۔

ایک دفعہ اس بات پر مجھے چپکے ہنسی۔ لیکن جب میں ٹھنڈی پڑ کر سوچتی کہ آخر گلو میاں کی آمد پر میں اپنا اتنا وقت کیوں ضائع کرتی ہوں، اس کی بجائے بیٹھ کر منشی فاضل کا کورس کیوں نہیں رٹتی؟ تو بات وہی شخصیت کی تکمیل والی نکلتی۔ گلو میاں سے بڑے اعتماد کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث کر کے اور نہیں قائل کر کے مجھے ایک عجیب سی تسکین ہوتی۔ جیسے میں بہت اونچی ہوں، بہت ہی اونچی ہوں، بہت ہی اونچی۔۔۔ وہ میری باتیں اتنی عقیدت سے سنتے کہ مجھے نشہ سا محسوس ہوتا۔ بھائی جان تو مجھے جاہل ہی کہتے اور میرا نوٹس تک نہ لیتے۔ رہیں اماں تو ان کے دلائل کے سامنے میری خاک نہ چلتی۔ مگر گلو میاں مجھے دنیا جہان کا فاضل سمجھتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں میرا مشورہ لیتے، حتیٰ کہ اپنے دفتر کی چھوٹی موٹی رقابتوں اور جھگڑوں تک میں میری اوٹ پٹانگ رائے پر عمل کرتے اور مجھے یوں معلوم ہوتا کہ جیسے میں سادگی کے نقوش بھرے سمندر میں منارۂ نور بن کر ستارہ ہوں۔

لیکن اس دن مجھے محسوس ہوا کہ میری روشنیاں بجھ گئی ہیں اور وہ حقیر کالے دبلے پتلے سے گلو میاں جنہیں ہم آپس میں تحیر اہم ثابت کرنے کے لیے محض گلو کے نام سے یاد کرتے تھے) جیسے اپنی کمزور ٹانگوں پر لڑکھڑا کر ایک دم میرے حواس پر تن کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ میری گفتگو کے سوتے ایک دم خشک ہو گئے۔

"آپ ... گلو میاں ..." میں نے منشی فاضل کے کورس کی دیوار کا سہارا لے کر بمشکل آواز نکالی۔ میں نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر انہیں دیکھا۔ وہ گلو میاں ہیں یا کوئی اور مگر یہ وہی تھے وہی سرمئی سرج کی شیروانی جسے لکھنؤ میں شبو میاں پہنا کرتے تھے اور جواب آخری دموں پر تھی۔ وہی دبلا پتلا گہرا سانولا لڑکا جس کی کھال تلے زردی بڑی صفائی سے جھلک مارتی (جسے دیکھ کر کئی بار مجھے مینڈک کا خیال آتا تھا) خوک گھنگھریالے بال، جن میں شاید ہی کبھی تیل ڈالا جاتا تھا۔ وہ اسی طرح میری پرانی بے ڈھنگی میز کی دوسری طرف منشی فاضل کے نصاب کی دیوار کے پیچھے بیٹھے تھے۔ یعنی گلو میاں! بڑے مطمئن بڑے نازاں بڑے پر اعتماد...... مجھے یوں لگا کہ جیسے میری گود سے کوئی ننھا سا بچہ اتر کر فلیٹ کی سیڑھیاں طے کر کے سڑک پر جیسے نکل گیا ہو۔

بڑی دیر کی بے تکی خاموشی کے بعد میں نے گلے سے کوئی نامعلوم شے اتار کر صرف اتنا کہا۔

"جی ..... گلو میاں۔ آپ؟"

"ارے تو کیا بھوت ہوں آپا دیکھئے نا۔" انہوں نے مجھے انگلی اٹھا کر سمجھایا۔ "اپنی قوت بازو پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

میں ان کے اعتماد سے جل گئی۔ میرا جی چاہا کہ انہیں اٹھا کر پٹخ دوں مجھے خیال آیا گلو میاں اب تک جس عقیدت کا اظہار مجھ سے

کرتے تھے وہ محض بناوٹ تھی۔ ورنہ یہ قصے اتنے دن سے چل رہا تھا۔ مجھ سے ذکر تو کرتے۔ میں چپ رہ گئی۔

"دیکھئے نا بجو آپا . وہ بے چاری عورت تھی.. . پھر ایمان سب سے بڑی دولت ہے نا۔ وہ میرے انکار پر بڑی حیران ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے پلائی اور کہنے لگی 'انسپکٹر صاحب آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ ہمارے گھر آیا کرو۔ ' اللہ قسم بجو آپا اس ڈرائنگ روم اتنا بڑا تھا اتنا شاندار تھا جیسے فلموں میں ہوتا ہے نا . " گلو میاں نے مجھے تفصیل سے بتانا شروع کیا جسٹ میں نے بات کاٹی اور جلدی سے اپنی رائے دینا شروع کر دی۔

"مگر دیکھو نا میاں.... . بھئی کیا حماقت تھی۔ جب لاکھوں کے سودے پر پانچ ہزار مل رہے تھے تو چھوڑے کیوں... . . یہ دنیا کا دھندا تو اسی طرح چلتا ہے۔ پھر تمہارے حالات . .... مجھ سے مشورہ تو کیا ہوتا .... . "

"ہوا واللہ کمال ہے! یہ بھی کوئی مشورہ کرنے کی بات تھی۔ یہ تو میں خود بھی جانتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے . ... چھا اب چلوں فاطمہ بائی کے گھر میری دعوت ہے۔ " یہ کہہ کر گلو میاں ایک دم یوں کھلے دروازے کی طرف بڑھے کہ میں نے ان کی بوسیدہ شیروانی کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنی۔

مجھے دکھ ہوا کہ میں نے جلدی میں بات کہہ کر گلو میاں کے سامنے خود کو گرا لیا۔ پھر غصہ بھی تھا۔ گلو میاں کے خلاف غصہ . میں یہ بات کیسے مان لیتی کہ پانچ ہزار روپے گلو میاں کے لیے اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے جو انہیں ایک جائز رپورٹ لکھنے کے صلے میں مل رہے تھے۔ ایک گھٹیا سے انسپکٹر کے بیٹے جس کی بڑی بہن کنواری تھی۔ یقیناً ان پانچ ہزار روپوں کے جہیز پر میری ماں بھی زہرہ کو اپنی بہو بنانے پر رضا مند ہو جاتیں۔ یہ پانچ ہزار روپے کھنکھنا کر میرے سامنے گر رہے تھے۔ جن کی دھار کے پیچھے رنگین ساڑیاں، زیور اور ہزاروں ضروریات منہ کھولے بیٹھیں تھیں۔ اور ان سب سے منہ پھیرے گلو میاں چلے جا رہے تھے۔ وہ گلو میاں جنہیں بڑھتے قد و قامت کے رونے میں کھانے کو گن کر چپاتیاں ملتیں۔ اور کھانے کے بعد جن کا گلاسوں پانی پی کر پیٹ بھرنا خاندان بھر میں مشہور تھا۔ .. مجھے رہ رہ کر دکھ ہو رہا تھا کہ گلو میاں نے کیا حماقت کی۔ کوئی اور ہوتا تو یہ روپے لے لیتا۔ شاید میں بھی . .... مگر نہیں میں تو نہ لیتی.. . . گلو میاں کو ضرور لے لینا چاہیے تھے۔ .. مگر انہیں تو میرے مشورے کی ضرورت نہ رہی۔ بڑے آئے بقراط بن کر۔

مگر رات کو جب میں سوئی تو گلو میاں کے ساتھ جانے کہاں سے خوابوں میں روشنی کا تصور وابستہ ہو گیا۔ ایک بار میں نے دیکھا ان کے گھنے بالوں میں جگنو سے جگمگا رہے ہیں۔ دوسری بار یوں کہ ان کے گرد چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں۔ میں اچھل پڑی۔ میں تو گلو میاں کو

محض گلو بھگتا چاہتی تھی۔ یہ دوستی وغیرہ ان کے حصے میں دیکھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔

اس قصے کے چند روز بعد جو پکی اتوار آئی تو گلو میاں سویرے سویرے موجود بڑے ہولے گھبرائے۔ مگر خلاف معمول منہ نہایت احتیاط سے دھلا ہوا اور بال اچھی طرح جمے ہوئے۔ میں باورچی خانے میں بیٹھی چائے کا "قری گھونٹ حلق سے اتار رہی تھی کہ انہوں نے بڑے بھونڈے پن سے مجھے الگ کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا اور مجھے ان کی آنکھوں میں عجیب چمکاہٹ سی نظر آئی۔ جس سے میرا جی اوب گیا۔ پھر بھی میں اپنے کمرے میں آ گئی وہ واں سے سلام دعا کر کے میرے پیچھے آ گئے۔

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے یک بات بتائی۔ اور وہ کل یہ تھی کہ فاطمہ بی نے ان کی نیکی اور شرافت کو پسند کیا تو کیا۔ اس کی بیٹی شیریں بھی ان سے محبت کرنے لگی ہے۔ شیریں نے انہیں خط لکھا ہے کہ میں تمہیں سے شادی کروں گی۔ ... تم دولت کو کچھ نہیں سمجھتے ورمیری برادری والے دولت مند ہونے کے باوجود مجھ سے صرف دولت حاصل کرنے کے شادی کرنا چاہتے ہیں.... مگر تم

یہ چکنا چپڑا" گیلا گیلا قصہ سن کر مجھے ذرا یقین نہ آیا۔

"تو پھر اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل گئی؟ .. "میں نے جل کر پوچھا۔

"واللہ آپ تو . . وہ . . "گلو میاں نے جیسے چوٹ بچائی۔ اور پھر یک دم ان کا چہرہ گہرا عنابی ہو گیا۔ وہ ایک منٹ رکے بغیر چلے گئے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار انہیں خفا دیکھا تھا۔ مجھے ان پر رحم آ گیا۔ گھر میں سب ان کے یوں آنے اور پھر ایک دم چلے جانے پر ذرا حیران ہوئے میں نے یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ بے وقوف لڑکا کراچی آ کر کس طرح دولت چھپٹ پڑنے کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ بڑے قہقہے پڑے۔

بھائی جان جو نفسیات کے لیکچرار ہیں یک دم سنجیدہ ہو کر بولے۔

"وہ پانچ ہزار والا قصہ بھی بچوں کی نظر میں ہیت حاصل کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے معلوم ہوتا ہے یہ گلو فالتو اوقات میں ابھی تک بچوں کے رسالے پڑھتا ہے جبھی تو نیکی کے اجر کے خواب دیکھتا ہے۔"

پھر بھائی جان ایک دم سخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"منو میرا خیال ہے کہ یہ گلو تمہارے بارے میں سوچتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے منہ لگانا چھوڑ دو .. ایسی باتیں تم سے کرتے

کرنے کا مطلب کیا ہے آخر؟"

"واہ بھائی جان۔ خواہ مخواہ" میں یک دم جھینپ گئی۔ دل میں سوچا۔ شاید... شاید... اور مجھے اس
خیال ہی سے اپنی ہتک کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا اب میں اس الو سے بات بھی نہ کروں گی۔

لیکن مجھے یہ فخر حاصل کرنے کا موقع عرصے تک نہ مل سکا۔ کیونکہ اس دن کے بعد گلو میاں ہمارے ہاں آئے ہی نہیں
.... آئے تو بھی ان کی شادی کے سہرے چھپے ہوئے دعوت نامے

پہلے تو ہم سب سناٹے میں آ گئے۔ اس کے بعد اماں نے بڑے دھیمے لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر صرف اتنا کہا۔ "دنیا میں بھی
میں تو ہر چیز کا مول ہے۔ میرے بچوں کی قسمت بھی کھوٹی ہے۔"

"ہنہ" بھائی جان سگریٹ سلگاتے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے صندوق پر سر جھکا کر سوچنے بیٹھ گئی۔ کہ اس موقع پر
کیا پہنوں؟ آخر بڑے گھر میں دولہا کی بہن بن کر جانا ہے اور پھر الجھن میں میری آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ سارے کپڑے معمولی
تھے۔

ہم سب دولہا کے عزیزوں کی حیثیت سے بارات میں گئے۔ بارات تھی شاندار کہ ہمیں یقین آ گیا کہ گلو کے باپ ضرور کوئی
خزانہ چھوڑ مرے تھے۔

گلو کی اماں خوشی سے جیسے مری جا رہی تھیں۔ انہوں نے اماں کو دیکھ کر ہاتھ پھیلا دیئے۔

"اے بہن! تمہیں مبارک! تمہارے بھتیجے کا کیا جوڑ سے جوڑ ملا ہے۔ ... برا چاہنے والوں کے منہ میں خاک آؤ بہن آ کر
"بری" دیکھو۔ کوئی کسر تو نہیں رہ گئی۔ تم تو ہمارا خون ہو ہمارا بھلا دیکھ کر خوش ہونے والوں میں۔ ..." گلو کی اماں میری ماں کے
گلے سے لگ کر ریکارڈ کی طرح بجنے لگیں۔ اور میری اماں بیچاری کھسیا کر دعائیں دینے لگیں۔ اس کے بعد وہ اسی اپنائیت سے
"بری" کا سامان دیکھنے لگیں کہ اگر واقعی کوئی کسر رہ گئی تو خود ان کی ہتک ہوگی۔ .... اس کام سے فرصت پا کر انہوں جلدی سے
جھونپڑی کے دروازے پر بھائی جان کو بٹھایا اور چار کرنے لگیں۔

"بیٹی جلدی سے گلو میاں کے پاس جاؤ۔ دیکھو شہ بالا تم ہی بنتا۔ تمہارا حق ہے۔" پھر جب اماں ادھر سے پلٹیں تو زرق برق
کپڑوں میں ملبوس زہرہ کو انہوں نے میری بچی کہہ کر گلے سے لگا لیا۔ جیسے بالکل بدحواس ہو گئی ہوں

واقعی یہ بدحواسی کی بات تھی۔ اتنے ٹھاٹ کی "بری" تھی ایسے ایسے کپڑے اور زیور کو میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ ہماری

حیرت و ندامت دیکھ دیکھ کر گلو کی اماں برابر بیٹی جیسی شوہری اور روپیہ بچا بچا کر رکھنے کے تذکرے کرتی رہیں۔ کراچی میں جتنے بھی دور قریب کے عزیز اور شناسا تھے۔ وہ بھی مہمان تھے اور سبھی پانی پانی۔ کئی عورتیں اس بات پر حیران تھیں کہ اب تک ان کی عقل کہاں چرنے چلی گئی تھی جو گلو میاں چلے گئے غیر ذات برادری والوں کے داماد بن کر۔ ارے ان لوگوں نے تو جان کر تو داماد بنایا ہوگا۔ بچ بے مایا کو مایا ملے۔

مگر جب بھائی جان کے ساتھ میں بھی دولہا کی کار میں گھس پڑی اور مرعوب ہو کر گلو میاں کے چہرے کی طرف دیکھا تو دل نے کہا۔ ... ہائے گلو میاں اچھے بھلے تمکین سے تو ہیں۔ ... بچپن میں سب سے بچے جمع ہوتے تو کئی بار میں ان کی جھوٹ موٹ کی دلہن بھی تو بنی تھی۔

"کیوں گل بھیا تم نے ہمیں غیروں کی طرح عین شادی کے دن بلایا۔ بچاری ممانی نے اکیلے کیسے اتنے انتظامات کیے ہوں گے۔" میں نے ناز سے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"ارے نجمی بجو آپا یہ سب تیاریاں اماں کر سکتی تھیں؟ سارا سامان تو میری ساس نے بھجوایا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں آپ کی شان کے مطابق کچھ نہ کر سکوں گا.... تو انہوں نے کہا ہم سب سامان پہلے بھیج دیں گے تمہارے گھر تم وہ ساتھ لے آنا۔ سچ مجھے یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں میں تو غریب ہوں غریبوں کی طرح بیاہنے آؤں گا۔ مگر انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ ہماری برادری والے ویسے ہی غیر لوگوں میں شادی کے سخت خلاف ہیں۔ بہت کم برادری والے شادی میں شریک ہوں گے۔ وہ بھی اس لیے کہ تم گھر داماد ہونے والے ہو.... یہ چیزیں ہم اپنی بیٹی کو دیتے ہیں۔ تمہیں کیا اعتراض ہماری عزت رکھو۔ پھر مجھے رحم آ گیا میں نے ان کی بات مان لی۔ ٹھیک کیا نا میں نے؟" گلو میاں نے کہا۔

"بالکل......" میں نے بے دھیانی سے گلو میاں کی طرف دیکھا۔ پھولوں میں لدے وہ مجھے بڑے کالے نظر آئے۔

ایک شاندار کوٹھی میں ایک نہایت شاندار بینڈ کی موسیقی میں گلو میاں کی شادی کی رسم ادا ہو گئی نکاح نامے میں یہ شرط تھی کہ دولہا دلہن کو اس کے گھر سے نہ لے جا سکے گا۔ ور خود دلہن کے گھر میں رہے گا . . سلامی میں گلو میاں کو گیارہ ہزار روپیہ پیش کیا گیا۔ جو انہوں نے قبول نہیں کیا۔

فاطمہ بائی جو بمبئی کے ایک تاجر کی بیوہ تھیں۔ بے قومی لباس میں بڑے وقار سے مہمانوں کی خاطر مدارات کرتی رہیں۔

شیریں موٹی سی ناک میلے سے رنگ اور بڑی بڑی معصوم آنکھوں والی چوبیس پچیس سال کی نازک سی لڑکی تھی۔ یقیناً گلو میاں

سے چند سال بڑی۔ دلہن کے لباس میں بیٹھی وہ یوں پلکیں جھپکا رہی تھی جیسے گڑیا ہو۔ ورنہ پلک جھپکانے کے عمل میں اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ شامل ہو۔ میں اس لڑکی کو اتنا بے جان دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بے شمار جہیز میں اس کے بے پچاس جوڑے سینڈلوں کے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اتنی دیر بھی چل سکے گی کہ اس کی ایک ہی سینڈل کا تلا گھس سکے۔

"تو پھر گلو بھیا اللہ نے چھپر پھاڑ کر دولت دے دی تمہیں۔ اب تو مزے ہیں تمہارے۔" میرے بھائی جان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی مہربانی ہے۔ . . مگر اللہ میں نے اپنی ساس سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنی نوکری کرتا رہوں گا۔ آخر میری اماں ہیں، بجیا ہیں...... یہ سب تو میری بیوی کا ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض۔" گلو میاں نے بڑی احتیاط سے اپنے قیمتی سوٹ پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

اور میرے بھائی جان یوں ہنسے جیسے گدھے کو خشکہ کھاتے دیکھ رہے ہوں۔

"لیکن گلو بھیا یہ کیسے ہوگا کیا زہرہ اور محمانی تمہارے ساتھ نہیں رہیں گی؟ تم تو گھر داماد ہو نا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"رہیں گی میرے ساتھ لیکن کھائیں گی میری کمائی...... دیکھئے نا میں کون کم ہوں اپنوں کی خدمت کو۔ اللہ کے فضل سے نوکر ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر والے کسی اور کا دیا کھائیں۔ میں نے صاف کہہ دیا اپنی ساس سے۔ برا لگتا ہے تو منع کریں۔" گلو میاں نے بڑے گرم سے پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ اور میں نے اطمینان سے جمائی لے کر سوچا کہ اب گھر چلنا چاہیے کھانا تو ہو چکا۔

میری اماں کھانا کھا کر ناک تک ڈٹی ہوئی تھیں۔ وہ واپس آتے ہوئے راستے میں بڑبڑائیں۔ "ہے یہ فاطمہ بائی نگوڑی کچھ دیوانی لگتی ہے۔ دنیا جہان میں یہی گلو ملا تھا داماد بنانے کو۔ نہ صورت نہ علم۔ میں کہتی ہوں قسمت دیکھو۔ کراچی بھی خوب جگہ ہے بھئی واہ۔"

کئی دن تک ہمارے رشتہ داروں اور ملاقاتیوں میں اس شادی کے چرچے رہے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ لیکن سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ گلو میاں اپنی حماقت کے مارے دریا میں غوطہ لگانے کے باوجود سوکھے کے سوکھے رہیں گے۔

میرے بھائی جان کہتے "بھلا یہ کیا تک تھی کہ جناب نے مارے احساس کمتری کے سلامی تک لینے سے انکار کیا حالانکہ سلامی تو ہر امیر غریب دولہا قبول کرتا ہے محض جوش حماقت ورنہ کہیں سارے داماد کیا یوں مفت میں ملتے ہیں؟

اس کے باوجود ہم سب دریائے حماقت میں غوطہ لگانے کو بے چین رہے یعنی گلو میاں سے ملنے جلنے کو بے قرار ہم لوگ اپنی پڑوسنوں تک بھیجوں چڑھا کر فاطمہ بائی سے اپنی رشتے داری کا ذکر کرتے۔ اماں کہتیں۔ "ارے ہمارا لڑکا ایسے گھر سے خاندان کا

پھیروں میں جا کر پھنس گیا۔" بھائی جان اپنے دوستوں میں گلو میاں کا ذکر ذرا نفسیاتی تجزیے کے ساتھ کرتے۔ لیکن اکثر شاموں کو ہمارا مت اٹھتا تو سیدھے گلو میاں کی سسرال جا پہنچتے۔ بڑی شاندار دو منزلہ کوٹھی تھی اوپر کی پوری منزل بیٹی داماد کے لیے مخصوص تھی۔ دو نچلی منزل میں فاطمہ بائی اور ان کے چند دور کے رشتے دار رہتے تھے۔ یہ رشتے دار ان کی تجارت کے کاموں پر چھوٹی تنخواہوں پر لگے ہوئے تھے۔ گھر میں بھی ان کی حیثیت یوں ہی تھی۔ . . . موقع ملتا تو یہ رشتہ دار ہم جیسے مہمانوں کے سامنے چائے بھی لا کر لگا دیتے۔ انہیں میں ایک کھچڑی داڑھی والا ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا۔ جو گھر کے حساب کتاب کا نگران مقرر تھا۔ مگر عام طور پر چائے کی پیالیاں اٹھاتا نظر آتا۔ ہم لوگ پہنچتے تو وہ ضرورت سے زیادہ ہماری مدارات کرتا۔ ویسے فاطمہ بائی خود کچھ کم ہماری خاطر نہ کرتیں۔ چائے کا وقت ہوتا تو وہ چائے پلواتیں۔ باتوں میں دیر ہو جاتی تو وہ کھانا کھلواتیں۔ کھانا جس میں کچے ناریل کی بو ہوتی۔ گلو میاں کی اس نے بھی بڑا رنگ نکالا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بڑے ٹھسے سے بیٹھتیں اور سامنے میز پر بڑا سا پاندان کھلا رہتا۔ مگر لباس کے ساتھ کئی بار یہ پاندان میل نہ کھاتا کیونکہ وہ اکثر فاطمہ بائی کا قومی لباس بھی پہننے لگی تھیں۔ کئی بار وہ ہم سے لڑکیوں کی طرح ٹھنک ٹھنک کر کہہ چکی تھیں کہ "اے کیا کروں ہماری ساس رات دن پیچھے پڑی رہتی ہیں کہ آج یہ پہن لو وہ۔ ... انہیں اتنی محبت ہے ہم سے کہ کچھ نہیں پوچھو۔ ..." یہ تعریفیں سن کر فاطمہ بائی بڑی نہال ہوتیں۔ گلو کی بہن زہرہ بھی بولتیں تو اپنی بھابی کی تعریف ہی میں۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ شیریں کے جہیز کی سینڈل میں گلو کی بہن بڑی تیزی سے گھس گھس کر ٹھکانے لگا رہی ہیں۔ گلو میاں نوکری پر جاتے تو موٹر سائیکل پر جو فاطمہ بائی نے انہیں تحفتاً خرید دی تھی۔ موٹر پر اس لیے نہ جاتے کہ دفتر کے ساتھی انہیں چھیڑتے . ... میں دیکھتی کہ بے چارے گلو میاں عجیب ہونق سے لگتے جیسے غلط ڈھیری کی گئی ہو رن کی۔

شیریں اکثر ہمارے سامنے گلو میاں سے کہتی۔ "یہ نوکری کیا ہے۔ بزنس کریں گا تو اچھا ہوئیں گا۔ اپنا بزنس ہے اسے دیکھیں گا۔ موٹر اپنی چھوڑیں گا اور موٹر سائیکل پر گھومیں گا تو لوگ کیا بولیں گا؟"

شیریں یہ سب اتنے معشوقی انداز سے کہتی کہ جی لٹ جاتا۔

"ارے ہاں گلو بھائی ٹھیک تو کہتی ہیں بھابی۔ بزنس کی دیکھ بھال کیا کرو۔" میں بالکل مفت مشورہ پیش کرتی۔

"پر ہم کیا بولیں گا ہمارے کو اپنا نہیں سمجھیں گا گلو بھائی۔" فاطمہ بائی بھی شکایت کرتیں اور گلو میاں پنجرے میں بند بندر کی طرح حیرت سے ہم سب کو دیکھتے لیکن ہم سب پوری قوت سے فاطمہ بائی کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ہم میں سے ہر شخص کے دل میں یہ ہوتا کہ اگر ہم گلو میاں کی جگہ ہوتے تو

پھر ایک دن سنا کہ گلو میاں نے اپنے کسی افسر کی ڈانٹ پر اسے گھونسہ رسید کر دیا اور ملازمت چھوڑ دی اور یہ بھی سنا کہ اب فاطمہ بائی کی خواہش کے مطابق بزنس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ہم سب موقع دیکھ کر ایک دن پہنچے۔ یقین جو نہیں آتا تھا۔ پتہ چلا ٹھیک ہے گلو کی اماں اور بہن بڑی نہال تھیں۔ گلو میاں ذرا دیر بعد موڑ سے اتر کر اندر آئے تو کافی بدلے بدلے سے لگے۔ جیسے بیمار ہوں۔ مگر مجھے یہ بیماری بڑی رومینٹک سی لگی اور جب وہ ذرا دیر سے اٹھ کر کندھے جھکائے اوپر چلے گئے تو ان کی اماں نے ان کی اس ادا کا ترجمہ یوں کیا کہ "بچہ تھکا ہوا ہے اب جا کر نہائے گا۔"

"نہیں ناراج ہے گا ہمارے سے۔ دیکھو ہم بور تو گل بھائی بزنس بزنس ہے۔ کسی کے ساتھ مروت نہیں کریں گا۔ ایک مہینہ ہو گیں کام کوئی نفع نہیں کیا یہ بھی بور گل بھائی کس پر روپیہ نہیں چھوڑیں گا۔ مروت اور روپیہ کا دشمنی ہے گا۔ بزنس بزنس ماقی ہو گیں گا ..." فاطمہ بائی نے اپنی مخصوص اردو میں ہمیں اپنا خیال بتانے کی کوشش کی۔

"ارے سمدھن خواہ مخواہ کو بھتی ہو کر لڑکا ناراض ہے۔ بچہ نرم دل ہے سیکھتے سیکھتے سب سیکھ جائے گا۔" گلو کی اماں نے زور سے پاندان بند کیا۔

"نہیں آپا بزنس بزنس ہے نہیں تو سب کھلاس (ختم) ہو جائیں گا۔ بر اہیم بھائی بولتا گل بھائی بہت مروت کرتا۔" فاطمہ بائی نے بتایا۔

"بالکل ٹھیک بولا ... بالکل ٹھیک۔" ابراہیم بھائی نے اپنی بھگی داڑھی ہلا کر ہمارے سامنے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس گھریلو کاروباری کھینچا تانی پر کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ جس میں سب سے زیادہ میرے بھائی جان نے حصہ لیا۔ اور اماں نے ہاں میں ہاں ملائی اور یہ ثابت کیا کہ گویا ان کے سوا بزنس کے رموز اور کوئی نہیں جانتا۔ گلو میاں کی ماں بہت برا مانتی رہیں اور یہ ثابت کرتی رہیں کہ ان کے خون میں کاروبار رچا ہوا ہے۔ حالانکہ نرا جھوٹ تھا۔ ان کے خاندان میں تو کسی نے ترازو تک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

واپسی سے پہلے ہم لوگ گلو میاں سے ملنے ان کی شاندار خواب گاہ میں پہنچے۔ وہ بڑے بے چین سے تھے۔ ہم نے انہیں بڑی اپنائیت سے "بڑا آدمی" ہو جانے کے طعنے دیئے اور شکایت کی کہ وہ ہمارے ہاں نہیں آتے۔

"ارے کیا! کہاں کی بڑائی یہ بزنس بھی نوکری سمجھ کر رہا ہوں ... خیر کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔ مرد ہوں مفت کی تو نہیں کھا

سکتا۔ خیر آیئے آپ لوگوں کی موٹر میں آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔

موٹر ڈرائیو کرتے ہوئے گلو میاں کتنے اجنبی لگے۔ کیا بتاؤں۔ گھر پر میں نے زبردستی ٹھیک سی تھوڑی دیر کو اتار لیے۔ مگر پھر شرم آئی کہ گھر کیا بری حالت میں تھا اس وقت۔ گلو میاں جلدی میں تھے۔ بیٹھے بھی نہیں۔

گلو میاں کی اماں ہم لوگوں سے کافی کھٹک گئیں۔ اس لیے انہوں نے عرصے تک ہمیں نہ بلایا۔ اور ہمیں بھی جانے کا کوئی بہانہ نہ ملا۔ چند ماہ بعد یہ سن کر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی کہ گلو میاں کاروباری معاملات میں بالکل نکمے ثابت ہوئے اور گلو میاں پر تیجی دار ڑھی والے ابراہیم بھائی نگران مقرر ہو گئے اب سارے کام خود بخود ہو جاتے اس لیے سنا کہ بچارے گلو میاں بڑے بڑے ہوٹلوں اور سینماؤں میں پائے جانے لگے...... کبھی کاروبار میں دخل دینے پہنچتے تو ابراہیم بھائی بڑی محبت سے انہیں "سب ٹھیک چلتا ہے" کہہ کر چائے پیش کرتے اور سر جھکا کر رخصت کر دیتے قصے سن سن کر میں گلو میاں سے ملنے کو بے چین تھی۔ میرے ذہن میں ابراہیم بھائی کو پٹخنی دینے کی بہترین تجویزیں تھیں۔ ... مگر میری اماں ان دنوں ذرا خوددار زیادہ ہو گئی تھیں۔ اس لیے فاطمہ باجی کے یہاں جانے کی ہر تجویز وہ ویٹو (VETO) کر دیتیں۔

ایک دن ہماری میلی کچیلی بلڈنگ کے سامنے ایک موٹر کا ہارن دیر تک چیختا۔ میں نے گیلری سے جھک کر دیکھا۔ گلو میاں کی موٹر کھڑی تھی۔

"گلو میاں آئے ہیں۔" میں نے چیخ کر ماں کو اطلاع دی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی جلدی کمرے میں بکھرے ہوئے۔ کپڑے میلے برتن اور کتابیں اٹھا اٹھا کر دوسرے کمرے میں پھینکیں۔ کرسیوں پر جمی ہوئی دھول دوپٹے سے پونچھی اماں نے دوسرے کمرے میں جا کر دوپٹہ سر پر ڈالا۔ میں نے پھرتی سے چپل اتار کر سینڈل پہنی۔ اور جب دروازہ کھولا تو گلو میاں کوٹ میں گلاب کا پھول لگائے بڑی گمبھیرتا سے اندر آئے... مجھے یوں لگا جیسے گلو میاں کے چہرے پر عمر برس گئی ہو۔

اماں گلو میاں کی بلائیں لینے کے بعد چائے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور پھر پچھلا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ظاہر ہے کہ اماں پڑوسن کے ہاں سے اس کے جہیز کا ٹی سیٹ لینے گئی تھی اور ساتھ ہی اسے یہ بھی بتانے کہ دیکھو میرے سگے دیور کا لڑکا آیا ہے جس کی قیمتی ذاتی کار نیچے گلی میں کھڑی ہے۔

"کل کتنے دنوں کے بعد آئے ہو جاؤ ہم نہیں بولتے تم سے" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں مرعوبیت چھا رہی ہے اور دل ہے کہ بری طرح دھڑک رہا ہے۔

"فرصت ہی نہیں ہوتی۔ کیا کروں۔ بجو آپا" گلو میاں نے بڑی مصنوعی شائستگی سے مسکرا کر کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ گلو میاں کی سانس سے اسپرٹ جیسی بو کمرے میں پھیل رہی ہے۔

"ارے کون سی اینٹیں ڈھوتے ہو۔ اللہ کی مہربانی سے کسی کے غلام تو نہیں ہو۔" میں نے چکراتے ہوئے کہا۔ اور گلو میاں پر نظریں جمانے کی کوشش کی جنہیں فاصل کے نصاب کی دیوار کے پیچھے وہ کتنے مختلف نظر آئے مجھے۔

"واللہ فرصت نہیں ملتی۔ کئی بار سوچا کہ آپ کے ہاں آؤں پھر بھول گیا جانے کیا ہو گیا ہے دماغ کو ...... " وہ بولے شادی کے بعد پہلی بار میں ان کے چہرے پر پرانی بے بسی اور معصومیت کی جھلک دیکھی اور میں نے چاہا کہ اپنی کتابوں کی دیوار کے پیچھے سے انہیں کوئی مشورہ دوں...... نہیں بلکہ تھپک کر تسلی دوں۔ لیکن ایک ہی لمحے میں وہ بدل گئے۔

"واللہ سب بھول جاتا ہوں آپا ..... کل ہی کسی سے ہاکس بے چلنے کا وعدہ تھا۔ کار بھی ریزرو کرالی تھی، مگر میں ایک دم بھول گیا۔" گلو میاں نے بڑے اسمارٹ طریقے سے غمزدہ ہوتے ہوئے رک رک کر کہا۔

کوئی اور ہوتا تو میں اس کے منہ سے یہ قصہ سن کر مارے دوڑتی مگر اس وقت مجھے یوں لگا جیسے گلو میاں کا وجود ایک دم پھیل رہا ہو۔ ونڈر لینڈ کی ایلس کی طرح جس نے شیشے کی میز پر رکھی ہوئی بوتل کا مشروب پی لیا۔ میرے چھوٹے سے کمرے میں جیسے وہ گھٹ کر رہ گئے میرا دم گھبرانے لگا۔ اپنا وجود بے حقیقت لگنے لگا الجھن ہوتی ہی ہے۔ میں چائے لینے کے لیے دوسرے کمرے میں بھاگی اور جب میں اماں کے ساتھ پرتکلف چائے لے کر دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بڑے اسٹائل سے میری کوئی کتاب پکڑے میز سے لگے کھڑے تھے اور مجھے خیال آیا کہ ارے یہ تو گلو میاں ہیں۔

گلو میاں نے بڑی بے دلی سے چائے کے چند گھونٹ پیے اور بازار سے منگوائے ہوئے سموسوں اور مٹھائی کو چھوا تک نہیں حالانکہ اماں چاہتی تھیں کہ یہ ساری چیزیں گلو میاں کھائیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ موٹر میں گھومنے چلیں۔ اور ہم تیار ہو گئے۔

"کہاں چلیں آپا؟" گلو میاں نے اسٹیرنگ وہیل پر جھک کر پوچھا۔

راستے میں موٹر کی نرم گدیوں پر بیٹھتے ہوئے مجھے احساس ہوتا رہا کہ یہ گلو میاں میرے لیے دلچسپ ہوتے جا رہے ہیں۔ سڑک پر فر فر کرتی بسیں پر آوازے کسنے والے کتنے برے معلوم ہوتے ہیں لیکن موٹر میں بسی ہوئی الکحل کی ہلکی سی بو اور ہاکس بے کی کالج میں بیٹھی ہوئی خستہ ہڑی گلو میاں کے سر کے گرد ایک ہالے کی طرح چمک رہی تھی۔ خیال رہے کہ میں ایک پڑھی لکھی شریف لڑکی

ہوں۔ اس لیے اس سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوئی۔ اس دن تفریح میں بار بار میرا موڈ بگڑ جاتا۔ پھر میں یہ جواز پیدا کرتی کہ شاید شریں بے حد ٹھنڈی منی ہوگی جبھی تو بے چارے گلو میاں ایسے ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اس دن بے حد باوقار بننے کی کوشش کرتی رہی۔

گزرتے ہوئے وقت کو اس لمحے ایک دھچکا سا لگا جب ایک رات گلو میاں کی اماں موٹر سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر ہانپتی کانپتی ہمارے ہاں پہنچیں

"اے جلدی چلو۔ فاطمہ کی نگوڑ ماری پر نکاح کا بھوت سوار ہے ..... "انہوں نے بے حد ہول کر بتایا۔

"اوئی" اماں تصویر حیرت بن گئیں اور مجھے ایک دم ہنسی آنا شروع ہوگئی واہ کیا فاطمہ بائی کی لگام ہمارے ہاتھ تھی......" مجھے گلو میاں کی اماں سے ہمدردی ذرا کم ہی ہوئی۔ پچھلے چند ماہ سے انہوں نے ہمیں پوچھا تک نہ تھا۔

"کس کے نکاح کا بھوت سوار ہے؟" بھائی جان نے بے نیازی سے پوچھا۔

"ارے اپنے کا نکاح"۔ گلو میاں کی اماں نے شدید خفا ہو کر وضاحت کی۔

"تو کرنے دیجئے... " بھائی جان نے اسی بے نیازی سے جواب دیا اور گلو کی اماں یکدم رو پڑیں۔

"نکاح کرلیں گی تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ ہمارا کیا ہوگا؟" گلو کی اماں یہاں سے بات شروع کی تو سب کو قائل کر کے چھوڑا۔ وہ مصر تھیں کہ ہم لوگ چل کر فاطمہ بائی کو سمجھائیں کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائیں۔

ہم لوگ شاید اس جھگڑے میں نہ پڑتے مگر یہ کھوج بڑی بلا ہے اماں جھٹ تیار ہوگئیں.... ہم سب پہنچے۔

فاطمہ بائی حسب معمول سنجیدہ اور باوقار نظر آرہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہم سے بڑی مدارات سے پیش آئیں۔ گلو کی اماں نے بڑی چالاکی سے نکاح کا ذکر چھیڑا تو فاطمہ بائی ذرا چونکیں۔

"اے سدا سہاگن بی اللہ رکھے جنی داماد کے ہوتے نکاح کیسا؟" میری اماں سے بے تکے پن سے فوراً کہہ دیا۔ لیکن فاطمہ ضبط کر گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی مخصوص اردو میں ہمیں اپنا نقطہ نظر سمجھایا۔ ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اگر نکاح نفس کے لیے کرنا ہوتا تو بیٹی کی شادی سے پہلے کر چکی ہوتیں۔ اب تو انہیں خود بھی نکاح کرتے شرم آتی ہے مگر کیا کریں۔ اتنا کاروبار کیسے چلے کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی تو ہو۔ بیٹی کی شادی شریف "ڈی" دیکھ کر اس لیے کی تھی کہ کاروبار سنبھالے گا۔ مگر کاروبار سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ گلو میاں پر بھروسہ کر کے دیکھا ان کا دل اور ہے۔ کاروباری کا دل دوسرا ہوتا ہے۔ سب بنا بنایا ڈوبا جا رہا ہے۔ یہ تو نہیں دیکھ

جا سکتا۔ دولت رہے گی تو گلومیاں ورثن کی اولاد ہی کے کام آئے گی۔ غیروں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس سے مجبوراً نکاح کئے لیتی ہیں تاکہ کاروبار کی تیج دیکھ بھال ہو سکے۔

یہ تو جیہہ سن کر گلومیاں کی اماں تملا گئیں۔

"دنیا کیا کہے گی بڑھاپے میں نکاح کرتی ہوں۔" وہ چیخ کر بولیں۔

"دنیا تو پہلے بھی بہت بولا جب ہم کلی بھائی کو داماد بنایا۔ ہم کو پرواہ نہیں۔ دنیا کچھ بولے تو ہم اپنا بزنس لٹا دے؟" فاطمہ بائی نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

دو میری ماں نے قائل ہو کر سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ہمیشہ کی طرح پر تکلف چائے پیش کی گئی۔ لیکن چائے پیش کرنے والے ابراہیم بھائی نہیں تھے۔ کیونکہ وہ تو اس کاروباری نکاح کے دولہا منتخب ہوئے تھے۔

یہ بات تو صاف تھی کہ براہیم بھائی نے گلومیں کی کاروباری تانی کو عمل کرنے میں کتنا بڑا رول ادا کیا ہوگا۔ مگر ہمیں ایک اطمینان تھا کہ اس جھگڑے میں گلومیں بالکل الگ ہوں گے بلکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کی ماں اس کاروباری نکاح کے خلاف ہم چلائے ہوئے ہیں تو یقیناً ناراض ہوں گے... حالانکہ ان کی اماں بے چاری ان ہی کے مستقبل کی فکروں کے مارے۔ یہ بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ ان بے چاری کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ فاطمہ بائی کے کوئی اور اولاد ہو جائے ابھی بھی تھیں فاطمہ بائی ۔ یہ نہیں تو ممکن ہے کہ ابراہیم بھائی بعد میں خود بھی حصہ دار بن بیٹھے گا اور ان کے بیٹے کا کتنا نقصان ہوگا۔

میں نے سوچا اگر گلومیاں کو معلوم ہو کہ ان کی اماں کن فکروں اور چالوں میں مبتلا ہیں تو شاید گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں حضرت ۔ مگر وہ ہمیں ملے ہی نہیں۔ میں نے ایک دن ایرانی کے ہوٹل سے ٹیلیفون بھی کیا' مگر وہ گھر پر نہ تھے۔

پھر خبر سنی کہ شریں کو بخار رہنے لگا۔ ایک دن میں اور اماں اس کی عیادت کو پہنچے۔ ارے ہم کیوں گلو کی اماں کی وجہ سے اپنے تعلقات خراب کرتے؟ شیریں اپنی خوبصورت خواب گاہ میں تھی اور گلو کی اماں اور زہرہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھیں۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کر خوش نہ ہوئیں۔

فاطمہ بائی دوا کی شیشی لیے شیریں کے پاس آگئیں۔ سنجیدہ تیوریوں پر کھنچی ذرا سا

"اے بچو کے دل کو صدمہ ہے۔ باپ کو ہر وقت یاد کرتی ہوگی۔ جبھی تو بخار رہنے لگا ہے۔" گلو کی اماں نے میری اماں سے مخاطب ہو کر زور دے لہجے میں کہا میری اماں ہر بات میں اتفاق کرنے کی عادی ہیں اس لیے انہوں نے بھی بے سوچے سمجھے ہاں میں

ہاں مدد دی۔ اس بات پر فاطمہ باجی بالکل بکھر گئیں۔ اور گلو میاں کی اماں کا ہاتھ شیریں کے سر پر سے جھٹک دیا۔

'' ہائے تم نے میرے ہیرے جیسے بچے کو پھانس لیا۔ اب میری بے عزتی کرتی ہو ۔ گلو میاں کی اماں نے عورتوں والا حربہ استعمال کیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

یہ سن کا فاطمہ باجی اور آگ بگولا ہو گئیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے ہی بخار میں تپتی شیریں کو گھسیٹا کہ وہ نیچے چلے اور پھر کبھی گلو کی صورت نہ دیکھے۔

'' تم لوگ بھکاری ہے۔۔۔ ہم جانتا ہے۔۔ ... '' فاطمہ باجی شیریں کو لے جاتے ہوئے چیخیں اور گلو میاں کی اماں کی دھاڑیں ایک دم سسکیوں میں تبدیل ہو گئیں اس ہنگامے میں کہیں سے گلو میاں آ گئے۔ انہوں نے یک لمحے کو الگ کھڑے یہ تماشہ دیکھا اور پھر تیزی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے گلو میاں کی صورت دیکھ کر ڈر لگا۔ بالکل مینڈک کے پیٹ جیسی رنگت۔''

ٹھہری ہوئی پتلیاں۔ سسکتی ہوئی شیریں فاطمہ باجی کے ہمراہ نیچے جا چکی تھی۔ اور اب گلو کی اماں خاموش تھیں مگر گلو میاں دوسرے کمرے سے نہ نکلے۔

'' اے توبہ خدا نہ لے جائے ایسے بدتمیزوں کے گھر میں۔ ہمارے ہاں تو لکھ پتی بیٹی والے اپنے گھسیارے داماد کے سامنے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں۔ کہاں کے موئے جنگلی ہیں۔۔ اب وہاں کوئی تھوکنے بھی گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا ۔ '' اماں نے فاطمہ باجی کے سلام کا جواب نہ پا کر ان کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے کہا اور میں نے بھی سوچا واقعی ہمیں کیا۔ خواہ گلو واہی تکی ہوئی تھا۔

دوسرے دن صبح صبح ہی گلو کی اماں اور زہرہ روتی ہوئی ہمارے ہاں آ پہنچیں۔

خدا کے لیے جلدی چلو ...... بنو کو بھی لے چلو..... بنو اپنے بھائی کو بھی ٹیلیفون کر کے بلا لو۔'' گلو کی اماں کرسی پر یوں بیٹھیں جیسے انہیں غش آ گیا ہو۔

'' ارے ہوا کیا؟'' اماں نے اطمینان سے پان کی گلوری بنائی اور منہ میں رکھ لی۔

'' اے بتاؤں کیا تم لوگ بس چل کے گلو میاں کو وہاں سے لے آؤ۔ وہ تمہاری بات مانے گا۔'' گلو میاں کی اماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ '' آج تو اللہ نے بچا لیا ورنہ میرے منہ میں خاک انہوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ ہی کیا تھا۔''

'' خاتمہ' کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔ '' میں ڈری۔

"شیریں کے برادری والے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں ــــــــ کل اس حرف زدگی کا نکاح ہے نا ــــــــ رات گل میاں غسلخانے میں تھے۔ کوئی دو بجے ہوں گے تو کسی نے گولی چلائی۔ سینے میں لگی۔ گر . . اور نیچے شور مچا: یا چور چور . . . اگر وہاں گلو میاں ہوتے تو ہائے اللہ کیا ہوتا ــــــــ ۔" زہرہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے بتایا۔

اور ہم سب ذرا دیر کو مارے خوف کے خاموش ہو گئے میری کھلی آنکھوں کے سامنے گلو میاں کا کالا چہرہ آ گیا۔ کھوپڑی بڑی ہوئی اور سفید بھیجے کے ذرے ہر طرف بکھرے ہوئے۔ خوف اور نفرت سے میں نے جھرجھری لی۔ یا اللہ بے کسی کا یہ تصور کس قدر گھناؤنا تھا۔

"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے آپس میں کہ بھلا یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر کے چلا آئے تا وہاں سے گلو . . . ." اماں نے گھبرا کر پاندان بند کیا۔

"ہائے اللہ کوئی چل کر انہیں لے آئے۔ وہ نہیں آتے۔ وہ تو کہتے ہیں: وہ گھر میرا ہے۔ میں نہیں چھوڑوں گا۔ . . . جانے کیا ہو گا۔" زہرہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"ہم کیسے جائیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ پھر ٹھیک ہی تو کہتا ہے گلو . . . ." ماں نے سوکھے منہ سے کہا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھیں۔

گلو کی اماں اور بہن کی انتہائی خوشامد کے باوجود ہم ان کے ساتھ نہ گئے۔ ظاہر ہے کہ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہو تو وہاں جا کر اپنی ٹانگ کیسے پھنسائی جائے۔

رات جب بھائی جان گھوم پھر کر آئے تو اماں نے کروٹ بدل کر بڑے دکھ سے کہا۔ "بیچارہ گلو اس سوکھی وق زدہ شیریں کے لیے وہاں بیٹھا ہے جان کی بازی لگائے۔ دیکھ لینا وہ ہنڈیا بھی ماں کی حمایتی رہے گی۔ اگر وہ اچھی تو ماں نکاح کا نام لے سکتی تھی بھلا؟"

"ہوں۔" بھائی جان نے کہا اور کروٹ بدل لی۔ شام کو تو وہ گھنٹوں اس موضوع پر باتیں کر چکے تھے نا۔ ان کا فیصلہ تھا کہ اس لغو قصے سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔

اور میں رات کو سوتے میں بھی کسی خوفناک خبر کی منتظر رہی۔ صبح صبح اخبار میں نے ہی اٹھایا۔ وہ خوفناک خبر نہ آئی۔ دوسری صبح بھی میں سب سے پہلے جاگی اور اخبار اٹھایا کیونکہ اس دن فاطمہ باجی ابراہیم بھائی کی بیوی بن چکی تھیں۔ تیسرے دن بھی میں اخبار گرنے کی آواز سے جاگ اٹھی۔ اور اسی طرح کئی دن تک . . . پھر ایک دن میں نے ایرانی کے ہوٹل سے فاطمہ باجی کے گھر کا

فون نمبر ملایا۔

ور کسی نے زور سے ٹیلیفون بند کر دیا۔ مگر جناب انسانی ذہن ٹیلیفون تو ہے نہیں کہ جب چاہا سنا جب چاہا نہیں سنا۔ میں بچوں کی طرح "پھر کیا ہوا" کا جواب سننا چاہتی تھی۔ انہیں دنوں میرا امتحان قریب آ گیا۔ جی چاہتا کہ پنڈی میں بکھرے ہوئے رشتہ داروں میں جاؤں کہ شاید کہیں سے گلومیوں کی کوئی سن گن ملے۔ لیکن پڑھنے سے فرصت ہی نہ ملتی۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ اس دن ذرا گلو کی اماں کے ساتھ چلے جاتے تو کیا حرج تھا۔ کوئی فاطمہ ہمیں چھانسی نہ دلوا دیتیں۔ کتابوں سے سر مارتے مارتے مجھے بار بار گلومیوں یاد آتے۔ وہ یک زمانے میں کتنی عقیدت سے میری یہ کتابیں دیکھتے تھے اور مجھی مجھے۔ ... میں پہلے ہی بتا چکی ہوں تاکہ گھر میں میرا ذکر بہت کم کیا جاتا تھا۔

یک دن میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی جان سے کہا۔

"ارے بھائی جان گلومیوں نہیں ملتے کسی کو؟"

"ارے ہاں کل کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ ملتے میں فاطمہ بائی کی شادی کے دن وہاں سے چل دیئے تھے" بھائی جان نے بے زاری سے جمائی لے کر بتایا۔

"تم پہلے نہ بتایا تم نے۔" ماں نے پوچھا۔

"بتایا کیا۔ نرا گدھا ہے؟" اماں نے پوچھا۔

"بتاتا کیا۔ نرا گدھا ہے؟" بھائی جان نے دوبارہ جمائی لے کر کہا۔

"اب کہاں ہیں وہ لوگ؟" میں نے دبی زبان سے سوال کیا۔

"مجھے کیا خبر؟ خبر نہ ہو یہی بہتر ہے۔ رہنے کا ٹھکانہ تو ہو گا نہیں ان لوگوں کے پاس۔ . . . دور فلیٹ ہر ایک کو بڑا معلوم ہوتا ہے۔" بھائی جان اتنا کہہ کر اخبار پڑھنے لگے۔ ماں اور باورچی خانے میں چلی گئیں اور کتابوں پر جھک گئی....... میری آنکھوں کے سامنے گلومیاں کی پرانی سرخ کی شیروانی کا گھسا ہوا دامن پھڑپھڑایا تو میں نے کتاب کا ورق الٹ دیا....... میرا امتحان قریب تھا!

امتحان کے لیے لاہور جانے میں چند دن باقی تھے۔ آخری دن "پنجاب سے امتحان پاس کرنے کی گارنٹی دینے والے کالج" سے نکلی تو بولٹن مارکیٹ کے ایک بس سٹاپ پر رک کر میں نے سوچا کہ یہاں سے کلاتھ مارکیٹ جانا چاہیے شاید کوئی سستا لیکن عمدہ

دوپٹہ مل جائے۔ میرے رومال میں پانچ روپے بندھے ہوئے تھے جو اماں نے بڑی بحث کے بعد دیئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میرے پاس چار دوپٹے ہیں اور یہ کافی ہیں۔ اماں کی کنجوسیوں کے خیال سے میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اب بھلا ہو اور جاتا ہوا اور کوئی شیفون تک کا دوپٹہ نہ ہو۔ حد ہے (میں نے سن رکھا تھا کہ لاہور کی لڑکیاں بے حد ٹھاٹ کے کپڑے پہنتی ہیں) جی چاہا یہ پانچ روپے رومال سے کھول کر پھینک دوں اور بس اسٹاپ پر بیٹھ کر خوب روؤں۔

میں نے خود کو بہلانے کے لیے سڑک پر آتی جاتی لمبی لمبی اور نئی نئی موٹروں کو گننا شروع کر دیا۔ جن کی تعداد میرے دیکھتے دیکھتے کراچی کی سڑکوں پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک...... دو... ہائے اللہ کیا حسین رنگ ہے اس کی ساری ہو تو... تین۔ کیا خوبصورت عورت ناز سے منہ اونچا کیے بیٹھی ہے اور ساری کا رنگ ہائے اللہ ...... ارے یہ کون مرا جا رہا میرے کھوے پر دھپ جماتا گزر گیا؟ سامنے سے آتے ہوئے پہلوان سے اپنا کندھا بچاتے ہوئے میں پھر روہانسی ہو گئی۔ .. چار .... پانچ... کئی موٹریں گزر گئیں۔ ان میں بیٹھی ہوئی عورتیں کتنی آزاد کتنی مطمئن تھیں اور میں ابھی تک بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بس میں گھستے ہوئے بہت سے دھکے کھانا تھے .... چھ ..... سات.... ہائے کیا نفیس پیلا شیڈ ہے...... ایسا ہی دوپٹہ لوں تو... مگر اس کار میں تو گلو میاں تھے۔

میرا ہاتھ بے ساختہ اٹھ گیا۔ ہلکے پیلے رنگ کی لمبی سی امریکی کار زور سے بریک لگا کر رک گئی۔

"ارے گلو میاں تم؟" میں نے ہکلا کر کہا اور میرا ہاتھ کار کی چمکتی چھت پر پھیل گیا۔

"کہاں جانا چاہئے میں پہنچا دوں۔" گلو میاں نے سیاہ چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا اور اپنے پہلو کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ کار چل پڑی مگر میں سناٹے میں تھی۔ گلو میاں اور اس نئی کار کا تعلق میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہیں ڈرائیوری تو نہیں کرنے لگے۔

"کیا کرتے ہو گلو میاں آج کل......" میں نے گلا صاف کر کے پوچھا۔

"وہی کاروبار کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔" گلو میاں نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اور مجھے بھائی جان کی ناقص اطلاعات پر غصہ آ گیا۔

"شکر ہے سب معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ ایک بار میں نے ٹیلیفون کیا تھا جانے کس نے بند کر دیا تمہارا نام سن کر   شیریں کیسی
ہیں؟" میں نے کہا۔

"اچھا تو آپ کو میری فکر تھی؟" گلو میاں نے بڑے اجنبی انداز سے میری طرف دیکھا اور میں گڑ بڑا گئی۔

"تم ہم سے ناراض ہو؟ دیکھو نا اس دن معافی آئی تو بھائی جان "میں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ میں بھ
گئی کہ ان کی اماں اور بہن نے تمہیں ہمارے خلاف خوب بھرا تھا۔

"واللہ جانے دیجئے۔ بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگا آپ سے" گلو میاں نے سگریٹ سلگائی۔ "ارے ہاں ایک خبر تو سنی
ہوگی آپ نے...... زہرہ بجیا کی شادی ہوگئی۔" گلو میاں نے کہا۔

"اچھا۔ اچھا" میرا گلا مارے رنج اور غصے کے بھر آیا۔ یہ ترک تعلق نہیں تو اور کیا ہے کہ زہرہ کی شادی میں ہم لوگوں کو پوچھا تک
نہیں۔

موٹر یک دم جھٹکے سے ایک شاندار دوکان کے سامنے رک گئی۔

"معاف کیجئے میں ذرا دولہا بھائی کو لے لوں انہیں گھر چھوڑنا ہے۔" گلو میاں نے پر جھک کر کہا اور مجھے الکحل کی بو نے چکرا دیا۔
گلو میاں بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتے دوکان کی شفاف سیڑھیوں پر جا کر کھڑے ہوگئے۔ چند لمحے بعد ایک نہایت کریہہ شکل
بوڑھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا آہستہ آہستہ گلو میاں کے ساتھ دکان سے اترا اور گلو میاں نے کار کا پچھلا دروازہ اس کے لیے کھول دیا
۔ کار دوبارہ فراٹے بھرنے لگی۔ اور میں چکرا گئی۔

"دولہا بھائی کو چھوڑ دوں پھر پاس سے کی سیر کراؤں گا۔ آپ کو۔ چلیں گی؟" گلو میاں نے بے حد پر اسرار آواز میں مجھ
سے سرگوشی کی۔ اور میرے اندر ہتک کا احساس شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

"تو میں۔ ۔ ۔ گویا میں۔ منشی فاضل کی کتابیں میری گود سے لڑھک کر نیچے میرے پاؤں پر گر گئیں۔ میں نے مڑ کر
بوڑھے کریہہ شکل زہرہ کے خاوند کو دیکھا اور پھر گلو میاں کو ...... ان دونوں سے مجھے ڈر لگا۔ وہ یک دم نکلنے والی چیخ میرے گلے
میں گھٹ کر رہ گئی۔

میرے گھر کی گلی آئی اور گزر گئی۔

"دراصل یہ نئی موٹر بے حد تیز رفتار تھی"

فاصلے

ثانی کو عین وقت پر نانی پہ کی سوجھ رہی تھی۔

"بعد چقماق پتھر میں رگڑ لگے اور چنگاری نہ گرے۔ ۔ "ثانی دروازے کے پاس رُک کر بولیں اور ستارہ کو تنگی چڑھا کے، چشمہ پہنے سے۔

"چقماق! چقماق یہاں کہاں سے ٹپک پڑا؟" ستارہ نے بڑے غصے کے ساتھ سوال کیا۔

"اے یہ ایک بات کہی کہ لڑکی کو لڑکے کے پاس اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟" ثانی نے جواب دیا۔

"چہ بھی ریاض لڑکا ہیں؟" ستارہ جھنجھلا کر بولی۔ تو بچے میں چند وحشت تھے۔ اسے ڈر تھا کہ ستا بچی میں یہ بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے جو ٹھیک وقت پر ریاض یہاں پہنچ جائیں جیسل کہہ نہیں رہے تھے کہ افریقہ کاؤں کا وطن سہی مگر وہاں جانے والے یا تو انگریز ہو جاتے ہیں یا گاندھی..... سو ریاض بھی ایک دم صاحب بہادر ہو گئے ہیں۔

اس انگریزیت کے دھوم دھڑکے نے ستارہ کو صبح سے تھکا مارا تھا۔ ان کے فلیٹ میں تھا ہی کیا۔ چند کرسیاں اور دو میزیں، ستارہ کل سے اب تک ان چیزوں کو ہر زاویے سے سجا کر چور ہو چکی تھی۔ اس پر سے کم بخت دری جو سر پر سوار تھی آج دس سال سے ماموں جان کے جوتوں کی دھول چاٹ چاٹ کر وہ مٹی جیسی ہو چکی تھی۔ صبح سے بیسیوں مرتبہ ستارہ اس پر برش رگڑ چکی تھی مگر اس کا رنگ نہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ ماموں جان بے چارے کیا کرتے اب یہ ہر دم یاد رکھنا کہ باہر سے اندر آتے ہوئے ناریل کے پائدان پر جوتے رگڑ دیں ان کے بس میں نہیں تھا۔ صبح سے کئی بار وہ ستارہ کو اپنے میلے جوتوں اور دری کے سلسلے میں دلیل دے چکے تھے ویسے ابھی ذرا دیر پہلے جب وہ پنواڑی سے پانوں کی ڈھولی لے کر آئے تو سب کے سامنے بے احتیاطی سے اپنے جوتے پائدان پر رگڑے تھے غالباً صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کی اس تازہ سپرٹ کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے چند گھنٹوں کے لیے باہر رہنے پر زیادہ چوں چرا نہ کی اور دو آٹھ بجے سے ہی کھانا کھا کر جیب میں پیسے ڈالے ایرانی ہوٹل کی چائے کے خواب دیکھ رہے تھے اس لیے انہوں نے اپنی اماں اور ستارہ کے سوال جواب پر توجہ دینے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ بالکونی میں جا کر اپنے کبوتروں کی کابک کے پٹ وغیرہ دیکھ لیں۔ جب وہ بلی کے

خطرے کی طرف سے مطمئن ہو کر کمرے میں لوٹے تو بڑی معصومیت کے ساتھ زہرہ سے مخاطب ہوئے۔

"بلی کا خیال رکھنا' کبوتروں کو تنگ نہ کرے۔" وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولے اور زہرہ جو مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑی تھی چونک پڑی اس نے گھبرا کر جمیل کی طرف دیکھا جو آج بات بے بات پر زہرہ کو چھیڑ رہے تھے مگر جمیل نے چٹنے کے بجائے اپنے کندھے سے لگے ہوئے پانچ برس کے نخھے کو سنبھال کر ماموں کا راستہ روک لیا۔

"ارے ابھی کہاں چلے' آپ پہلے نانی کو سمجھائیے کتنی بڑی لڑکی کو اکیلے چھوڑ دوں؟" جمیل نصاف طلب انداز سے بولے۔

"اور کیا؟" ماموں کبوتر کی طرح منڈی میں گنگنے۔

"کیا؟" ستارہ ایسی جیسے انگارے پر پاؤں پڑ گیا ہو۔ "صبح سے سمجھا رہی ہوں سب کو سب پتہ ہے آپ لوگوں کو اب آ کے پڑی بدل گئے۔"

ستارہ کا جی چاہا کہ زور زور سے رونے لگے اسے اپنی بہن زہرہ پر بھی غصہ آیا کہ ریاض کو سیدھی دعوت دینے کی بجائے اس نے یہ کیوں کہہ دیا کہ سب لوگ بیٹھا جا رہے ہیں۔

"تم نے کیوں کہی یہ بات کہ سب لوگ باہر ہوں گے آج؟" ستارہ زہرہ پر برس پڑی۔

"تو یہ بات اچھی لگتی تھی کہ وہ سب کے سامنے آتے اس زمانے میں جب وہ مجھے پڑھانے آتے کتنی احتیاط کی جاتی تھی میں پڑھتی تو تم ساتھ بٹھائی جاتی تھیں اور اب جب کہ . . . بڑا اچھا لگتا۔" زہرہ ڈر سے شرمندگی کے روہانسی ہو گئی۔

"ہاں اب زہرہ پڑھانے کے لیے شہر کے اس سرے پر جاتی ہے تو وہاں یہاں جیسی پن کھائی رہتی ہیں . . . ہنہ خو وغلو؟" ماموں پھر کبوتر کی طرح گنگنے۔

"مگر میاں رات میں لڑکے کے ساتھ . . . . ." نانی برقعہ سر پر رکھے رکھے دہائی دینے لگیں۔ انہیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ ان کا بیٹا راتوں وغیرہ کے جھنجھٹ سے واقف ہی نہ تھا۔ ماموں پچپن برس کے تھے اور کیا خود نانی کو ان کے سہرے کے پھول کھلانے کا خیال نہ آیا۔ ماموں بے تعلق سے کھڑے رہے۔

"ارے نانی پڑھے لکھے مرد عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔" جمیل نے سمجھایا اور زہرہ کمرے سے ہٹ گئی۔ ستارہ ڈری کہ زہرہ جو بڑی مشکل سے راہ پر آئی ہے پھر نہ بھاگ کھڑی ہو۔

"پھر جناب غور فرمائیے کہ ابھی ریاض کی طرف سے کوئی شادی کا پیغام تو نہیں آیا ابھی کیا پتہ بھجوا اسکول میں انسپکٹر آ گیا

معائنے کو   اب وہ اتنا امیر آدمی ہے   وہ تو میمونہ مر گئیں اس لیے میرے اور ستارہ کے دماغ میں یہ بات آئی۔" جمیل اپنے کندھے پر اپنے ننھے کو سنبھال سنبھال کر قائل کر رہے تھے۔

ستارہ پریشان ہو کر زہرہ کے پاس چلی گئی وہ بخوبی سوچ سکتی تھی کہ آزادی رائے کے اس مرحلے پر زہرہ کیا محسوس کر رہی ہوگی۔

"ارے سارا میک اپ خراب کر لیا" ستارہ نے اپنی بہن کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر پوڈر کا ڈبا اٹھالیا "ہمت کیجئے وہ تم تو جا تی ہو نانی کو۔"

"تم یہیں رک جاؤ ستو۔" زہرہ نے کہا اور بچے آنسو ستارہ کے آنچل سے پونچھوائے۔

"اچھا بس ٹھیک ہے۔" اور ستارہ کو حیرت ہوئی کہ جھگڑا مٹانے کے بیچ اس کی سمجھ میں یہ بات پہلے ہی کیوں نہ آ گئی۔ "آپ لوگ جائیے ہاں مجھے نہیں جانے دیجئیں۔" ستارہ نے وہیں سے آواز لگائی۔

اب نانی کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ ستارہ نے بے حد مغلوبانہ خوشی کے ساتھ نانی کے سپیروں کی قطار سیڑھیوں پر تکتی جو جمیل کے ساتھ آج سینما میں "نورِ اسلام" دیکھنے پر مجبور تھیں۔

"نو بجنے میں پانچ منٹ ہیں" ستارہ نے بے حد لمبی سانس لے کر اعلان کیا اور پھر جلدی سے برش تھام کر دری کو جھاڑ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے پھولدان میں کاغذی سفید گلابوں کو پھر ترتیب دیا۔ زہرہ میں بھی جانے کہاں سے حرکت کرنے کی قوت آ گئی اس نے لکھنے والی میز پر انگریزی ادب کی کتابوں کو نمایاں کر کے رکھا اور بالکونی کے پردے کا نیا ربن جو دروازے پہلے باندھا تھا کھول دیا۔

نو بج گئے تو ستارہ بھاگ کر پوڈر کا ڈبہ پف اٹھا لائی اور زہرہ کے چہرے پر پوڈر کی ہلکی سی بادامی تہہ جمادی پف زہرہ کے چہرے پر رگڑتے ہوئے ستارہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ زہرہ کی جلد پف تلے کھنچی کھنچی جاتی ہے اس کا مدعا وہ کچھ نہ سمجھا تو اس نے زہرہ کے کانوں کے پیچھے سے ایک ایک لہراتی ہوئی زلف نکالی اور گالوں کے پاس منتشر کر کے چھوڑ دی پھر بھی ستارہ کو کچھ الجھن سی محسوس ہوئی تو بھاگ کر اندر آ گئی اور اپنے کمرے سے نیلے شیڈ والا لیمپ اٹھا لائی۔ دیوار کی بتی بجھا کر لیمپ روشن کر دیا۔

اب کمرہ نیلی روشنی میں بہت بھلا لگنے لگا۔ ستارہ کو تو دری بھی نئی سی نظر آئی سفید کاغذی پھول ہلکے نیلے ہو گئے اور زہرہ کا چہرہ تو بڑا ہی پیارا لگنے لگا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ صرف کانپتے میں کیوڑتو ٹو گئیں ہو رہے تھے۔ ستارہ کا دل گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

لونج کے پاس منٹ ہو گئے تو ستارہ نے پوچھا۔

"انہوں نے فون پر اور کیا کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔" زہرہ نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب باجی صاحب ہے دیکھ لینا وہ شرطیہ شادی کا پیغام دیں گے۔"

ستارہ نے اس طرح کہا جیسے وہ خود کو یقین دلا رہی ہو۔ زہرہ کا سنجیدہ چہرہ کچھ نرم سا پڑ گیا۔ اور وہ پلکیں جھکا کر رہ گئی۔

"کافی کا پانی تو ابلنے والا ہوگا اب تم جلدی سے یوں کرو کہ میوے کی پلیٹ اور بسکٹ لا کر یہاں بیچ کی میز پر رکھ دو اور دیکھو بیٹھ کر کھانے کے لیے دو کانٹے بھی لے آؤ۔"

زہرہ ستارہ کی تعمیل حکم کرنے کے خیال سے اٹھی اور پھر دروازے میں ٹھہر گئی۔

"میں کانٹے تو بالکل نہیں دوں گی تاکہ تم نے پڑوسن سے مانگے۔" زہرہ آہستہ سے بولی جیسے اسے ستارہ کے برا مان جانے کا خوف ہو۔

"کیوں؟ اس میں بھی کوئی برائی نکال لی؟" ستارہ پھر جھنجلائی۔ زہرہ ریاض کے استقبال کی تیاری میں کوئی نہ کوئی نئی بات صبح سے کیے جا رہی تھی۔ اور ادھر ستارہ کا یہ عالم کہ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی بہن کے کانوں میں تاروں کے جھمکے اور ماتھے پر چاند کا ٹیکہ پہنا کر اسے کسی محل میں بٹھا دیتی اور پھر ریاض کو بلاتی۔ مگر ستارہ واقف بھی تو تھی یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی بہن کے دل کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتی تھی۔

"ریاض کو ہمارا لکھنؤ والا گھر تو یاد ہوگا۔ ان کا گھر بھی تو ہماری ہی جیسا تھا اب وہ جو چاہیں بن جائیں میرے لیے تو ان کی وہی یادیں ہیں۔ اگر وہ مجھے اس ماحول میں بھی۔ ۔ ۔" زہرہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔

"اس ماحول میں تمہیں؟" ستارہ چونکی "کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں! پہیے گاڑی چھوڑ کر ڈھلان پر لڑھکنے لگے تھے ذرا تم تو جانتی ہو" زہرہ نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔ ..... ستارہ نے محسوس کیا کہ پہلی بار آج پہیے اور گاڑی والی بات کو زہرہ نے اتنے مزے سے دہرایا۔ ۔ ۔ بہت دنوں کی بات تھی کہ ستارہ نے اپنی بہن کو غصے میں ایک ایسی گاڑی سے تشبیہ دی تھی جس کے پہیے اسے چھوڑ کر ڈھلانوں سے اتر گئے ہوں زندگی سے بے تعلق اور اپنے خیالوں میں مست رہنے پر ستارہ اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتی پھر ستارہ یہ بھی تو دیکھتی تھی کہ تائی کراچی آنے کے بعد سے زہرہ کو بے

پھولوں کی کاڑھی سے زیادہ پھولدار تھی جس میں وہ بڑی ہنڈیا ڈولیا سیتے بیٹھی تھیں۔

زہرہ پستہ اور خشک میوے کی پلیٹیں لانے کے بجائے مسکراتی ہوئی بالکونی کے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر دور دور تک پھیلی ہوئی کالونی میں جگمگاتی روشنیوں کو دیکھنے لگیں۔ ۔ ریشمی گلی میں سے ایک موٹر گزری۔ ستارہ جھک کر پیچھے ہٹنے لگی تو زہرہ نے اسے پکڑ لیا۔

"کوئی اور ہوگا۔ ریاض سیدھا اس گھر پر پہنچے گا۔" زہرہ نے بے حد اعتماد سے کہا اور ستارہ پھر اپنی بہن کے اس اعتماد پر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"یہاں گلی میں ہماری بالکونی کو چھوتا ہوا کوئی بڑا سا پیپل ہوتا تو کیسا رہتا؟" زہرہ نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"یہاں بیس سال بعد اتنے بڑے درخت ہوں گے جتنا بڑا پیپل وہاں ہماری گلی میں تھا۔ ۔ ۔ ہائے کیسا گھنا سایہ تھا' ہمارے آدھے آنگن کو ڈھکے ہوئے تھا گرمی کی راتوں میں ذرا ہوا کا جھونکا آتا تو پتوں کی کیسی تالیاں سی بجتیں اور ہمارا آنگن ٹھنڈا رہتا ...... اور یاد ہے باجی' بچپن میں دوپہروں کو کیسا مزا آتا جب پت جھڑ میں پتے گرتے اور ہم تم ان کے کر کرے بچھونے بنا کر لوٹیں لگاتے۔ ۔ نانی کتنا ڈراتی کہ دوپہر کو آنگن میں مت جاؤ' پیپل پر بھوتوں کا بسیرا ہوتا ... مگر تم نے کبھی بھوت دیکھا باجی؟"

ستارہ کو بھی جانے آج کیوں پچھلی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

"ہاں چاندنی راتوں میں میں نے پیپل کے پتوں پر چراغ دیکھے تھے۔" زہرہ اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے آہستہ سے بولی۔

"سچ؟ ہائے پہلے کبھی نہیں بتایا تم نے؟" ستارہ سچ مچ ڈر سی گئی۔

"بتاتی کیسے اس زمانے میں تم چھوٹی تھیں" زہرہ نے جواب دیا۔

"خاک بھی نہیں تم سے دو سال چھوٹی ہمیشہ سے ہوں۔" ستارہ جھٹ بول پڑی۔

"میں نے بھی وہ چراغ کبھی نہیں دیکھے تھے .... ایک دن..... ایک دن ریاض نے کہا تھا۔" زہرہ پھر اسی آہستگی سے بولی جیسے ریشم کے دھاگے سے گرہ کھول رہی ہو!

"کس دن؟" ستارہ نے پوچھا اور کٹہرے پر سے اپنے ہاتھ اٹھا لئے۔

"مایوں والی رات" زہرہ نے دور اندھیرے میں نظریں گم کر دیں۔

"مگر مایوں والی رات تو ہم اتنی بہت سی لڑکیاں تمہیں گھیرے رہیں۔" ستارہ ابھی تک چھوٹی بہن ہی تھی۔ "ریاض تمہیں کب ملے تھے؟"

"وہ آنگن میں کسی سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو معلوم ہوتا ہے پتے پتے پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ چراغ جلتے بجھتے ہیں۔ تمہیں یاد نہیں اس رت پور چاندنی تھی بس جب سے میں نے ہمیشہ چاندنی راتوں میں جنگل پر چراغ دیکھے۔ زہرہ نے اس طرح کہا جیسے وہ ستارہ کے ننھے کو کچھ سمجھا رہی ہو۔

اور ستارہ نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔

"ہائے توبہ بس یہ شاعرانہ بات کی تھی۔ میں بھی بھوتوں والا قصہ ہوگا۔ یہ ریاض تو سدا کے باتونی تھے ارے میں نے کافی کا پانی تو چولہے سے اتارا نہیں.... ..." ستارہ ہڑبڑا کر اندر بھاگی۔

"تو باجی ریاض کو پسند کر رہی ہیں۔" ستارہ نے اندازہ لگایا اور اب وہ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ ریاض خدا کرے باجی کو پسند کر لیں۔ نعیم نے شادی کے بعد باجی کو کیسی نظروں سے گرا دیا کیا سب کے سامنے کہا کہ یہ بھی کوئی عورت ہیں۔ ہائے کیسی بے شرمی کی بات ہے۔ باجی بے چاری تائی کی پوچھ گچھ پر سوائے رونے اور شرمانے کے کیا کہتیں۔ بھی شریف زادیاں ایسی ہوتی ہیں۔ اگر باجی شادی کی رات کو نعیم بھائی کو دیکھ کر شرم سے بے ہوش ہو گئیں تو کیا ہوا؟ چہ کیسے دیوانے تھے نعیم بھائی بھی۔ شادی سے پہلے کیسے مرتے تھے زہرہ باجی کے نام پر اور باجی بھی تو ان کے نام پر سرخ ہو جاتی تھیں مگر شادی کے بعد یوں ذلیل کیں کہ باجی کو حکیموں نے دق بتا دی اچھی محبت تھی کہ دق کا سنتے ہی باجی کے زیوروں کا صندوقچہ لے کر جو رفو چکر ہوئے" کہ باجی کو پہاڑ پر لے جائیں گے) تو پھر آج تک پتہ نہ چلا۔ شاید خود کسی پہاڑ کی کھوہ میں دھونی رما کر بیٹھ گئے" خیر ہوا کہ مہر تو باجی کا طلاق کے تین بول کہنے کی ہمت کہاں تھی ان میں اچھا ہوا۔ پتہ ہو گئے ایسے مرد بھی کس کام کے؟ بے چاری باجی کتنی بدنصیب تھیں۔ لوگوں نے کہا تین سال مرد لاپتہ رہے تو شرعاً طلاق ہو گئی' کتنے پیغام آئے ان کے مگر انہوں نے ہاں نہ کی' وہ تو ریاض کا احسان تھا کہ خاندان کی لڑکیوں کے ساتھ باجی کو بھی تعلیم کی چاٹ لگا گئے تھے ورنہ اگر باجی پڑھنے میں نہ لگ جاتیں تو یا اتنے بہت سے دن کیسے گزرتے اور کراچی آ کر اگر باجی نوکری نہ کر لیتیں تو تائی ماموں اور خود باجی کا کیا بنتا۔ جمیل کی تنخواہ میں میرا ہی گزر مشکل ہوتا ہے بے چارے ماموں عمر بھر ہا کے آسرے رہے۔ اماں جب تک زندہ تھیں دوسری بات تھی۔ وہ تو دنیا میں دو ہی چیزوں کی سب سے زیادہ حفاظت کرتی تھیں ایک تو اپنے جہیز کی پرانی ٹوٹی گھڑی کی جس نے کبھی وقت نہ بتایا۔ دوسرے اپنے بھائی کی جس نے کبھی ایک پیسہ نہ کمایا۔

"اس پر سے تائی کا یہ حال' کتنی آنا کانی کر رہی تھیں آج ریاض کے آنے پر۔" ستارہ نے ٹرے میں کافی دانی سجاتے ہوئے خود کو سنایا اور ٹرے اٹھا کر کمرے میں آ گئی۔

"باجی تم نے دیکھا نانی کی مرضی نہ تھی کہ ریاض آئے تم تو سب پر دم دو اور یہ اتنا بھی نہ چاہیں کہ تم ہو" ستارہ نے لکھنے والی میز پر کاپی کی زرے احتیاط سے رکھتے ہوئے زہرہ سے شکایت کی۔

زہرہ آرام کرسی پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اس نے کوئی جواب نہ دیا ستارہ نے دیکھا کہ وہ کچھ ایسی کیفیت میں تھی جیسے سوتے میں آنکھیں کھلی رہ گئی ہوں۔ ستارہ نے جو اتنے اہتمام سے اس کی زلفیں گالوں پر بکھر رہی تھیں وہ پھر کانوں کے پیچھے پہنچ گئی تھیں اور کاجل کا دنبالہ پھیل گیا تھا۔

"باجی.... باجی.... اللہ تمہاری قسمت پلٹے گا۔" ستارہ کو ایک دم احساس ہوا کہ ساڑھے نو بج چکے ہیں۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو مجھے میں کوئی قسمت کا کٹورا لے کر بھیک مانگنے چلی ہوں ریاض سے؟" زہرہ نے بڑے اجنبی سے غرور کے ساتھ ستارہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ور ستارہ کا جی چاہا کہ رو پڑے۔ اس کی بہن ہمیشہ اس سے الگ ہو کر سوچتی۔

"ہاں میں دعا کر رہی ہوں کہ ریاض... ." ستارہ کی بھی جم گئی۔

"تمہارا ریاض نے یوں والی رات مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا؟" زہرہ پھر یوں مسکرائی جیسے ریشم کے دھاگے کی گرہ کھول لی ہو۔

ستارہ کو ایک دم دھکا سا لگا۔

"تو... تو چھتوں پر چراغ جلنے کی بات انہوں نے تم ہی سے کہی تھی نا... تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی ... میں تمہاری دشمن ہوں۔" ستارہ تقریباً چیخ پڑی۔ ... اتنے عرصے تک یوں اندھیرے میں رہنے پر اسے صدمہ ہوا۔ کراچی آنے سے قبل تک جب نانی زہرہ کا گھر دوبارہ بسنے کی بات کرتیں اور زہرہ انکار کرتی تو نانی چلا کر کہا کرتیں۔ اس کے لیے تو کوئی شہزادہ گلفام آئے گا... مگر اب برسوں سے یہ فقرہ نہیں دہرایا گیا تھا مگر ایک ستارہ ہی تو تھی جو ہمیشہ ہر کنوارے اور رنڈوے مرد کو اس خیال سے دیکھتی کہ یہ باجی کے لیے کیسا رہے گا...... پھر جب دو دن قبل ریاض اور جمیل کی ملاقات اچانک کہیں راستے میں ہو گئی تو یہ ستارہ ہی تھی جسے ریاض اور زہرہ کی جوڑی بنانے کا خیال سوجھا اور گھر میں سب کو اسی نقطہ نظر سے سوچنے پر مجبور کر دیا پھر اسی نے زہرہ کی ریاض سے فون پر بات کرائی اور یوں سے گھر بلوایا.... اس سب قصے میں زہرہ نے اس بات کی ستارہ کو ہوا تک نہ لگنے دی کہ تم سے شادی سے پہلے ہی ریاض سے وعدے ہو چکے تھے۔

ستارہ زہرہ نے بے حد خیر گی وہ اچانک بے دلی سے کرسی پر بیٹھ گئی جیسے اب سے کسی بات سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

زہرہ جو ابھی لہر بھر پہلے ... وہ میں گرتے ہوئے سوکھے پتے کی طرح چرمرا کر سر بلند ہو گئی تھی اب پھر اسی کی طرح پرسکون ہو گئی۔

"میں تمہیں کیا کیا بتاتی میری ستو تمہیں یاد ہے اسی دن مجھے زرد کپڑے پہنائے گئے تھے اور تم سب نے میرے ہاتھ پیروں پر مہندی لگائی تھی رات کتنی دیر تک ڈھولک بجی تھی۔ تم سب نعیم کا نام لے کر مجھے چھیڑ رہی تھیں اور مجھے لگتا کہ تم سب ریاض کا نام لے رہی ہو میں اس رات جیسے ریاض کی دلہن بن گئی تھی۔" زہرہ جیسے پھر خواب میں بول رہی تھی۔

"اچھا تم نے اس لیے ریاض کے بچوں کو اپنے مایوں والے کونے میں ڈھاپنا کر سلا دیا تھا تاکہ منحوس رات رک جائے اور اسی طرح ریاض بھی" ستارہ کو وہ لکڑی کے منقش ستونوں اور کٹاؤ دار محرابوں والا دالان یاد آ گیا۔ جہاں ایک کونے میں پردہ ڈال کر زہرہ کو مایوں بٹھایا گیا تھا ...... لیکن وہ پردے اور اس کے بعد برآمدے کے دروں پر پڑے ہوئے موٹے ٹاٹ کے پردے بھی اس کی بہن کو اندر نہ روک سکے۔

"جب تم سب سو گئے میں چپکے سے باہر آنگن میں آ گئی... .. میں پیپل کے اندھیرے سائے تلے بیٹھی رہی دیواروں پر اس کی برقی چاندنی تھی ستو کہ رگ رگ میں اتر جائے۔" زہرہ کہتی رہی۔

(ستارہ کے جسم میں تھرتھری سی آ گئی یہ وہ بہن تھی جسے وہ اپنی گاڑی کہا کرتی جس کے پیچھے سے چھوڑ کر ڈھلانوں سے اتر گئے ہوں)

"میں چپ چاپ بیٹھی رہی دھڑکتی رہی ستو" زہرہ کہے گئی۔

"ہاں اس رات سردی بہت تھی۔" ستارہ نے جیسے کوئی شے اپنے پہلو سے دھکیلنا چاہی۔ آخر ستارہ چھوٹی بہن بھی تو تھی۔

"مجھے سردی بالکل نہ لگی میں تو تپ رہی تھی مگر ریاض نے مجھ سے کچھ نہ مانگا۔ میرے قریب بیٹھ مجھے دیکھتا رہا۔ ستو اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میں بہت حسین ہوں۔ ایسی خوبصورتی جسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا' مگر میرا جی چاہا کہ یہ فاصلہ ٹوٹ جائے مگر وہ فاصلہ نہ ٹوٹا ..... پھر جب نعیم نے وہ فاصلہ سمیٹنا چاہا تو . . . . تم سمجھ گئی نا..... نعیم تھک کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اس رات ریاض نے ایک ہی بات کی تھی۔ ایک ہی وعدہ لیا تھا۔" زہرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ریاض نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں نعیم سے محبت کروں گی۔" زہرہ نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

"اور تم نے وعدہ کیا تھا؟" ستارہ نے بمشکل حلق سے آواز نکالی۔

"میں نے اس سے کہا تو تھا مگر مجھے تو یوں لگا جیسے میں نے یہ ریاض سے ہی محبت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔" زہرہ نے اپنے سر کو کرسی کی پشت پر یوں احتیاط سے ٹکایا جیسے وہ کانچ کا بنا ہوا ہو۔ ستارہ نے اس لمحے اپنی بہن کو اتنا خوبصورت لیکن اتنا بے بس

دیکھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں۔

"تو پھر باجی! جب ریاض کا قصہ چل رہا تھا تو تم نے نعیم کو کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ ریاض نے تمہیں کوئی سوال بھی پڑھایا تھا؟" ستارہ نے تنی نرم اور مدھم آواز میں پوچھا جیسے اسے کسی کی نیند ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔

"مجھے ریاض سے کبھی محبت نہیں تھی ستو! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں" زہرہ نے بیماروں کی طرح اٹھ کر اپنا سر کرسی کی پشت پر ادھر ادھر ڈھلکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "یہ تو یوں وہی رت ہے دو دن پہلے کی بات ہے تمہیں یاد نہیں کہ تم پڑھائی کے دوران میں ہنس کر بول پڑی تھیں کہ اب تمہیں نعیم بھائی پڑھایا کریں گے۔ مجھے ایسے مذاق ہمیشہ برے لگتے تھے یوں لگتا کہ دو آدمی ہاتھ پکڑے جا رہے ہوں اور کوئی بیچ میں سے کندھا مار کر گزر جائے...... میں اس مذاق پر رو پڑی تھی نا؟" زہرہ یاد دلانے لگی۔

"ہاں تمہیں تو میری باتیں ہمیشہ بری لگتیں۔" ستارہ برا مان کر بڑبڑائی۔

مگر زہرہ تو اس وقت دور بہہ رہی تھی۔

"تمہیں ماموں نے آواز دی تھی نا۔۔ جب تم چلی گئیں میں گھٹنے پر ماتھا رکھے روتی رہی۔ ... تب... تب ریاض نے میرا سر آہستگی سے اٹھایا اور پوچھا تم کیوں رو رہی ہو؟ تب تک گاڑی سیدھی پٹڑی پر جا رہی تھی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھے لگا میرے اور ریاض کے بیچ میں جو تھوڑا فاصلہ ہے اس کے اس پار میری روح میرا جسم ایک دم چھتری کی طرح بند ہو کر سمٹ گیا ہے۔ تم نے بہتے پانی میں کبھی ہاتھ ڈالے ہیں؟" "تم کچھ ڈوبنے ابھرنے کی کیفیت کو جانتی ہو؟" اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تو اسی کے لیے رو رہی تھی۔"

"پھر۔۔ ؟" ستارہ کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے قریب جیسے کوئی بلی کوئی گدگدی سی شے لگ کر بیٹھ گئی ہے۔

"پھر تم آ گئی تھیں نا" زہرہ نے جیسے شکایت کی۔

"اب تو وہ آ گئے بیمونہ مر گئی۔" ستارہ میمونہ کا نام لیتے ہوئے تلخ سی ہو گئی اور اس تلخی کو محسوس کر کے وہ بالکونی میں چلی گئی اسے ایک عجیب سی کوفت ہو رہی تھی۔ دو دن سے وہ زہرہ اور ریاض کی جوڑی ملانے کے جو پتے وہ کر رہی تھی زہرہ نے اس سب کو یوں بگاڑ ڈالا۔ جیسے کوئی کسی اندھے کے پھیلے ہاتھ پر روپیہ رکھے اور اندھا کہے یہ تو کھوٹا ہے۔

"اگر ریاض نہ آئے تو" ستارہ کے دل میں یہ خیال عجیب انداز سے ابھرا اور پھر جب اس نے زہرہ کی دبی دبی سسکیاں سنیں تو کمرے میں ایک بھوری دھن کی طرح لوٹ آئی۔

"ارے تم نے تو سارا چہرہ خراب کر دیا۔" وہ بھاگ کر پاؤڈر کا ڈبہ اٹھا لائی زہرہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"وہ مجھے برسوں پہلے پسند کر چکا ۔ مجھے یقین ہے۔" زہرہ نے جیسے خود کو یقین دلانا چاہا۔

تو میں کب کہتی ہوں کہ اب پسند کرواؤ گی" ستارہ نے زبردستی اس کا چہرہ اٹھا کر پاؤڈر کی تہہ جمانا چاہی مگر زہرہ نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور روتی رہی۔

دس بج گئے۔ زہرہ اور ستارہ نے بیک وقت پرانے کلاک کی ٹن ٹن پر ادھر دیکھا اور زہرہ نے آنسو پونچھ لیے۔

"میں اس سے کیسے مل سکوں گی۔" زہرہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آنسو پونچھے اور ستارہ کو احساس ہوا کہ اگر ریاض نہ آیا تو اس کی بہن پاگل ہو جائے گی۔

"میوزن۔" پڑوس کی بالکنی سے ملی دھم سے ان کی بالکنی میں کودی مگر دونوں بہنوں میں سے کسی کو ماموں کی ہدایت کا خیال نہ آیا پھر ریڈیو تو ماموں رورہ کے سپرد کر گئے تھے ستارہ کو حق تھا کہ وہ ریاض کے بارے میں سوچنے لگے۔ ریاض جس کے لیے اس کی بہن رو رہی تھی وہ جو اس زمانے میں بھی تین بچوں کا باپ تھا اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود جس کے تینوں بچوں کے سرخ تھنے ہمیشہ بہتے رہتے وہ ریاض جس کی بیوی میمونہ جاہل تھی مگر وہ خود تعلیم نسواں کا زبردست حامی تھا اور خاندان کی لڑکیوں کو ہمیشہ پڑھنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ وہ جو اس کی زہرہ باجی کو بھی پڑھانے آتا۔ ماسٹر لکھنوی کرتے پجامے میں ملبوس ہمیشہ بڑا اس سنگار چا اور لڑکیوں سے بڑی شفقت سے بولتا کہ کسی کی ہمت اس کے سامنے شرمانے لجانے کی نہ پڑتی اور روہ جس پر مرتی تھی اور جو زہرہ کو تعلیم سے محبت کرنے کی ہدایت کر کے جنوبی افریقہ چلا گیا تھا۔

وہ ستارہ اب جس کی موٹر رکنے کی آواز سن رہی تھی اور جس کے لیے زہرہ اب اپنے ہاتھوں سے جلدی جلدی اپنے چہرے پر پاؤڈر لگا رہی تھی۔

زینے پر بھاری بھاری قدموں کی آواز سنتی ہوئی ستارہ جیسے غنودگی کے سے عالم میں دوسرے کمرے میں چلی گئی..... اور پھر اس کمرے سے پچھلے کمرے میں جہاں وہ جمیل اور اپنے ننھے کے ساتھ رات گزارا کرتی تھی۔ وہاں سے نکل کر سامان کی چھوٹی سی کوٹھری میں آ گئی جیسے وہ اپنے اس ارمان کو کسی اور کمرے میں چھوڑ کر دھوکے سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ وہ بھی ریاض کے پاس بیٹھ سکتی۔

ستارہ سامان والے چھوٹے سے کمرے میں ماموں میاں کے پھٹے ہوئے بستر پر بیٹھی رہی۔ یہاں امسی تھی اور کان کے پاس بار

بار بھر بھنکتا رہے تھے۔ ایک دم اس اندھیرے میں اسے یہ ساری صورت حال مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ تو ادھر اس کی بہن زہرہ اور ریاض ہیں۔ "نور اسلام" دیکھتے ہوئے نانی کی یہ بات جانتی ہیں۔ ۔ ماموں بھی کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھے چائے کی ہر پیالی کے بعد مطلع صاف ہونے کے انتظار میں ہوں گے اور انہیں یقین ہوگا کہ زہرہ کبوتروں کی کابک کے پاس بیٹھی اپنی شادی کی شرائط طے کر رہی ہوگی۔ اور جمیل سوچتے ہوں گا کہ جانے بے چاری زہرہ ریاض جیسے امیر آدمی کو لبھا بھی سکے یا نہیں؟ ستارہ اندھیرے میں طنزاً ہنسی۔ ۔ ۔ "زہرہ ادھر کیا کر رہی ہوگی؟" اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر سوچا اور اسے یاد آیا کہ زہرہ بچپن میں بھی اپنے حصے کی مٹھائی اور کپڑا چھپا کر رکھ دیا کرتی تھی۔ جب ستارہ اپنے حصے کی مٹھائی ہضم کر جاتی اور کپڑا پہن کر میلا بھی کر دیتی جب زہرہ کہیں سے اپنی چیزیں نکال لاتی۔

"ارے" ستارہ ہکا بکا رہ جاتی۔

"میں رکھ چھوڑتی ہوں" زہرہ جواب دیا کرتی۔

سو آج زہرہ نے اپنی پٹاری میں سے کچھ نکال کر چکرا دیا۔ حتیٰ کہ میمونہ کے میاں تک کو اپنی پٹاری میں بند رکھا اور زمانے بھر سے ہمدردیاں وصول کرتی رہی۔

ستارہ نے ماموں کا بستر بکس پر سے گرا لیا اور اس پر سر ٹکا کر لیٹ گئی کہ گر اس نے بیٹھے بیٹھے زہرہ اور ریاض کے بارے میں سوچا تو وہ گر پڑے گی۔

"وہ کتنا وقت ہو گیا جیسے تنکے کو ٹھوڑے اٹھائے میری ہی خاطر تو نانی کے پہلو میں بیٹھے (نور اسلام) دیکھ رہے ہوں گے "صبح کالج کیسے جائیں گے وقت پر ۔ اور ریاض کو بھی تو اتنی دور جانا ہے..... اور جمیل... ۔ "

ستارہ کے ذہن میں ایک بھنور سا پیدا ہو گیا جو چیز بھی اس میں پڑتی چکرانے لگتی

وہ دن بھر میں بہت تھک گئی تھی

اندھیرے میں ستارہ نے اپنا ہاتھ ٹھنڈے فرش پر پھیلا دیا اور پھر اس نے فرش پر اپنی انگلیوں کو عجیب انداز سے مروڑ جیسے ناز کر رہی ہو اسے لگا کہ اس کی انگلیاں بڑی خوبصورت ہیں اس نے آہستہ بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔ مگر یہ ہونٹ اس کے اپنے نہ تھے پھر وہ ہاتھ سینے پر گر گیا سینہ اس کا تھا مگر ہاتھ اس کے نہ رہے وہ کنوارپنے کی اس آسیب بھری دنیا

دراصل وہ دن بھر کے کاموں اور مشقت سے تھک گئی تھی

وہ دھیرے دھیرے نیند کے بھنور میں ڈوب گئی   پھر اس نے خواب دیکھا کہ وہ بے لکھنؤ والے پرانے گھر میں ہے اور جھولی تلے بیٹھی رو رہی ہے۔ ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی تو دیکھا زہرہ دروازے کی چوکھٹ سے لگی سسکیاں بھر رہی ہے اور کمرے میں روشنی ہے۔

"کیا ہوا باجی؟" ستارہ کو اپنے لہجے کے اشتیاق پر خود شرم آ گئی اسے لگا کہ وہ بھی بڑی بیوی منذی کی طرح ہو گئی ہے جنہوں نے شادی کی صبح اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھنا چاہی تھیں۔

"کچھ نہیں، میں اب شادی نہیں کر سکتی' کسی سے بھی نہیں۔" زہرہ سسکتے ہوئے بہ مشکل بولی اور ستارہ کا دل خوف سے کھو گیا۔

"تو کیا ریاض نے۔ ۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ ۔" ستارہ ایک دم ذمہ دار قسم کی بہن بن گئی۔ "مجھے بتاؤ کیا ہوا' میں اسے گولی مار دوں گی خدا کی قسم۔" ستارہ کا خون کھول گیا۔

مگر زہرہ نے اسے کچھ نہ بتایا۔ بلکہ وہ یوں ہی سسکتی ہوئی اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

ماموں کے دروازے کھٹکھٹانے پر ستارہ نیلی روشنی اور تمباکو کی بو سے بسے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ ۔ ۔ ستارہ نے سوچا کہ اب اسے ریاض کے بارے میں سوالات کے جواب دینا ہوں گے اور اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"کل تو نہیں آئی تھی؟" ماموں نے پہلا سوال کیا' ستارہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آں کبوتر تو نہیں لے گئی۔" ماموں نے آنکھوں پھاڑ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں" ستارہ نے بے تعلقی سے کہا اور ماموں گھبرا کر بالکنی میں چلے گئے۔ ستارہ نے نیک بھانجیوں کی طرح ان کا پھٹا ہوا بستر اٹھا کر بالکنی میں چلے گئے۔

ستارہ کی سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کرے' پھر وہ زہرہ کے کمرے میں آ گئی۔ وہ یوں آنکھیں بند کیے پڑی تھی جیسے اس کے سارے کبوتر کھا گئی ہو۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی باجی" ستارہ اس کے پاس آ بیٹھ گئی۔

"میں شادی نہیں کر سکتی" زہرہ بیچ کر تی اور پھر کروٹ بدلی۔

ستارہ نے زہرہ کی نقاہت میں یک عجیب سا حسن دیکھا ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی پھر اسے اچانک زہرہ سے نفرت ہو گئی شاید اس نے پھر بڑی بیماری میں کچھ جینت کر رکھ دیا۔

''جہنم میں جاؤ'' ستارہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور جھٹکے سے اٹھ کر نیلی روشنی میں ڈوبے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ کرسیوں پر سے کشن اٹھا کر دری پر پھینکے اور اوندھی پڑ گئی۔ جب جمیل اور تانی آئیں تو وہ سو رہی تھی مگر صبح کو وہ جاگی تو تانی اور جمیل نے مارے سوالات کے اس کا ناک میں دم کر دیا۔

''مجھے نہیں معلوم بس وہ آیا اور چلا گیا باجی کہتی ہیں کہ وہ شادی نہیں کر سکتیں۔'' ستارہ نے یک ہی جواب دیا۔

''وہی تو میں کہوں شریف زادیاں کہیں ایک مرد کی صورت دیکھ کر دوسرے کا منہ دیکھتی ہیں۔'' تانی نے ان دونوں کے اندر چلی اطمینان کی سانس لی۔ ستارہ انہیں یقین دلائے جاتی تھی کہ وہ دونوں ضرور ایک دوسرے کو پسند کریں گے وہی شکل وہی ست گو، چست۔

ور ستارہ کا جی چاہا شریف زادیوں کے تصور کے سلسلے میں گالیاں بکنے لگے۔ .... گالی نہ بک سکی اس لیے بے وجہ ہی وہ تانی سے لڑ پڑی کہ میرے ڈوپٹے میں کھونچ لگا رکھی ہیں۔ حالانکہ دوپٹہ پہلے سے پھٹا ہوا تھا۔

''ریاض کے پاس دولت ہو گئی ہے نا' وہ باجی کو کیسے پسند کر سکتا تھا باجی کے سامنے نہ کہنا بے چاری'' جمیل نے فیصلہ دیا اور ستارہ اس سے بھی بے تحاشہ لڑ پڑی

''بڑے آئے بے چاری کہنے والے۔'' مگر وہ کسی کا منہ کیسے بند کرتی وہ خود کچھ نہیں جانتی تھی۔ زہرہ صبح صبح اسکول جا چکی تھی۔ ستارہ سب سے ناراض' زندگی سے بیزار اور اپنے آپ کو لیے تمام دن پتہ نہیں کب کب کی سہیلیوں کے گھروں میں گھومتی پھرتی اس کا غصہ کم و پیش ویسا تھا' جو روٹھ کر ہمیشہ گھر سے بھاگتا ہے۔ وہ اپنی بہن سے ناراض تھی وراس طرح وہ بجی کو پریشان کر رہی تھی۔

رات آٹھ بجے وہ گھر لوٹی تو جمیل اس ڈھونڈنے نکل چکا تھا وہ جانتا تھا کہ جب ستارہ سب سے لڑتی تو اسے سہیلیوں کی یاد ستانے لگتی ہے۔

''کھانا کھا لو'' تانی نے خوشامد سے نخرے کو اٹھالیا وہ بے چاری سمجھ رہی تھیں کہ ستارہ دوپٹہ پھٹ جانے کی وجہ سے ناراض ہے۔

''ستو! یہ کیا حرکت تھی' جمیل بے چارہ شام سے پریشان ہے۔'' زہرہ اپنی مخصوص مدھم چال سے اس کے قریب آ گئی مگر اس نے زہرہ کا نوٹس بھی نہ لیا۔

''تم مجھ سے ناراض ہو؟'' زہرہ نے بڑے درد کے ساتھ سوال کیا۔

''میں تمہاری کون لگتی ہوں۔ کو حق پہ ناراض ہوں گی۔'' ستارہ نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا اور بالکنی میں نکل آ گئی۔

"کھانا تھا' کوڑی پہ پہ کوری سے کر کھیارے کو دی' اس نے مجھ کو گھاس دی' گھاس میں نے گیا کو دی' گیا نے دودھ دیا' دودھ کی میں نے کھیر پکائی' بیا آئی کھا گئی" تائی لہک لہک کر ستارہ کے ننھے کو اپنے پیروں میں بٹھائے جھلا رہی تھیں۔

ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کو بھی اپنی ساری محنت کا یہی انجام معلوم ہوا۔ بلی آئی اور کھیر کھا گئی۔

"تم جمیل کا انتظار کر رہی ہو؟" زہرہ نے اس کے قریب آ کر بالکنی کے کٹہرے پر کہنیاں جمالیں۔

ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کل اس وقت مجھے بھی انتظار تھا۔ مگر وہ نہ آیا ستو! مجھ پر غصہ کرنے کی بجائے .....

ستارہ کو لگا کہ وہ حیرت کے جھٹکے سے نیچے گر پڑے گی۔ وہ ایک دھچکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلیاں بالکنی کے کٹہرے میں پیوست کر دیں۔

"ہائے اللہ وہ کون تھا رات کو؟" ستارہ کو اپنی بہن کوئی الف لیلوی کردار معلوم ہوئی۔

"میں اسے نہیں جانتی" زہرہ نے دھیرے سے کہا' ستارہ دم بخود رہ گئی۔ "اس نے یوں مزے سے لے کر چیزیں کھائیں اور ساری کافی پی گیا' جیسے یہ بہت اہم کام ہوتا ہے پھر وہ آج کل کے نوجوانوں کے لیے ہر پیشے میں مقابلے کی دوڑ کی وجہ سے پریشان ہوتا رہا۔ اسے اپنے بیٹوں کی بڑی فکر تھی چلنے سے پہلے وہ بڑی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

"اور تم نے مجھے بھی نہ بتایا" ستارہ اس خیال سے کانپ گئی۔

"میں تو اس لمحے کے انتظار میں ہی رہی جو پندرہ سال پہلے میری زندگی میں بلی کی طرح دبے پاؤں آیا تھا۔ میں نے سر جھکا رکھا تھا اور میں رو بھی رہی تھی . . اس نے میرا سر بھی نہ اٹھایا بس مجھ سے لپٹ گیا بالکل نعیم کی طرح.... میری روح میں کوئی کنول سا بند ہو سکتا . اس نے کہا میں اس کو قبول کر لوں. . . اور میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔" زہرہ نے گملے میں سوکھتی ہوئی موتی بیل کا ایک پتہ مٹھی میں لے کر چرمر کر دیا اور ستارہ جو اتنی دیر سے انگاروں پر پاؤں دھرتی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی ساکت رہ گئی۔ "تمہاری گنگ جو میرے ہونٹوں پر اب تک سوکھ رہی تو پتہ ستو! اس کے چہرے کی کھال تک پھڑک رہی تھی' وہ مجھے بالکل منتظر بے چارہ میمونہ کا میاں۔ ہاں وہ میمونہ کا میاں ہی تھا۔ زہرہ نے ستارہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور پھر آنسوؤں سے بھری آنکھوں پر کانپتے ہوئے ہاتھ رکھ لیے۔

ستارہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

نانی نے کو اب وہ کہانی سنا رہی تھیں جو وہ اپنی تین پشتوں کو بار ہا سنا چکی تھیں۔

"تو پھر بیچ بیچاری شہزادی کو بھی نیند آنے لگی ۔ ایک مچھر کھٹ.. جس پر شہزادہ سو رہا تھا بس تو شہزادی نے کیا کیا کہ بیچ میں تکیہ لگوا دھر لی۔ ادھر شہزادہ ادھر شہزادی ——"

اچانک ستارہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ گلی میں جمیل تیز تیز آ رہا تھا تمباکو کی بو ستارہ کے حواس پر چھا گئی اور وہ زہرہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ سسکیاں لینے لگی —— .. اللہ بیقا سے .... بیقا سے!

◆◆◆

نئے اور پرانے

حکیم رحمت اللہ نے برخاستگی کا کاغذ جیب میں ٹھونسا اور یوں ایک لمبی سانس لی جیسے بڑی کشمکش سے نجات مل گئی ہو۔ پھر ادھر ادھر دیکھے بغیر اس پبلشنگ ادارے کے دفتر کا زینہ بڑی تیزی سے اتر گئے جہاں وہ مطبوعات کی نگرانی کرتے اور انہیں پریس میں بھیجنے سے قبل محض اپنے شوق سے ان کی تصحیح بھی کیا کرتے تھے۔ مگر آج وہ یوں سر اٹھا کر نکلے جیسے انہوں نے خود ہی چھٹی کر لی ہو۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا اور ملک کے اندر دبا ہوا غصہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ریلیں الٹی جا رہی تھیں انگریزی ٹوپیاں سر راہ جلائی جا رہی تھیں اور منظر تھا کہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں پھیلائے اینڈ رہا تھا۔ ... اور لندن تو گویا اس کے پائنتی بیٹھا ہوا حقہ بھر رہا تھا جو بات بے بات پر بموں کے چانٹے کھائے جاتا تھا۔ اس دلچسپ صورت حال نے اگر نہیں گدگدایا اور انہوں نے لندن کو مستقبل قریب میں گدھوں اور الوؤں کا مسکن سمجھ کر قافیہ پیمائی کر ڈالی اور ان اشعار کو اپنے دفتر کے ساتھیوں کو سنا ڈالا تو ایسا کون سا تعجب تھا۔ برخاستگی کے کاغذ میں پبلشنگ ادارے کے سابق فدائی مالک نے اس بات کا حوالہ دیا تھا .. گویا حکیم رحمت نے اسے تو یہ اشعار سنائے نہیں تھے؟ اس وقت اس نے کتنی داد دی تھی. . . آخر تو وہ پرانے ساتھی تھے۔ اس سے کیا کہ حکیم رحمت اب اس کے ادارے میں محض ایک ملازم تھے۔ خود حکیم رحمت تو کبھی اس احساس میں مبتلا نہ ہوئے کہ وہ اس کے نوکر ہیں۔ تنخواہ تو وہ نذرانہ سمجھ کر قبول کرتے تھے . مالک نے انہیں نوکر رکھتے وقت تنخواہ کے لیے یہی لفظ تو استعمال کیا تھا۔ حکیم رحمت نے سڑک پر آ کر ایک بار پھر اپنی جیب میں اس کاغذ کو ٹٹولا جس میں ایک زمانے کے ساتھی نے بے حد شستہ سرکاری زبان میں انہیں برخاست کیا تھا۔

حکیم رحمت نے بغیر کسی خواہش کے زمین پر تھوک دیا۔ "سالا بزدل" وہ بڑبڑائے اور سر اٹھا کر سڑک پر چلنے لگے۔ سارا کے ساتھ ہی انہیں اپنے سالے ننھے میاں کا خیال آیا جو انہی کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ارے وہ ننھے میاں سے تو یہ قصہ کہہ ہی نہ سکے۔ خیر کبھی پتہ چل ہی جائے گا۔

انہوں نے ایک بار پھر اطمینان کی لمبی سانس لی۔ یوں جیسے کسی دائم المریض کو دفن کر آئے ہوں . جیب میں تنخواہ کے دس دس کے چند نوٹ تھے جو مالک نے بڑے احساس دھر کر لفافے میں ساتھ بھیجے تھے۔ ہاتھ میں پرانا بید تھا جسے وہ قدم اٹھاتے ہوئے ایک

خاص انداز سے بکنے اور اقرار کر لینے اور پھر بکنے کے عادی تھے۔

"کوئی بات نہیں ... ہم بھی لاکھوں مجاہدوں میں سے ایک تھے مگر آزادی کے بعد دیکھیں گے ایسے سا ہوں کو ... آج اونچی قیمت لگا لیں اپنی آزادی کے بعد کوئی بھی کوڑی کو نہ پوچھے گا ... ہلکہ صاحب ایسے غداروں پر مقدمے چلیں گے۔"

حکیم رحمت نے نوکری سے جواب پانے ہی سوچ لیا تھا ... اور اب ان کا ذہن وسیع اور عریض پارک کی طرح صاف تھا۔ جس کی ایک بنچ پر وہ بیٹھے سڑکوں پر آتے جاتے تانگے کے موڑیں اور دوڑیں دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹے سے چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر یک ٹھلنے والے کے ساتھ سڑکوں پر آوارہ گردی کچھ اس جوش و خروش سے کرتے رہے جیسے یہی زندگی کا حاصل ہو۔ اس دوران میں انہوں نے بیوی کے لیے پانوں کی ایک ڈھولی خریدی اور بچوں کے لیے تھوڑی سی مٹھائی ... جیب سے پیسے نکالتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ یہ آخری تنخواہ ہے۔ اور ان کے ہاتھ کانپ گئے۔

سورج ڈھل رہا تھا جب وہ اپنی مخصوص رفتار سے اپنے گھر کی طرف چلے۔ مگر ان کے ذہن میں ایک خوف سا ابھرا بالکل وہی خوف جب مولوی صاحب کے گھر درس کے لیے جانے کے بجائے کھیتوں اور آم کے باغوں میں گھومتے رہنے کے بعد گھر جاتے ہوئے محسوس ہوتا تھا

"یہ نوکری بیشہ سے تو نہ تھی۔" انہوں نے خود کو سمجھایا۔ پھر ایسے خون گرمانے والے زمانے میں ہر صاحب ہوش اپنا کچھ نہ کچھ حصہ تو ادا ہی کرتا ہے۔

خلافت تحریک کے وقتوں میں تو انہوں نے اپنی ساری زرعی زمین چندے میں دے دی تھی

انہوں نے اپنی گلی کے نکڑ تک پہنچتے پہنچتے سوچا اور مضبوط کیا ... پھر بھی وہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے ...... ان کی رفتار خود بخود سست ہو گئی ..... گلی میں محلے کے چند بچے ایک پرانے ٹوٹے ہیٹ کے فٹ بال بنائے ہوئے تھے ... دوسری ٹیم سڑک کے اس پار تھی۔ ہیٹ کبھی ادھر جاتا اور کبھی ادھر ... کئی بار تانگوں یکوں تلے آ کر چرمرایا ...... حکیم رحمت نے ایک لمحے دیکھا۔ شان سے گوروں سے بھری ایک ٹرک سڑک سے گزر گئی۔ اور پھر جانے انہیں کیا سوجھی۔ پانوں کی ڈھولی اور مٹھائی کا دونا سینے سے لپٹائے لپٹائے انہوں نے بھی پرانے ہیٹ پر ٹھوکریں لگانا شروع کر دیں بچے لگے تالیاں پیٹنے دوسرے لمحے وہ بچوں کو ہیٹ کی سیاسی حیثیت چیخ چیخ کر بتانے لگے چند دوکاندار ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور حکیم

رحمت کی رگوں میں خون جیسے آتش بازی کے اناروں کی طرح ابلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ گوروں کی ٹولی اور ٹرک گزرتی' ان کا چھوٹا بیٹا ممی کی ہاتھ میں خمیرہ مروارید کی شیشی لیے سڑک سے گلی میں آیا۔

"ابا میاں . . اماں تو مر گئے . خون جلی ہوئی بارود کی طرح رگوں میں بجھ کر جیسے بکھر گیا "تو ننھے میاں نے خبر پہنچا دی۔ .. اور وہ برداشت نہ کر سکیں...." حکیم رحمت نے گھر کی طرف تیر کی طرح جاتے ہوئے سوچا

"اماں نے کہا...... میں مری. .... اور پھر مر گئیں......" ممی کی ن کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے رو رو کر سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔

ممی سے پہلے حکیم رحمت نے گھر کی ڈیوڑھی پار کی اور لکڑی کی دہلیز پر جیسے ن کے قدم جم گئے۔ آنگن میں ان کی بیوی پلنگ پر دو دو کی وڑھے پڑی تھیں. . .. .. مکرم اور رشدہ شانہ پشانہ ان پر جھکے ہوئے تھے۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے ایک دوسرے کو تو اس عالم میں بھی؟" حکیم رحمت کے دماغ میں یہ سوال دھاڑا۔ دھوں سے سڑک پر گولی چلی۔ تو انہیں یہ لگا کہ یہ گولی انہیں کے ہاتھ سے چلی ہے؟

ن کے سامنے ننھے میاں بیز رصورت بنائے صحن کے سائبان تلے چولہے کے پاس مونڈھے چائے پی رہے تھے۔

"اور یہ مر گئیں.. مگر ہر ایک اپنے اپنے شوق میں مبتلا ہے۔" دکھ کی ایک لہر سی اٹھی اور کنپٹیوں میں بس کر رہ گئی۔ آنکھیں بھیگ گئیں دنیا کی بے ثباتی سامنے تھی۔ اور جرم کا احساس گھٹ گیا تھا۔ بلکہ وہ احساس جیسے انہوں نے دوسروں میں بھی بانٹ دیا تھا۔

"وہاں کیا کھڑے ہیں؟" آپ کا چسکا تو پورا ہو گیا۔ مگر آپا بے چاری کو دکھ جھیلنے کا چسکا نہ پڑ سکا .. ..." ننھے میاں نے حکیم رحمت کو دیکھ کر طنز بھری آواز میں کہا۔ اور چائے کی پیالی اس طرح زمین پر رکھی جیسے چائے پینے کو ہرگز ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا

حکیم رحمت کی آمد نے ہر ایک کو چونکا دیا.... برآمدے میں پلنگوں اور تختوں پر بیٹھے ہوئے دو اس لڑکے. . .. چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی ننھے میاں کی دلہن۔ مکرم اور راشدہ..... سب نے ڈیوڑھی کی طرف. ... حکیم رحمت نے زندگی میں ایک بار پھر اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا. . . ن کے قدم نہ اٹھے۔

"آہ . . . اللہ کا شکر ہے. . . " دو دو کی کو بھی حرکت ہوئی اور بیوی کا سر ان کی طرف گھوم گیا۔ اور حکیم رحمت جیسے کھنچ کر بیوی تک آ گئے۔ اور پھر یوں ہٹ گئے جیسے کسی نے دھکا دے دیا ہو۔

"تم . . . تم اچھی تو ہو " حکیم رحمت نے بیوی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کہا۔ اور ہر طرف دیکھا. سب

انہیں دیکھ رہے تھے بیوی کو پیار دیکھنے کی خوشی گیس بھرے غبارے کی طرح پھٹ کر ذہن میں بکھر گئی

یہ سب مجھ پر کیا جتانا چاہتے ہیں؟ انہوں نے سب پر نظر دوڑائی۔ صرف مکرم نہیں دیکھ رہا تھا۔ .. اس سے نہیں خوشی کے بجائے پھر صدمہ پہنچا وہ تو ان انتہائی طنز بھرے ماحول میں بھی راشدہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کی۔" وہ غصے سے چلائے۔ "اپنی اماں کو خمیرہ مروارید کھلا دے.." اور پھر وہ کپڑے بدلنے کے لیے کوٹھری میں گھس گئے۔

مگر انہوں نے شیروانی تک نہ اتاری.... بس یوں ہی جھٹکے کے مارے مبہوت سے کھڑے ہو گئے.. ... اندھیری کوٹھری کی شورہ لگی ٹھنڈی دیوار سے پیٹھ لگا کر انہوں نے اس اذیت کو محسوس کیا جو سینے میں چھرا گھونپے جانے سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان کے سامنے بہت سارے چہرے تھے۔ اپنے بچوں اور بیوی کے چہرے۔ ننھے میاں اور ان کی دلہن کے چہرے .... مکرم اور راشدہ کے چہرے.... اور پھر پبلشنگ ادارے کے مالک کا چہرہ .... ان میں سے ہر چہرہ جیسے چپکے چپکے پیچھے جاتا۔ اندھیرے میں ڈوب جاتا پھر نقاب سی اوڑھ کر سامنے آتا۔ یہ نقاب ہیں اصلی ہیں یہ چہرے؟ ان کا دم گھٹنے سا لگا۔

یہ بچے اور بیوی جنہیں وہ خلوص سے چاہتے ان کے چہرے تھے یا محض گیہوں کی چپاتیاں ... ننھے میاں اور ان کی دلہن کے طنز سے تنے ہوئے چہرے، ان پر بہن کی تکلیف کے خیال سے اکڑ اور تھا یا صرف یہ خوف کہ بار کہیں ان پر نہ پڑ جائے پھر مکرم ان کا بڑا بیٹا، اس کے چہرے پر یہ تلاش گمشدہ کی سی کیفیت۔ راشدہ اور اس کا بھائی یوسف۔ جو ان کے مرحوم دوست کی امانت تھے، راشدہ.... جس کی آنکھوں میں اس بے بسی کے عالم میں بھی اتنا وقار تھا.... اور یہ وقار کیوں تھا؟ اور آخر میں وہ دوست جس کے چہرے پر ملکانہ چمک تھی.. .. جس کے قلم کی ایک جنبش سے حکیم رحمت اندھیری کوٹھری میں بے بس کھڑے یہ سارا کھیل دیکھ رہے تھے۔

"اماں خمیرہ نہیں کھاتیں۔" مکرم کوٹھری کی دہلیز پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے راشدہ تھی۔

"میں کیا کروں پھر۔" حکیم رحمت کے گرد سارے چہرے جیسے آتش بازی کی چرخی کی طرح چکرانے۔

"پھر اور کون کرے؟" مکرم نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ حکیم رحمت نے کچھ لمحے اس کی طرف دیکھا۔ اتنا کھدر کا پاجامہ اور کرتہ پہنے وہ پہلی مرتبہ انہیں اپنے سے زیادہ لمبا لگا۔ وہ دروازے میں جھکا کھڑا تھا، مگر اس نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

"جواب دیتا ہے نالائق ـــــ آنکھیں دکھاتا ہے ـــــ کس برتے پر؟" حکیم رحمت بے قابو ہو کر چیخے اور ان کا بید اٹھ گیا۔

"ہائے اللہ نہیں ـــــ" راشدہ بجلی کی طرح بیچ میں آ گئی اور بید اس پر پڑا۔ درد سے بلبلا کر وہ اچھلی اور پھر ساکت ہو گئی۔ حکیم رحمت کے دماغ میں بھی ہر خیال ساکت ہو گیا۔

"ہائے ......" صحن میں حکیم رحمت کی بیوی پر پھر دورہ سا پڑا اور مکرم سرخ چہرہ لیے ادھر ہو گیا..... حکیم رحمت کی آنکھیں بھر آئیں..... خوفزدہ راشدہ کانپ رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے اسے اپنے سمیت لیا۔ دوست کی یتیم بچی جس کی سرپرستی انہوں نے سچے دل سے قبول کی تھی' کیا وہ اسے مار سکتے تھے؟" وہ خدا کے خوف سے تھر تھر گئے۔

"رشو بیٹی مجھے معاف کر دو..... اسی نالائق کی وجہ سے...... میں اسے سمجھوں گا ابھی..... " حکیم رحمت نے اندھیری کوٹھری میں کھڑے کھڑے راشدہ سے کہا۔ اور راشدہ پھر اچھل سی پڑی۔

"نہیں آپ مکی بھیا کو بھی معاف کر دیجئے۔ ان کا یہ مطلب تھوڑا تھا... وہ تو آپ کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔" اور پھر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ تیرہ چودہ کے سن کی دبلی پتلی لمبے بالوں والی لڑکی۔

"اچھا۔" حکیم رحمت نے سے تھپکا اور ان کے ذہن سے آخرت کا خوف اتر گیا ـــــ راشدہ اپنا سفید غرارہ زمین پر سنبھالتی اندھیرے سے باہر چلی گئی۔

"مکی بھیا ـــــ مکی بھیا..... " حکیم رحمت نے زیر لب دہرایا اور ان کے سینے میں سانس آسانی سے سمانے لگی۔ انہوں نے جلدی سے مکرم کو بھی معاف کر دیا۔

پھر بھی وہ کوٹھری سے باہر نہ نکلے۔ نوکری چھٹنے کے بعد پہلی مرتبہ گھر کی اس اندھیری کوٹھری میں کھڑے کھڑے انہیں بے روزگاری کا خیال آیا۔ ان کی بنیادی نیک دلی نے سب سے پہلے راشدہ اور اس کے چھوٹے بھائی یوسف کو فاقے سے نڈھال تصور کیا۔ ساتھ ہی میدان حشر میں اپنے دوست کو دامن گیر پایا۔ یا اللہ یہ جذبے اور فرائض اتنے متضاد کیوں ہوتے ہیں؟" حکیم رحمت نے بڑے خلوص سے سوال کیا۔ اور پھر یہ سوچ کر کھسیانی ہنسی ہنس پڑے کہ ابھی گھر میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے فرائض سے کتنے غافل تھے ـــــ انگریزی ٹوپی کو ٹھوکریں لگاتے ہوئے وہ خود کو آزادی کا کتنا بڑا مجاہد تصور کر رہے تھے ـــــ اور ابھی اسی اندھیری کوٹھری میں کھڑے کھڑے انہوں نے اپنے بچوں اور بیوی کے چہروں پر گیہوں کی چپاتیوں کی دعائیں دیکھی تھیں اس خیال

سے انہیں اور بھی شرمندگی ہوئی۔ اللہ ہر شخص کے رزق کا وسیلہ بناتا ہے کیا وہ اپنے اہل و عیال کے رزق کا وسیلہ نہیں؟ روٹی نہ ملے تو لوگ اپنے بادشاہوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ تاریخ تو انہوں نے بھی پڑھی تھی۔ .. وہ امی کرم کی آنکھوں میں جو بے بسی جھلکی تھی اس نے انہیں بتایا کہ گھر کی سربراہی بس اس وقت تک قائم ہے جب تک ان کے ذریعے روٹی پہنچ سکتی ہے۔ ان کے دل میں ایک درد سا اٹھا اور وہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ دن کی رخصت ہوتی ہوئی روشنی میں انہوں نے بمشکل اپنے چہرے پر رعب داب پیدا کیا۔

ن سے کوئی کچھ نہ بولا۔ بیوی پلنگ پر اسی طرح پڑی رہیں۔ انہوں نے نل کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے برآمدے والے تخت کی طرف بڑھے۔ انہیں " تا دیکھ کر تخت پر بیٹھے ہوئے ن کے تینوں چھوٹے بیٹے صحن میں آ گئے نماز ختم کر کے دعا مانگتے ہوئے ان کا دل ایک دم نئی امیدوں سے پر ہو گیا۔ .... یہ نوکری ابھی سال پرانی بھی نہ ہوئی تھی... . پہلے بھی تو گزارہ ہوتا تھا۔ انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیر کر سامنے کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں تین دیواری الماریوں میں اخباروں کی فائلیں لدی پڑی تھیں۔ ان میں حکیم رحمت کے مضامین بھی تو تھے۔

" اپنا آبائی قصبہ رہنے کے لیے برا ہے؟" "کچھ قلم کی کمائی ہوگی' کچھ مطب چل جائے گا۔ چند خاص نسخے ہیں' جنہیں مشتہر کر کے بڑا کام بن سکتا ہے بس دوا کی پیکنگ وغیرہ شاندار ہو ۔ پھر ملک کو آزادی تو ہونا ہی ہے .. . ادھر ہٹلر صفایا کر رہا ہے۔ ادھر جاپان بڑھ رہا ہے . . شہر میں بمباری کا خوف بھی تو ہے۔ قصبوں کا بھلا کون نشانہ بنائے " ے گا۔" حکیم رحمت کے گھومتے ہوئے دماغ پر سے ساری اسکیم یوں صفائی سے بن کر ابھری جیسے کمہار کے چاک پر سے مٹی کا برتن

وہ نماز ختم کر کے تخت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے تو گھر کا ہر فرد انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ... صرف ننھے میاں اپنی بہن کے پاس منہ بنائے کرم سے الجھ رہے تھے

"ارے میاں چھوڑو ... . باتوں میں کیا دھرا ہے۔ . ... جب جانیں کہ سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ...... یوں چلمنوں کے پیچھے سے زبان چلانے کا کیا مطلب ہے؟" ننھے میاں نے عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر دھیمی آواز میں کہا۔ خدا جانے کرم نے کیا کہا تھا جس کا جواب یہ تھا۔ حکیم رحمت نے سن لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ان پر سیاسی چوٹ تھی مگر انہوں نے تو فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر ننھے میاں جو ان کی بے روزگاری کے خیال سے تلملا رہے تھے تو وہ کچھ غلط بھی نہ تھے؟

"سب بچے اپنا اپنا سبق لے کر آ جائیں" حکیم رحمت نے اپنی مخصوص مطمئن آواز میں زور سے کہا۔ اور سبق لینے والے بڑبڑا

گئے۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ آج اسکول بڑی بات تھی۔ سبق کی مصیبت سے چھٹے۔ اس آوز پر ہر عمر اور ہر سائز کے لڑکے آمدن نامہ سے لے کر گلستان سعدی تک کی تلاش میں ادھر ادھر لپکے۔ مگر چپ چاپ وہیں کی پاٹکی بیٹھا رہا۔ اور راشدہ اندر سہ دری کمرے میں پلنگ پا پاؤں لٹکائے جوں کی توں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ یہ دونوں ہم سبق تھے۔ ان کی باری رات کو آتی تھی۔

"دیکھو بچو ہم لوگ آئندہ جمعرات کو بیر پور چلے جائیں گے ... " حکیم رحمت نے گلستان کے ورق الٹتے ہوئے زور سے کہا۔ اور کنکھیوں سے ہر طرف دیکھا۔ .... بچوں کے چہرے چمک اٹھے یہاں تو خاک لطف نہ آتا۔ بیر پور کی کھلی فضا اور مانوس ماحول کی یاد سے وہ کھل اٹھے ...... مگر راشدہ کا بھائی یوسف پتا کال کھڑے گھٹنے پر رکھ کر رہ گیا حکیم رحمت کو یاد آیا کہ وہ جب اپنے مرحوم دوست کے انتقال کے بعد راشدہ اور یوسف کو اپنے قصبے میں لے گئے تو یوسف ہمیشہ موٹروں اور سینما کو یاد کرتا تھا۔ شہر میں رہ کر حکیم رحمت یوسف کو بھی اس کے ابا کی طرح سینما تو نہیں لے گئے مگر سڑک پر سینما کا اشتہار دھوم دھڑکے سے گزرتا ہی تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے یوسف؟" حکیم رحمت کو اس وقت اپنے مرحوم دوست یاد آ گئے جو نہ صرف انہیں ملک کے بڑے آدمیوں میں شمار کیا کرتے تھے بلکہ ہمیشہ قرض بھی دیا کرتے تھے۔

"جی چچا میاں..... وہاں ... وہاں۔" یوسف کہتے ہوئے جھجکا۔

"وہاں سینما نہیں ہے" حکیم رحمت نے آہستہ سے پوچھا۔

جی وہاں اسکول تو ہے ہی نہیں۔" یوسف نے گھبرا کر کہا۔

"مڈل اسکول نہیں ہے وہاں؟" پھر اسکولوں میں پڑھایا ہی کیا جاتا ہے۔ تمہیں کوئی کلرک بننا ہے خدانخواستہ... خیر اس کے آگے ہے جو چاہو گے تو انشاء اللہ پڑھائی کا انتظام ہو جائے گا... انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب تعلیم مفت ہوا کرے گی ... آنے والی آزادی کے تصور سے حکیم رحمت کا چہرہ بے حد نرم اور خوابناک ہو گیا.... پھر بھی یوسف نہ مسکرایا۔

"اور رشو باجی؟" یوسف نے پھر نہایت ذمہ دارانہ سوال کر ڈالا۔

"رشو یہیں ننھے میاں کے پاس رہ کر پڑھ سکتی ہے۔ اس کا خرچ بھیج دیا کرے گا۔" انہوں نے پھر بے حد اعتماد سے جواب دیا۔

"ہاں تو راکری کیوں جامعہ سے نکالا جاتا جو تم اس کا خرچ پابندی سے بھیجا کرتے۔" حکیم رحمت کی بیوی بڑی نقاہت سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ وہ دراصل بیر پور نہیں جانا چاہتی تھیں۔ وہاں اب تک ان کی بوڑھی ساس گھر پر چھائی ہوئی تھیں۔ عمر میں پہلی بار

تو وہ ان کے چنگل سے چھوٹی تھیں۔

بیوی کے طعنے سے حکیم رحمت کی جی پر چوٹ سی پڑی۔ کوئی کسی کی مجبوری نہیں سمجھتا۔ اب تنا چھ محسن دوست مر گیا تو کیا کرتے۔ اس کا قرض نہ ادا کرتے اور اس کے بچوں کو ساتھ نہ رکھتے؟ پھر آخر کرم کا علیحدہ خرچ کہاں سے آتا۔ پھر کرم کیا اب جاہل رہا جا رہا ہے!

"پھر کرم کو جامعہ بھیجو گے؟" بیوی نے سوال کیا۔

"اماں آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔۔۔ رشو میٹرک پاس کر لے۔ میں یہیں پڑھتا رہوں گا۔ اپنا خرچ کوئی نوکری کر کے پورا کروں گا۔" کرم تڑپ کر بول پڑا اور حکیم رحمت نے دیکھا کرم اندھیرے سے دروازے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جہاں راشدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ حکیم رحمت کو پھر پیٹھ میں چھرا گھونپے جانے کی سی اذیت محسوس ہوئی۔ یہ اس طرح کیوں ہے؟ ہر بات صاف کیوں نہیں ہے؟ جب راشدہ کے باپ مر گئے اور اتنے کئی ہزار روپیہ قرض چھوڑ گئے جسے حکیم رحمت نے فراخ دلی سے ادا کر چکنے کے بعد اپنی جیب خالی پائی تو انہوں نے کرم کو ایک اچھے باپ کی طرح سب کچھ لکھ دیا اور اس سے انسانیت اور دوستی کے نام پر قربانی طلب کی۔ وہ جامعہ سے آ گیا مگر وہ راشدہ اور اس کے بھائی کو دیکھ کر کس قدر ناک بھوں چڑھاتا تھا۔۔۔ یہ بات حکیم رحمت کو یاد تھی۔ اور انہیں اپنے بیٹے کی انسانیت پر شبہ تھا۔ لیکن آج وہ خود ماں سے کہہ رہا تھا راشدہ پڑھے۔۔ وہ یہیں رہ کر نوکری کرے گا اور پرائیویٹ امتحان پاس کرے گا! یہ اتنی انسانیت اور ہمدردی کہاں سے آ گئی ہے؟ حکیم رحمت کوئی بچہ تو نہ تھے۔

"تو پھر بتاؤ تائی کا خرچ۔۔" بیوی نے یاد دہانی کرائی۔

"کل طب پڑھے گا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی پور چلے گا۔۔۔ آزادی کے بعد دیسی علاج کا رواج بھی بڑھے گا اور عزت بھی ہو گی۔۔" حکیم رحمت نے فیصلہ سنا دیا۔

"میں۔۔۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔۔" کرم نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر جھپٹ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔۔۔۔۔۔ حکیم رحمت سمجھ گئے کہ وہ ایں جائے گا۔۔۔۔ مگر وہ گیا۔۔ حکیم رحمت نے آ کر دوسرے دن صبح صبح راشدہ کو کرم سے تنہائی میں بات کرتے نہ سنا ہوتا تو شاید وہ کرم کی بدتمیزی کو ہمیشہ کی طرح معاف کر دیتے۔

راشدہ کہہ رہی تھی۔ "تم چلے جاؤ۔ اچھا ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیسے روکوں گی ایسی باتوں سے۔"

"کرم نے دھیرے سے کہا تھا۔۔ "میں یہیں رہوں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

میر کہنا تو ایسے معاملوں میں جذباتی ہیں "اور راشدہ حکیم رحمت کو قریب دیکھ کر چپ ہو گئی تھی۔

کرم نے دوسرے دن سب کے ساتھ سامان بندھوانا شروع کر دیا .. مگر حکیم رحمت پر اسے دیکھتے ہی غصے کا ایک دورہ سا پڑنے لگتا۔ ہر بات پر وہ کرم کو ڈانٹتے حتیٰ کہ انہیں کرم کے ہاتھ کا بندھا ہوا سامان بھی ٹھیک نہ لگتا۔ وہ دیکھتے کہ کرم کے چہرے پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ باپ کے ڈانٹنے پر اب اس کے چہرے پر سرخی تک نہ جھلکتی ادھر راشدہ تھی جو کرم کی ہر غلطی ٹھیک کرنے پر تلی ہوئی تھی.... رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ تھیں مگر وہ جھٹ کر حکیم رحمت کی ہر ڈانٹ پر کھلی ہوئی گٹھریاں دوبارہ باندھتی۔ حکیم رحمت کو راشدہ کی یہ حرکت بھی تکلیف پہنچاتی۔

"رشو بیٹا کیا یوسف کو تمہارے پاس چھوڑ جائیں۔" حکیم رحمت کی بیوی نے چلنے سے ذرا دیر پہلے ترس کھا کر پوچھا۔

"نہیں خالہ جان وہ اکیلے میں بگڑ جائے گا۔" راشدہ نے جواب دیا پھر بھی وہ اپنے بھائی کے سنورنے کے خیال سے خوش نہ ہوئی۔ بس روئے چلی گئی۔

"تم چھٹیوں میں آ جانا".. حکیم رحمت کی بیوی نے بھرے گلے سے آواز نکالی۔ وہ راشدہ کی طرف دیکھ کر خود بھی رو پڑیں۔

راشدہ کے آنسو دیکھ دیکھ کر حکیم رحمت کی عجیب سی کیفیت تھی ان کا جی چاہتا کہ وہ بھی چیخ مار کر رونے لگیں۔ دکھ سے نہیں۔ الجھن کے مارے۔ انہیں یوں لگتا جیسے وہ کاغذ پر سیدھی لکیر کھینچتے ہیں اور وہ لکیر ہے کہ کینچوے کی طرح ایڑی جھنڈی ہو کر آگے بڑھتی ہے ... ان کا کچھ بس نہ چلتا۔ راشدہ ان کے لیے شروع سے پریشانی کا باعث تھی۔ وہ جدت سے عزت کے راستے گمریز دشمنی تک پہنچے تھے... یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے.... مگر راشدہ کے مرحوم باپ کی خواہش تھی کہ وہ اسکول کی تعلیم تو ضرور ہی مکمل کرے۔ اسی مجبوری کے تحت راشدہ اسکول تو ڈولی میں بیٹھ کر جاتی مگر ساتھ ہی حکیم رحمت سے فارسی اور عربی کے سبق بھی لیتی۔ ... گلستان سعدی کا باب پنجم چھوڑ کر وہ گلستان ختم کر چکی تو پھر ایک دن دیوان حافظ اٹھا لائی..... وہ دیوان حافظ کے شدید عاشقانہ اشعار کے متصوفانہ معانی حکیم رحمت سے پوچھتی اور کئی بار اعتراض کر بیٹھتی ... "تو یہ خدا سے کہا ہے؟" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے گھما دیتی اور حکیم رحمت کو غصہ آنے لگتا کرم اس کا ہم سبق جو تھا۔ جو حکیم رحمت سمجھاتے رات کو کھانے کے بعد تک وہ ہر اس بات کو گھوٹ کر رہتا۔ جو حکیم رحمت رات کو کھانے کے بعد اردو کا تلفظ درست کرنے کے لیے وہ کرم سے اخبار پڑھوا کرتے اور راشدہ کو پاس بٹھا کر اس کا بھی امتحان۔ اور اس

ہم سبق کے سلسلے میں حکیم رحمت کو کرم اور راشدہ کے درمیان رکھا آ کہ چھوٹی کی سی کیفیت کا اندازہ ہوا تھا۔

راشدہ ان کے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندری تھی۔ نہ اگلتے بنے نہ نگلتے وہ ان کے مرحوم دوست کی بیٹی تھی جس کی سرپرستی انہوں نے ساری دنیا کے سامنے قبول کی تھی۔ ...... دوسری طرف راشدہ انہیں کھٹکتی بھی تھی۔ وہ ان کے گھروں کی لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی۔ بے دھڑک ہر سوال کر بیٹھنے والی۔ وہ تھی تو تیرہ چودہ سال کی۔ پھر بھی وہ اپنی سنجیدگی کی وجہ سے بڑی سی لگتی ...... ایک دن کرم اخبار پڑھ رہا تھا۔ کسی لیڈر کا عدالتی بیان تھا...... اس میں کہا گیا تھا "مجھے زنا کے ملزم کی طرح ہتھکڑیاں ڈال کر عدالت میں لایا گیا۔"

"ابا جان زنا کا کیا مطلب ہے!" کرم نے سوال کیا کیونکہ اسے یہ ہدایت تھی کہ جو بات نہ معلوم ہو اس کا مطلب پوچھ لیا کرے۔ حکیم رحمت کے سر میں سارا خون جمع ہو گیا تھا۔

مگر راشدہ بول اٹھی تھی۔.. "مجھے معلوم ہے۔ برے کام کو کہتے ہیں۔"

"کون سا برا کام؟" کرم نے راشدہ کی طرف دیکھا۔

وہ راشدہ کچھ کہنے والی تھی کہ حکیم رحمت چیخ اٹھے۔ "بیوقوف آگے پڑھو۔ اپنے سولہ سالہ بیٹے کو وہ اتنا معصوم کیسے سمجھ لیتے۔ اور یہ راشدہ... تو جیسے ان کے سینے پر سوار ہو گئی تھی۔

اس رات انہیں دیر تک نیند نہ آئی تھی۔ اور انہوں نے ہر پہلو پر خوب سوچا تھا اور پھر بیوی کو جگا کر پوچھا تھا۔

"یہ راشدہ کیسی لڑکی ہے؟"

"اے واہ یہ وقت خوب نکالا پوچھنے کا... اچھی ہے...... جب سے ہمارے گھر آئی ہے ہر کام سنبھال لیا ہے۔" بیوی ذرا تفصیل میں جانے لگیں۔

"میرا مطلب ہے کہ لڑکی بڑی ہو رہی ہے۔ ذرا نظر میں رکھا کرو...... خدا نے اسے ہمارے سپرد کیا ہے۔ ..... کرم بھی بڑا ہو گیا ہے۔" حکیم رحمت کے منہ سے اصل بات نکل ہی گئی۔

"خواہ مخواہ... ہر وقت تو نظر کے سامنے رہتے ہیں۔" بیوی برا ماننے لگیں اور حکیم رحمت کو پھر ہوئی الجھن

"کیا خیال ہے اگر راشدہ اور کرم کی منگنی کر لیں۔ اور" حکیم رحمت کو سب ہی سوجھ گیا۔

"اے سچ مچ۔ " بیوی نے یہ الفاظ یوں ہنس کر کہے جیسے ننھے بچے جھنجھنا بجاتے ہیں۔

صبح جب حکیم رحمت شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے دفتر جانے کے لیے پان کے انتظار میں بیوی کے پاس کھڑے تھے تو انہوں نے پھر ہنس کر سمجھتا سا بجایا

"سنا تمھے کی دلہن ۔ ۔ ۔ رشتو ہماری ہے، کی اللہ کرے جلدی سے کی رقی ہو جائے تو ۔ ۔"

اور راشدہ جو چولہے کے پاس بیٹھے ہانڈی بھونتے ہوئے دیوان حافظ گھٹنے پر رکھے پڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حکیم رحمت نے بیوی کو اتنا اتفاق نہ سمجھا جو ایک دم سب کے سامنے ابل پڑیں وہ ڈیوڑھی کی طرف چلے تو کرم ادھر آیا ... کرم کو دیکھتے ہی راشدہ کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

"ہائے بھیو یہ سب کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیا ہوا.... کیا کہا ...... "مگر احمقوں کی طرح صحن میں ہکا بکا کھڑا ہو گیا

حکیم رحمت جلدی سے باہر نکل گئے ۔ رات انہوں نے بیوی کی اس بات کو تسلیم کر لیا۔ کہ راشدہ اور کرم ابھی بچے ہیں۔ سمجھدار ہوں گے تو دیکھا جائے گا

حکیم رحمت کئی دن تک راشدہ اور کرم سے آنکھیں نہ ملا سکے لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اس قصے کے بعد وہ دونوں اور بھی زیادہ سنجیدہ ہو گئے ۔ ۔ ۔ کئی بار انہوں نے دیکھا کہ راشدہ قلم کاغذ لیے سوچ میں ڈوبی بیٹھی ہے اور کرم دور سے کھڑا اسے اشارے کر رہا ہے۔ عجیب سے اشارے۔ کبھی انگلی سے سر ٹھونکتا ہے۔ کبھی برے منہ بنا کر روٹھنے کی ادائیں دکھاتی کبھی کرم ور تھے میاں کی دلہن کے پاس کھٹولی پر بیٹھا کچھ لکھتا تو راشدہ اسے ستاتی ۔ ایک دن حکیم رحمت نے یہ بھی دیکھا کہ راشدہ کچھ لکھے ہوئے کاغذ کرم کو دے رہی ہے...... لیکن انہیں آتا دیکھ کر اس نے وہ کاغذ دوپٹے میں چھپا لیے.... اور کوٹھری میں جا گھسی ...... اور کرم جھٹ ماں کے پاس باورچی خانے میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے ایک دن اپنے کانوں سے سنا کہ راشدہ حکیم رحمت کی بیوی کا سر دبا رہی تھی اور کرم پاؤں... ... وہ آنکھیں بند کیے پڑی تھیں...... راشدہ کہہ رہی تھی "چچا میاں کو پتہ لگا تو بہت چڑیں گے جناب !" اور کرم سب گڑ کر بولا۔ "جی! وہ اپنے لیے تو بڑے آزاد ہیں، مجھے سب پتہ ہے ان کے بارے میں بے چارے دادا مرحوم کے دل سے کوئی پوچھتا۔"

یہ گفتگو سن کر وہ تمام دن کھوئے رہے تھے وہ کرم کو عاق کر سکتے تھے۔ مگر یہ راشدہ۔ یہاں سے انہیں کبھی کبھی

اپنی نیکیوں پر مسکرانے لگا تھا۔

مگر اب تو راشدہ بہو پور میں نہیں تھی . . . صرف مکرم تھا۔ . ان کی بیوی اٹھتے بیٹھتے راشدہ کی کمی کا ذکر کرتیں۔ گھر میں کوئی بھی چیز کبھی پک جاتی تو وہ رشو کو یاد کرتیں۔ لڑکے ان کا کہنا نہ مانتے تو رشو کی مثال دیتیں جو ان کی بہت قدر فرمانبردار تھی . حکیم رحمت دیکھتے کہ راشدہ کا نام سن کر مکرم کی آنکھوں میں درد کی جھلک آ جاتی . . اور یہ دیکھ کر حکیم رحمت کا خون کھول جاتا۔ ... مکرم ان سے طب کی کتابیں پڑھنے بیٹھتا تو اس کے چہرے پر یادوں کا سایہ سا پڑتا۔ اور حکیم رحمت اس کی کند ذہنی پر چلا چلا پڑتے....... خدا جانے کہاں سے راشدہ ان کے سامنے آ بیٹھتی جو ہر بات جلدی سے سمجھ جایا کرتی تھی۔ . . . حکیم رحمت کے دل کو جیسے کوئی مٹھی میں پکڑ لیتا ..... راتوں کو وہ اپنے مرحوم دوست کو خواب میں دیکھتے اور دن کو چڑچڑاتے سے رہتے۔

حکیم رحمت کی طبابت تھی کہ دونوں وقت کی چٹنی روٹی کی ضامن ہو گئی۔ ہفتے میں دو ایک آرڈر اشتہاری دواؤں کے بھی آ جاتے جنگ نے چیزوں کو نہ صرف مہنگا کیا تھا بلکہ غذا میں ملاوٹ کا رواج بھی قصبے میں بڑھ گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی بیماریاں مطب میں ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ .. جنگ کی تازہ ترین خبروں پر تبصرہ ہوتا جاتا مہنگائی کا رونا رونے والوں کو مفت دوائیں اور جاپانیوں کے ہر وقت آتی ہوئی آزادی کی مفت امیدیں تقسیم ہوتیں۔ اس کے باوجود حکیم رحمت کے دل کو قرار نہ تھا .... ادھر بیوی آئے دن جو اور گیہوں کی مہنگائی کے ساتھ ان پر برستیں .. "مفت دوائیں! ہم کون سے خزانے پر بیٹھے ہیں۔ . اتنے دن ہو گئے گوشت پکے ہوئے . پھر راشدہ کو کب سے خرچ نہیں بھیجا گیا . تمہیں میں نے تو کوئی ذمہ داری نہیں لی تھی۔ . یتیم کی ذمہ داری لی ہے۔ تو فرض بھی پورا کرو۔ اس کے بجائے بیٹھے مفت دوائیں تقسیم کرتے ہیں۔"

اس روز روز کی بڑبڑ کے باوجود حکیم رحمت راشدہ کو باقاعدہ خرچ بھجوانے سے معذور رہے۔ خرچ گھر ہی کا مشکل سے پورا ہوتا۔

ایک دوپہر کو انہوں نے فیصلہ کیا کہ آج کی ساری آمدنی وہ راشدہ کو بھیجیں گے رات کو پھر انہوں نے اپنے دوست کو خواب میں دیکھا تھا۔ دوپہر کو انہوں نے اپنی صندوقچی کھولی۔ یہاں صرف تین روپے سات آنے نکلے... وہ بغیر کھانا کھائے جلدی سے بید اٹھا کر ڈاک خانے کی طرف چل دیے کہ شاید دواؤں کے آرڈر آئے ہوں۔ وہ انہی آرڈروں کے زور پر اپنے ملنے والے پوسٹ ماسٹر سے کچھ قرض بھی لے سکتے تھے۔

"کم از کم بیس روپے تو بھیج جائیں۔ دو مہینے سے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا۔" وہ راستے بھر روپوں کی تعداد گھٹاتے بڑھاتے رہے۔ بہرحال یہ حقیقت تھی کہ اس دن راشدہ پر انہیں شدت سے پیار آ رہا تھا۔

وہ پہنچا تو پوسٹ ماسٹر کہیں غائب تھا۔ پوسٹ مین نے ان کے ہاتھ پر وہ خط ایک منی آرڈر کی رسید رکھ دی رسید پر راشدہ کے دستخط تھے اور بھیجنے والا تھا کرم

حکیم رحمت بید کو اپنے مخصوص انداز سے ٹیکتے اٹھاتے گھر کی طرف جیسے دوڑ پڑے۔ ان کے ہاتھ کی گرفت بید کی مٹھ پر مضبوط ہوتی گئی

''سلام حکیم صاحب۔'' قصبے کے بازار میں حلوائی بھنبھناتی ہوئی مکھیوں اور تسواری بھڑوں کو اڑاتے ہوئے پکارا۔ وہ ہمیشہ سے خبروں کا شوقین تھا۔ یہ بات حکیم رحمت کو معلوم تھی۔ مگر جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں

پاٹک والے پتواری رام ۔ ب کی دکان پر نوری کھڑی بیڑی پی رہی تھی۔ حکیم رحمت کو دیکھ کر اس نے بیڑی پھینک دی اور ادب سے سلام کو ہاتھ اٹھایا ۔ مگر جب نوری نے تیزی سے چلتے ہوئے حکیم رحمت کا پاؤں چھپاک سے کیچڑ میں پڑتے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس دی... ... حالانکہ کل ہی تو وہ اپنی گرمی کے علاج کے لیے ان کے مطب میں سر ڈھک کر بے حد ادب سے حاضر ہوئی تھی .... اور یہ سن کر بے حد گھبرائی تھی کہ آزادی کے بعد پیشہ بند کر دیا جائے گا

حکیم رحمت جب اپنے گھر کے چبوترے پر ہانپتے ہوئے چڑھے تو گندے پانی کی حوضیا کے نزدیک کرم کھڑا نظر آیا . خاموش کھویا ہوا. جیسے وہ حوضیا نہیں تھی بلکہ آب رواں میں چاند کا عکس پڑ رہا ہو۔

حکیم رحمت نے بید اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیا۔

''الو... نالائق . بدمعاش......'' وہ چلاتے رہے۔ ان کی بیوی گھبرا کر دروازے کے سامنے بنی ہوئی پردے کی دیوار تک نکل آئیں۔ دو ایک راہ گیر رک گئے تھے مگر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کرم کو اندر گھسیٹ لیا۔

پھر جب حکیم رحمت کو ان کی بیوی نے بتایا کہ روپے تو انہوں نے بھجوائے تھے تو بھی وہ یقین نہ کر سکے۔ انہوں نے کئی دن تک کرم کو پڑھنے کے لیے آواز نہ دی لیکن دوپہر کو وہ گرمی سے بے چین ہو کر گھر کی سب سے اندھیری کوٹھری میں لیٹنے کے لیے پہنچے تو کرم کاغذ پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ اور پاس ڈاک کا لفافہ پڑا تھا۔ وہ ذرا چونکا اور پھر چپکے کاغذ سمیٹ کر کوٹھری سے نکل گیا۔ . . . حکیم رحمت کا دل ٹوٹ گیا۔ کرم ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا . . اس نے اب ڈرنا بھی چھوڑ دیا تھا. تمام تمام دن وہ اوپر کے تپتے ہوئے کمرے میں دروازہ بند کیے پڑا رہتا۔

حکیم رحمت مطب میں بیٹھے خبروں پر تبصرہ ہوتا دوائیں مفت تقسیم ہوتیں .... شام کو کرم کے سوا سب بچوں

کو فاری کا سبق دیا ہو۔ راشدہ کا بھوری یوسف الدین میں سب سے زیادہ غلطیاں کرتا اس پہ سب سے زیادہ وہی کے کان اینٹھے جاتے۔

یک دن وہ گھر میں داخل ہوئے تو بیوی کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ "سنا تم نے کی نے۔ ۔ "بیوی لہک اٹھیں۔

"مت نام لو نالائق کا میرے سامنے..... "وہ گرج کر بولے۔اور بیوی بے حد برا مان گئیں۔

"میں بھی بدقوی ہوں گی جو بھی کچھ کہوں۔" ور انہوں نے دھپ سے ہاجرے کی روٹی توے پر ڈال کر جیسے معاہدے پر مہر لگا دی۔

جاپانی ہندوستان کی سرحدوں پر منڈلا رہے تھے۔ مگر حکیم رحمت سوچتے "کیا وہ آزادی کے ساتھ گھر کی نوتی ہوئی آن بھی ساتھ لائیں گے؟ اس سے بڑھ کر کسی باپ کے لیے کیا دکھ ہو سکتا ہے کہ اس کا بڑا بیٹا بگڑ چکا ہو۔ انہیں حقیقتاً مکرم سے نفرت ہو چکی تھی۔ اور راشدہ؟" اس کے بارے میں تو انہوں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پاس جواز موجود تھا۔ اگر راشدہ کے باپ زندہ ہوتے تو اس حالت میں وہ بھی اسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔

حکیم رحمت کو سب سے بڑی ذہنیت اس بات سے پہنچ رہی تھی کہ یہ دونوں اتنے خرافات سے عشق بازی کر رہے تھے ور ساتھ ہی انہیں بیوقوف بھی بنا رہے تھے وہ تو ان دونوں کے لیے مخلص تھے جبھی تو انہوں نے مکرم اور راشدہ کو منسوب تک کرنے کی تجویز کر دی تھی۔ مگر راشدہ کا یہ کیا کھیل تھا کہ وہ صاف نخی بن گئی اس دھاندلی کے ساتھ وہ بیٹی؟ آنکھوں اور کانوں کو کیسے جھٹلا سکتے تھے۔ ۔ راتوں کو ان کے سامنے وہ سارے مناظر آجاتے۔ جہاں مکرم اور راشدہ چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے خطوط کا تبادلہ کرتے... .. اشارے کرتے ور ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور پھر اس ساری کشمکش کا سارا بوجھ وہ راشدہ پر ڈال دیتے جو بغیر جھجکے ایک ناپاک لفظ کے معنی بتا سکتی تھی.... اب ہر چیز صاف تھی۔ پہلے کی طرح نہیں کہ جیسے کوئی ان کی آنکھ پر خوردبین رکھتا اور ہٹا تا ہو . .. کبھی معصوم کبھی ناپاک..... کبھی ذرا ذرا سے رینگتے ہوئے کینچوے..... کبھی یہ بڑے بڑے ناگ۔ اب ناگ کینچوے نہیں بن سکتے تھے ... حکیم رحمت سوچتے کہ وہ حشر میں اپنے دوست کا دامن پکڑیں گے۔ جنہوں نے اپنی لڑکی کو اتنی خراب صحبت کی کہ ان کا لڑکا بھی اس کے ساتھ رہ کر بگڑ گیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تب بھی انہوں نے راشدہ کو کرائے کے پیسے نہ بھیجے۔ ایک دن مطب میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے گھر میں

خوشی کی چیخیں اور ہنسی تھی...... وہ اندر پہنچے تو دیکھا راشدہ سب کے بیچ میں گھری بیٹھی تھی وہ جلدی سے آگے بڑھی کہ ان کے سینے سے لگ جائے مگر وہ پیچھے ہٹ گئے۔

"اچھی ہو؟" انہوں نے اوپری دل سے کہا اور باہر چلے گئے۔ انہیں اپنی طبیعت خراب ہوتی معلوم ہوئی اس رات ان کی بیوی کوٹھے پر جب ان کے سرہانے گئیں تو بتایا کہ رشو اپنی ماں کی نشانی انگوٹھی بیچ کر آئی ہے۔

"وہ کیوں آئی ہے؟" حکیم رحمت نے یک دم تڑپ کر سوال کیا اور ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ وہ بیوی کے چہرے کو سخت نظروں سے گھور رہے تھے۔ "ارے تو ہمارے سوا اس کا کوئی ہے۔ پھر یوسف بھی تو یہاں ہے۔" بیوی نے حکیم رحمت کو حیرت اور ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے الٹا سوال کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس منطق کے آگے وہ لاجواب ہو گئے۔ اور انہوں نے لالٹین کی بتی نیچی کر دی۔

"ایسا تو اچھا لگ رہا ہے اس کے آنے سے۔" بیوی نے جیسے راشدہ کی سفارش کی۔

"تو پھر تم نیچے جاؤ۔" انہوں نے حکم دیا اور چپ چاپ لیٹ گئے۔

نیچے گھٹے ہوئے صحن میں بڑی گہما گہمی تھی۔ سب اکٹھا بول رہے تھے ہنس رہے تھے۔ ان کی ماں تک کئی بار راشدہ راشدہ پکار چکی تھیں۔ حکیم رحمت نے سوچا۔ شاید جانا ہی خوشی کی جڑ ہے۔ اگر اماں کو یہ معلوم ہو جائے کہ راشدہ کیا ہے تو؟

حکیم رحمت کے احساسات پر تنہائی مسلط ہو گئی۔ انہیں ان کی بیوی کی کوتاہ نظری نے اور بھی تنہا کر دیا تھا۔ وہ اگر ان سے اس مسئلے پر کھل کر بات چیت کر لیتے تو شاید کسی نتیجے پر پہنچ جاتے۔

چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی۔ پڑوس کے پیچھے کے مکان کے چھتنار نیم پر کوئی پرندہ بار بار پھڑپھڑاتا تو حکیم رحمت کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ ارد گرد کے مکانوں سے برتن چاٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور پھاٹک والے حلوائی کی دکان پر گراموفون ریکارڈ بار بار بج رہا تھا۔ "ارے رما ساون بیتا جائے..." دور کوئی یکہ ادھڑی ہوئی سڑک پر گھنگھرو بجاتا دھڑدھڑاتا گزر گیا۔ پھر بھی قصبے کی ویرانی اور خاموشی جیسے مہک رہی تھی آہستہ آہستہ اجاڑ قصبہ اور اجاڑ ہو گیا۔ دور جامن کے باغوں میں رکھوالے چمگادڑوں کو اڑانے کے لیے چلانے لگے۔ ہو ہو۔ ہائے۔

لیکن نیچے آنگن میں آج سب ابھی تک جاگ رہے تھے۔ لالٹین کی روشنی دوپہر والے کمرے کی دیوار پر موہوم سی زردی پھیلا رہی تھی۔ پھر ایک دم خاموشی ہو گئی۔ صرف راشدہ کی آواز کی گنگناہٹ سی اوپر سنائی دی۔ حکیم رحمت نے آہستہ سے اٹھ کر

کنویں جیسے آنگن میں جھک کر دیکھا۔ سب نے اپنے پلنگوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ سٹول پر لالٹین جل رہی تھی اور راشدہ نیم دراز کروٹ سے پڑی رسالے میں سے "کچھ دلی" واز میں پڑھ رہی تھی۔۔ مکرم بنی ماں کے پلنگ پر بیٹھا ہاتھ بڑھا بڑھا کر راشدہ پر کھجور کا پنکھا جھل رہا تھا۔ خوش اور مضطرب سا حکیم رحمت کو لگا جیسے دو گاڑیاں مخالف سمتوں سے ایک پٹڑی پر بڑھ رہی تھیں۔

"تیل ملتا نہیں اور لالٹین جل رہی ہے" وہ اوپر سے چیخ پڑے۔ رسالہ رکھ دیا گیا۔ اور مکرم نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا..... پھر خود کو جیسے جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بھئی قصہ ختم تو ہو جاتا..... آپ رات رات بھر پڑھو تو کچھ نہیں۔۔۔ ایک ذرا ہم نے تو۔۔۔ پڑھو رشو .... پڑھو ... "حکیم رحمت کی اماں نواڑی چوکی پر بیٹھے بیٹھے زور سے بولیں۔

"حکیم رحمت کا دل جیسے خشک پتے کی طرح لرزنے لگا..... کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے۔۔ راشدہ کا نیم دراز سراپا اور بستر پر بکھری ہوئی چوٹی..... مکرم کی مضطرب سی خوشی۔۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا .. کوئی نہیں اب جی چاہا وہ چیخ چیخ کر سب کو بتا دیں..... اور دونوں کو گھر سے نکال دیں۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر پلنگ پر لیٹ گئے۔ انہیں شدید اختلاج شروع ہو گیا۔ اختلاج کا ایک اور باعث بھی تھا جس کا انہیں فوراً احساس ہو گیا۔ دو دن سے گھر میں پرانے باجرے کی روٹی پک رہی تھی۔ جو کی قیمت چڑھ گئی تھی نا۔ دکھ جیسے ان پر ٹوٹ پڑے۔۔۔ امید تھی تو صرف اتنی کہ شاید جاپانیوں کے آنے سے گیہوں سستا ہو جائے...... مگر یہ کروٹ سے لیٹی ہوئی راشدہ اور مضطرب سا مکرم۔ ان کا کیا ہوگا؟

"اللہ...... آل... لا...... آ" حکیم رحمت کی اماں طویل جمائی لیتے ہوئے پکارنے لگیں۔ اور یہ پکار حکیم رحمت کو اپنے سینے سے اٹھتی محسوس ہوئی۔

اختلاج کے عالم میں ان کا جی چاہا کہ کوئی انہیں خمیرہ مروارید کی شیشی اوپر پہنچا دیتا۔ مگر انہوں نے کسی کو آواز تک نہ دی... انہیں سبھی سے نفرت ہو گئی تھی۔

رات جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازوں سے اور بھی تنہا اور ویران ہو گئی۔ گلی میں کوئی کتا رو یا تو حکیم رحمت کو معلوم ہوا کہ بغیر خمیرہ مروارید کے وہ نہیں رہ سکتے انہوں نے ربڑ کے سلیپر بمشکل پاؤں سے ٹٹول کر ڈھونڈے اور لڑکھڑاتے ہوئے زینے تک جانے

کے لیے چاندنی سے نیم روشن کمرے کو مجبور کیا   اور جب وہ چند قدم اترے تو دبی دبی سی آواز آئی ۔ "ہنو جنت بھی لیٹے پڑی ہے ۔ تمہاری بچو کو کیا ہوا ہے؟"

حکیم رحمت کا دل جیسے دھڑ دھڑا کر رک گیا   یہ راشدہ کی کھنکتی ہوئی آواز تھی۔

"مگر ابا تو......" مکرم نے احتجاج کیا۔

"ہنو۔ بس اسی معاملے میں ان کے نقش قدم پر چلو گے... . .." راشدہ کی آواز تیز ہو گئی۔

حکیم رحمت غیر ارادی آہستگی سے دو ایک سیڑھیاں یوں اتر گئے جیسے بلی پرندے کی تاک میں بڑھتی ہے۔ ..... زینے کی آخری سیڑھی چاندنی سے منور جب نئی نئی ان کی شادی ہوئی تو وہ ایسی منور راتوں میں بیوی کو ماں کے پاس سے جگا کر لانے کے لیے یوں ہی زینے پر دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔ . اور آج انہوں نے بیوی کو پلنگ کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ .... وہ تو مکرم کو دیکھ رہے تھے جو باہر کے دروازے کی دہلیز پر راشدہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"چچا میاں کو پتہ لگ جائے تو کیسی مرمت ہو تمہاری۔ .... میں کل دکھاؤں گی انہیں . . " راشدہ دہلیز پر ہنسی سے جھولا سا کھا کر کھسر پھسر کرنے لگی۔

"میں نہیں کہہ دوں گا کہ تم بھی یہی کر رہی ہو   وہ تو تمہیں نکال دیں گے گھر سے۔   " مکرم بگڑ گیا۔

"ہنو بھی نہیں" راشدہ اعتماد سے بولی ... . "وہ تمہیں نکال دیں گے اگر انہیں پتہ معلوم ہو کہ تم تانگہ فضا میں اڑاتے ہو۔"

"کیا . کیا .... . " مکرم چونک اور راشدہ کو دھکا دینے لگا۔

راشدہ نے چاندنی میں رسالہ اونچا کیا اور جھک کر پڑھا۔

"رامو کا تانگہ فضا میں اڑا جا رہا تھا . . . یہ نہیں لکھا ہے تم نے.. ... بھلا تانگہ فضا میں کیسے اڑ سکتا ہے... ... فضا تو زمین سے اوپر ہوتی ہے۔" راشدہ نے سرگوشی کی۔

"خواہ مخواہ قابلیت جھاڑنے لگیں فضا میں اڑنے کا مطلب ہے تیز دوڑ رہا تھا" ہرگز نہیں۔" حکیم رحمت نے مکرم کی پشت پر دھول جمائی۔ "وقت برباد ہو رہا ہے اور لفظ کا صحیح استعمال تک نہیں کر سکتا۔"

وہ دونوں دہلیز پر سے اٹھ کر بچوں کی طرح اپنے بستروں کی طرف بھاگے۔ اور حکیم رحمت دہلیز پر سے رسالہ اٹھا کر زینہ چڑھتے ہوئے بولے۔ "کل سے کل تو مجھے روز ایک مضمون لکھ کر دکھائے گا اور تو راشو مجھے خوب پڑھ کر سنائے گی۔"

وراوپر دیر تک لالٹین کی روشنی دیکھ کر ان کی بیوی زور زور سے بڑبڑاتی رہیں "بچوں کو چاندنی میں بھی بیٹھ کر پڑھنے نہ دیا

. ور اب لالٹین میں تیل نہیں پانی جل رہا ہے۔ . ہاں نہیں تو ..... بڑے آئے"

"فصیح کرنے والے۔" مکرم نے بیوی کا فقرہ مکمل کیا اور غصے سے منہ اوندھا کر لیٹ گیا؟

◆◆◆

کنیز

سول لائنز کی سب سے کشادہ اور سب سے خوبصورت سڑک پر میل ڈیڑھ میل کی مسافت سے تھکی ہوئی کنیز اور ان کی دادی سڑ پٹر جوتیاں گھسیٹتی چلی آ رہی تھیں۔ دادی کی چادر لو میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ کنیز کا پرانا کالا برقع تو ہوا کے زور سے کئی بار سر سے اتر گیا۔ اس پر سے نمی اور بھی اٹھی تو کنیز، ماں کی انگلی پکڑے چلی آ رہی تھی مگر جی میں تنی جان کہاں۔ دادی کا سوکھا جسم جھک کر اس پر سے کولہے پر جھی .... لو میں سرخ تانبا ہو رہی تھی۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔ ہم نے صبر کیا تو صبر نہ کھو۔'' دادی رو رو کر کراہ اٹھتیں۔ لیکن کنیز بار بار سوچتی ''اماں بیگم تانگے کے پیسے دے رہی تھیں لے لیا ہوتا تو کاہے کو یوں لو میں بھنتے قرض میں بھلا کیا بے عزتی؟ دادی پھر تو اپنی ناک رکھنے کو ادا ہی کرتیں ویسے لاکھ خست کریں۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔ ہم نے صبر کیا تو صبر نہ کھو۔ دادی رو رو کر کراہ اٹھتیں۔ لیکن کنیز بار بار سوچتی ''اماں بیگم تانگے کے لیے روپیہ دے رہی تھیں لے لیا ہوتا تو کاہے کو یوں لو میں بھنتے قرض میں بھلا کیا بے عزتی؟ دادی پھر تو اپنی ناک رکھنے کو ادا ہی کرتیں ویسے لاکھ خست کریں۔''

مگر اس سوچ بچار کے باوجود سڑک بس ہی ہوتی جا رہی تھی جو کوٹھی آتی بس جی چاہتا کاش یہی کوٹھی اپنی ہوتی' جلدی سے اس تپتی سڑک سے بچ کر اندر گھس کر بیٹھے رہتے۔ مگر جب دھوپ میں آنکھیں میچی کر دیکھا جاتا تو ابھی منزل دور ہی نظر آتی نہر کے پل کے ادھر ہی تو اپنی ننھی سی کوٹھی تھی لمبے لمبے شیشم یوکلپٹس' آم جامن اور گولر کے درختوں کے گھنے گھنے سایوں میں دبکی ہوئی کوٹھی۔ یہاں سورج بھی مار کھا کر آتا لو بھی غرّاتی آنے کے بجائے سسکی لے کر آتی۔

بہر حال حرکت میں برکت ہے۔ ان کی کوٹھی آ ہی گئی۔ لپک کر اپنے گوشہ عافیت میں سب نے پناہ لی۔ ابھی دروازہ بھی بند نہ ہوا تھا چادر برقع تک نہ اترا تھا کہ کنیز پر اس کی چچا نے جھپٹ کر حملہ کر دیا۔ ''ارے تو قصہ ختم'' حسرت ناک تعجب کی لہر میں اس نے اچانک اپنے زانوؤں پر ہاتھ مار کر شروع کر دیا۔

"ارے عشرت میاں میرے ساتھ تم نے دھوکہ کیا ارے پوچھوں ناؤ کس نے ڈبوئی کہ خواجہ خضر نے۔" کنیز نے لہک کر بین کیا اور ماتھا کوٹ لیا۔

دادی نے کپکپاتے ہاتھوں سے چادر اتاری' پان سے لال ہونٹوں کے گوشے لرزے' ٹھوڑی جھڑکی' چہرے کی ایک ایک جھری کانپ گئی۔ اور میلی میلی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر جھریوں کی راہ سارے چہرے پر بہنے لگے انہوں نے جتی کو زمین پر اتارا تو اس نے تیز آواز میں رونا شروع کر دیا۔ دادی' دادی' وہ یک ہی سر میں رو رو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی' کنیز کو بے حال دیکھ کر دادی کو اتنا ہوش کہاں رہتا۔

نی کو پیاس لگ رہی تھی اس نے بھی موقع غنیمت دیکھ کر پانی پانی پکار کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے میرا بچہ مجھ سے بچھڑ گیا' عشرت تو اپنی میا سے چھٹ جائے' تو مر جائے عشرت۔" کنیز نے کچہری میں ممتاز کو عشرت کے حوالے کیے جانے کا منظر یاد کر کے سینہ پیٹ لیا اور بے ہوش ہو کر کھڑے قد سے زمین پر آ رہی۔

اب تو جتی اور دادی نے مل کر وہ ہائے دہائی کی اپنی کوٹھی والے بھی جاگ اٹھے۔ بڑی بیگم ہو کر پلنگ سے اٹھیں تو چابیوں کا گچھا ٹخنوں پر ہتھوڑے کی طرح لگ کر بجا۔ ایک سیکنڈ کو پاؤں پکڑ کر رہ گئیں لیکن پھر فوراً ہی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئیں منجھلے بی نے نہایت سستی سے ایک جماہی لے کر اپنے آپ سے کہا۔

"فیصلہ ہو گیا شاید۔" اور پھر کروٹ بدل لی۔

"کنیز اے کنیز ادھر تو آ' کیا ہوا؟"

"ہائے کنیز کہاں کنیز تو چل دیں۔" دادی کی پھٹی ہوئی آواز گونجی اور بڑی بیگم ننگے پاؤں ہی ادھر بھاگیں پیچھے سے سلمیٰ بی بھی اپنا ساٹن کا پٹی کوٹ سنبھالتی نکلیں۔

"چل دی؟ ارے بھئی غضب ہو گیا۔ اب کیا کریں؟" کلیجے میں پنکھے سے لگ گئے۔

مگر کنیز تو وہاں موجود تھی مری بھی نہیں تھی کیسی صاف سانس چل رہی تھی۔ "اے اصغری بیگم تم نے تو دہلا دیا کیا ہوا؟" بڑی بیگم کے ننگے تلوے جیسے ابھی تک بھوبل پر تھے۔

"ہوا کیا بی' نصیب کے لکھے پورے ہو گئے' کبھی ہمارے گھروں میں کاہے کو ایسا ہوا تھا۔ اس پاکستان نے مٹی خراب کر دی۔"

"رہنے دو بوا رونے دھونے کو' چپ ہو' کم بخت سے لونڈیا کا پنڈ چھٹ گیا۔ مہر کیا فیصلہ ہوا۔ لڑکا تو اسی کو ملا کیا ہو گا۔ لڑکیاں بھی

اس کے منہ پر پھینک دی ہو تھی۔ گندی بوٹی کا گندہ شوربہ۔"

"ارے بیٹی کوئی اولاد کیسے چھوڑ دیوے' ارے میں تو پالے پوسے کی محبت میں گھر سے بے گھر ہو گئی یہ تو اس کے اپنے جنے ہیں۔ لڑکے کے غم میں بے ہوش پڑی ہے۔" دادی نے رو رو کر کہا بڑی بیگم نے کنیز کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ کنیز نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ کٹورا بھر پانی پیا اور سر پکڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

بڑی بیگم نے کنیز کو اپنے کندھے سے لگایا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "کنیز تو تو میری بچی ہے تو کس بات کا فکر کرتی ہے شکر کر تیرا اس کم بخت سے چھٹکارا ہو گیا۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے؟ دیکھ لینا ایسی جگہ بیاہوں گی کہ تو اپنی خوشیوں میں مجھے بھی بھول جائے گی۔ پرسوں ہی تیری بات آئی تھی۔ لڑکا پنسو کا نوکر ہے۔ میں نے کہہ دیا' ابھی بھی لڑکی کا فیصلہ نہیں ہوا۔ پھر مجھے لڑکے کی شکل بھی پسند نہ تھی اے اصغری بوا جیسی بنی کنیز کی شکل صورت ہے ویسا ہی جوڑ کا لڑکا ہو۔

اسی دوران میں سلمیٰ بی جا چکی تھیں۔ یہ سارے کام انہوں نے اپنی اماں پر چھوڑ رکھے تھے۔ انہیں تو بس اپنے کام سے کام تھا۔ دادی نے گھور کر سلمیٰ بی کو کوٹھی کی طرف جاتے دیکھا' انہیں یہ لونڈیا پھوٹی آنکھ نہ بھاتی کنیز سے تو کافی ہنس بول لیتی' مگر دادی کو دو انگلی کی سلام بھی نہ کرتی' جیسے وہ ان کی نوکر ہوں۔ وہ تو غریبی میں کبھی کوئی شرافت مر جاتی ہے' دادی کو کیا پڑی تھی جو کسی کی خوشامد کرتیں۔ ان کے اپنے "بڑے میاں" کا مراد آباد میں چھ بھوں کا مکان تھا۔ وہ تو آئے دن خط لکھتے رہتے کہ آ جاؤ تم نے بھتیجی کی اولاد کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا' مگر وہ بے چاری باولی تھیں اپنے مرحوم بھانجے کی ذرا سی بچی کو دادی کی طرح پالا شادی بیاہ کیا اب یہ قسمت کہ اس کا میاں پاکستان آیا اور وہ بھی دیوانی بنی اس کے پیچھے چلی آئیں' مگر یہ باتیں آج کل کی لڑکیاں خاک سمجھیں؟ وہ تو بڑی بیگم کی مروت تھی جو دادی سلمیٰ بی کے تیوروں پر کچھ نہیں کہتیں۔ اور پھر اس وقت تو جہاں سلمیٰ بی پیٹھ پھیر کر کھسکتی چلی گئیں وہاں بڑی بیگم نے سب کو ابنوں کی طرح سمیٹا اور اپنے کمرے میں لے گئیں۔

ان کے کمرے میں پلنگ دو ہی تھے ایک پر سلمیٰ بی پہلے سے مست دھرے پڑی تھیں' اب بڑی بیگم کی مسہری پر اتنے لوگ کیسے بیٹھتے سو فرش پر ہی پاندان کھلا۔ دکھ سکھ کی یادیں ہوئیں' اور خوب ہوئیں۔ دادی روئیں' کنیز "مچل منہ پر ڈال کر سسکی تو بڑی بیگم کی آواز بھی بھر آئی' سلمیٰ بی نے بڑی بیگم کے اتنے خلوص پر سوتے میں کئی بار ہوں ہوں بھی کی۔" تو بیٹھے بیٹھے بڑی بیگم کی کمر میں درد ہونے لگا۔ اور وہ دادی کے اصرار سے اپنے پلنگ پر لیٹ گئیں' مگر اس وقت کنیز کے غم میں کہاں بولیں "کنیز بیٹی میرے پاس آ جا۔ اری میں کہتی ہوں منہ سے کہے کا بھی کیسا پیار ہوتا ہے تجھے بیاہوں گی تو کیسے قرار آئے گا؟"

یہ سن کر دادی کے ہاتھ قبے کی طرف اٹھ گئے۔ "اللہ بیکسوں کے لیے تو ہی دنیا میں فرشتے بھیج دیتا ہے۔ دادی کی آنکھیں ایک بار پھر پرآب ہو گئیں۔ اور کنیز کے زخموں کی جلن کچھ کم ہو گئی"

وہ شرماتی پائنتی بیٹھ گئی۔ بیگم سے اس کی عقیدت پیروں اور ولیوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ بیگم نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر پھر فوراً ہی گنٹھیا کے درد سے مجبور ہو کر اپنے ہاتھوں اپنی پنڈلیاں مسکنے لگیں۔

"اماں بیگم سو رہیے۔" کنیز نے انہیں زبردستی لٹا دیا اور ان کی پنڈلیاں مسکنے لگی۔ بڑی بیگم نے بہت نہیں نہیں کی۔ دادی کو بھی کنیز کی اتنی عقیدت آنکھوں ہی آنکھوں میں کھل گئی، مگر وہ ایک نہ مانی۔ اس نے سوچا کیا ہوا۔ کوئی بیٹی ماں کے پاؤں دبانے میں بے عزتی ہوتی ہے ...... ارے یہ ماں نہیں تو اور کیا ہیں انہیں ہم سے کیا مطلب تھا بھلا اس دیس میں کون کسی کو پوچھے ہے۔ ایک یہ بیچاری اپنی طرف کی مل گئیں جو انہوں نے اپنا بنا کر گھر میں جگہ دے دی، ورنہ اماں بیگم کوئی شدھ تو نہیں کہتی ہوں گی۔ کہ سارے پنجابی بھرے پڑے ہیں اس دیس میں۔" "آپ جناب" تک کا مذاق اڑاوے ہیں مگر عشرت کو یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ طلاق کے دو بول لکھ کر دے دیئے اور اپنی کوٹھڑی سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ اب تمہارا مجھ سے پردہ واجب ہے۔ یہ نہ سوچا کہ اپنے مراد آباد میں اس طرح کرتے تو ایسا کچھ برا نہ تھا۔ وہاں میاں نصیبوں جلی کا گھر تو تھا۔ اپنی سگی پوتیوں سے زیادہ سمجھ کر پالا۔ دادا اس بڑھاپے میں بھی ہر طرح مدد کو تیار ہوتے۔ . پر اس پاکستان میں تو دادی غریب کا ساتھ بھی اس حالت میں نہ ہونے کے برابر . دادا کا پیسہ کوڑی بھی آنے کا کوئی راستہ نہیں، ... نہ یہاں رہنے کا کوئی وسیلہ نہ جانے کی آس۔ بے خبر ہو گئے۔ ارے یہ جنم کا ساتھی اس نے تو سکی آنکھیں پھیر لیں کہ طوطا بھی کیا پھیرے گا۔ یہ نہ سوچا کہ اس بڑے شہر میں کہاں جاؤں؟ نہ عدت گزارنے کی جگہ نہ مہر نہ بچوں کا گزارہ پھر دعویٰ کیا تو وہ بھی برائی کہتا ہے ویسے تو گزارہ دیتا پر اب ضد پکڑ گیا ہوں۔ ارے ایسی ہی جی میں ٹھانی تھی تو پھر پاکستان کیوں بلوایا اتنے دن سے جدائی کی مجھ بیٹے مر کر چھٹ پٹ یہاں بلا کر منجدھار میں چھوڑ دینے کا کیا تک۔ وکیل تو کہتا تھا اب مراد آباد میں جا بسنا بھی مشکل ہے پرمٹ مہینے دو مہینے کا بنے گا... ... دادی کو تو شاید دادا کی وجہ سے رہنے کی اجازت بھی مل جاوے پر میرا مشکل ہے۔ ہائے کیسے بے گھر بے در کیا۔ ارے عشرت تیرے پیارے تجھے روئیں۔ ......"

اور کنیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ . بیگم سو چکی تھیں۔ دادی بھی تھکی ہاری ڈھلک گئی تھیں سب صبر کر بیٹھے تھے مگر کنیز کو صبر کیسے آ جاتا سات سال کا پالا پوسا لڑکا چھن گیا۔ اف اب پتا نہیں کہ بچی کا کیا بنتا ہے۔ دادی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں خود اس کی ایسی عمر نہیں کہ اکیلی کہیں محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر لے۔ بقول بڑی بیگم چوبیس پچیس کا سن صورت شکل کی کچھ تو بس قبول سی کھچا

ہو۔ اس پر بھی عشرت بدنصیب کا دل دوسری جگہ اٹکا۔ مراد آباد سے نوٹوں کی پوٹلی باندھ بیوی بچوں کو چھوڑ پاکستان چلے گئے کہ بس جیسے ہی وہاں برتنوں کا کارخانہ چلا سب کو بلا لوں گا دادی تو عشرت کے بچپن سے خوب واقف تھیں اس پر سے کنیز کی طبیعت کی تیزی بھی ان سے کچھ چھپی نہ تھی... جب عشرت نے کنیز کو جھوٹوں بلایا تو انہوں نے فوراً ہی آنے کی تیاری شروع کر دی۔ کنیز کو اکیلے کیسے بھیجتیں۔ دنیا نہ کہتی کہ لونڈیا کو اکیلے پردیس جان بوجھ کر بھیج دیا اور خود بڑھے خصم کے کولہے سے لگی بیٹھی رہیں سو چا لڑکی ذرا دل بس لے تو پھر چلی جاؤں گی مگر یہاں آ کر جو دیکھا کارخانہ وغیرہ سب چوپٹ اور عشرت میاں ساتھ ستر کے کسی دکان پر ملازم اور یک بنگلے کے سرونٹ کوارٹر کی ایک کوٹھری کے پانچ روپیہ مہینے کے کرایہ دار۔ دادی کلیجہ مسوس کر رہ گئیں انہیں حالوں ہوتے جب بھی گزر ہو جاتی مگر ان ساتھ ستر میں عشرت کی دل لگی بھی تو چلتی... اور کنیز کی زبان چلتی.... دادی رکھ کنیز کو کام دیتیں مگر وہ تو آپے میں نہ تھی..... اور ایک دن عشرت نے بدزبانی اور فضول خرچی کے الزام میں طلاق لکھ دی...... لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور کنیز کو ہانک کر کوٹھری میں تالا ڈال دیا... نہ کوئی داد نہ فریاد..... اور جب کنیز اور دادی روتی پیٹتی کسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کی تلاش میں نکلیں تو بڑی بیگم تک پہنچ ہی گئیں۔ پہلے تو بہت بے رخی سے پیش آئیں مگر جب دکھیاریوں کو بے آسرا دیکھا تو پگھل گئیں نہ صرف کوارٹر مفت رہنے کو دیا بلکہ کنیز کو بیٹی تک کہہ دیا..... مانگنے والے کی قسمت ہے آگ مانگے اور پیمبری تک مل جائے۔

وہ بڑی بیگم جو اب کنیز کی اماں بیگم بن چکی تھیں اس وقت گٹھیا کے درد سے نجات پا کر گہری نیند میں منہ کھولے سو رہی تھیں اور کنیز ان کی پائنتی بیٹھی اب چپکے چپکے آنسو بہا کر تھک چکی تھی۔ اپنا کوئی پیارا مر جائے جب بھی رو دھو کر صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ طبیعت ہلکی ہو ہی جاتی ہے۔

کنیز کی طبیعت تھوڑے ہی دنوں میں ہلکی کیا بس پھول سی ہو گئی اب عشرت کی حیثیت کنیز کے لیے ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں دادی کے منہ سے سنی ہوئی کوئی ادھوری کہانی' جسے سناتے سناتے دادی کی آنکھ لگ گئی ہو اور کنیز دادی کے خراٹے سن کر دو چار منٹ بعد "ہوں ہوں" کرتی خود بھی سو گئی ہو..... اور جب صبح آنکھ کھلے تو کٹورا بھر دودھ، روٹی اور کپڑے کی گڑیوں کی بڑی بڑی ٹک پاروں جیسی آنکھوں کے سامنے کہانی یاد کرنے کی کسے فرصت؟ کسی کی یاد آنے کے لیے بھی تو فرصت چاہیے اور کنیز کو اب اماں بیگم کی کوٹھی میں اتنی فرصت کہاں تھی دادی عشرت کو کوستیں تو کنیز منہ بنا کر کہتی "اے دادی تمہیں کوئی کام نہیں کیا۔ جو بیٹھی اس کے نام کی مالا جپ رہی ہو۔ مجھے تو اس کے نام سے اپنا بچہ یاد آوے ہے اللہ سے کبھی تو اتنی سمجھ دے گا کہ اپنی میاں سے آ ملے گا۔ ہوا

کر مبر کر جاتیں۔

کنیز سلمٰی بی کا کامدانی و سادھانی دوپٹہ اوڑھے دادی کے پاس کھسیانی ہوئی آتی۔

"اے دادی کچھ تو ہوش کی دوا کرو لوگ سمجھیں گے شریفوں والی عادتیں ہی نہیں" یہ کہہ کر وہ دوپٹہ لہرا کر سر پر ڈالتی۔

"لاؤ میری لونڈیا کو تمہیں تو میری اولاد کھلے ہے ایک تو چھن گیا۔" اور وہ جی کو کھسوٹ کر کو ہے پر رکھ لیتی پھر بڑبڑاتی "کیسی میلی ہے۔ سارا نیا دوپٹہ غارت کر دیوے گی۔"

"نیا دوپٹہ تو تمہاری آنکھیں بھی پھوٹ گئیں' یہ دو بڑے بڑے بھبھوتے تو ہیں دوپٹے میں' سوا سڑا ہوا دوپٹہ اوڑھ کر اترا دے ہے۔" دادی غرا کر کہتیں۔

"واہ ابھی کل تو سلمٰی اوڑھ کر کانج گئی تھیں' سائیکل میں آ گیا ہوگا۔ اے دادی بہت کیسی طبیعت ہے تمہاری۔" کنیز اور بھی کھسیا کر کہتی۔

اور دادی آپے سے باہر ہو جاتیں۔

رے جس کے کارن سر منڈایا وہی کہے منڈی آئی۔ اب تو مجھ میں سارے عیب نظر آ دیں ہیں تجھے۔ تیرے پیچھے بے وطن ہوئی' سب تج تج تجھے اور تیری لڑکیوں کو کھلاؤں ہوں اور اماں بنے وہ۔"

کنیز گھبرا کر دادی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور پھر خوب ہی تو روتی' دادی کو اس بات کا طعنہ دیتی کہ وہ کھلا کر گناتی ہیں' اس کی قسمت پھوٹ گئی اس لیے دادی کی آنکھیں بھی بدل گئی ہیں۔

لیکن جب کنیز کی آنکھیں روتے روتے سوج جاتیں تو دادی اس کی خوشامد کرتیں اور دونوں میں میل ملاپ ہو جاتا۔ مجی پھر دادی کی گود میں چڑھ جاتی اور دادی مجی کی انگلی پکڑ کر رات کی ہنڈیا روٹی کے بندوبست کے لیے بازار کو روانہ ہو جاتیں اور کنیز ایک بار پھر چھلاوہ بن جاتی' کبھی باورچی خانے میں کبھی کون کمرے میں' کبھی سلمٰی بی کے کمرے میں

کنیز سلمٰی بی کے کمرے میں ایک آدھ بار نکل جاتی۔

"اے سلمٰی بی یہ قمیص تو ہم لیں گے۔"

"واہ ابھی تو بنائی ہے ہم نے' نہیں دیتے۔" سلمٰی بی کا سا جواب دیتیں

"اے دیدے دو سلمٰی۔ کیا کنیز تیری بہن نہیں۔ اللہ کتنی خسیس ہے تو بھی۔ تو یہ میری بچی نے کیسا منہ چھوڑ کر مانگا۔ ایک تو وہ خود ہی

تی غیرت دار ہے کہ کبھی کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ دے دے۔" بڑی بیگم کنیز کی تنک کو فوراً پہنچتیں۔

"اوں پھر ہم کو اور قمیص بنا کر دو اتنی ہی قمیصیں تو ہیں میرے پاس" سلمیٰ بی نخرہ دکھاتیں۔

"تو اب میں کہاں سے لاؤں، تمہارے بابا کون سی لاکھوں چھوڑ چلے تھے میرے پاس۔ جانے کیسے الطاف میاں کی پڑھائی اور تمہارا خرچہ پورا ہو رہا ہے بینک میں اب دھرا ہی کیا ہے۔ اب کیا کہوں کیسے گزر ہو رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے۔" بڑی بیگم ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں۔

گزر کرنے ہی کی تو بات ہوتی ہے۔ جب گزر نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ کنیز کا برقع پردہ زیادہ دیر کیا چلتا، اب سلمیٰ بی کے ساتھ باہر اٹھنا بیٹھنا کنیز کو فرصت ملے اور سلمیٰ کی سائیکل میں پنکچر بھی ہو تو کبھی کبھی لمبی چوڑی سڑک پر چہل قدمی بھی ہو جاتی، کنیز ذرا باہر کا قصد کرتی اور دادی مردود چوہے کی طرح جیسے بد رنگ برقع لیے کنیز کے سر پر موجود ہے۔

یک دن تو حد ہی کر دی، بڑی بیگم کے سامنے بولیں۔ "تا بیوی بٹیر برقعہ عورت دیکھ میرا تو جی جل جاوے ہے۔"

بڑی بیگم بیچاری ہمیشہ دادی کا لحاظ کرتیں۔ اصغری بوا کہتے منہ خشک ہوتا مگر اس بات سے ان کے تن بدن میں مرچیں لگ گئیں۔

"اے بوا رہنے دو شیخی بگھارنے کو ہمارے گھرانے میں جیسا پردہ ہوتا تھا بھلا کیا مقابلہ کرو گی، میری لڑکی کی مجال نہیں تھی۔ وہاں کھڑکی سے جھانک لے پر اب دیس چھٹا، وہاں کی باتیں چھٹیں اب کنیز میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ اب تو ویسے یہ گھر بیاہی جائے گی جہاں میاں کے ساتھ سیر کو جائے گی ... ویسے بھی میرا کوئی حق نہیں! ہم تو تم پر جان دیں اور تم"

دادی چپ ہو گئیں لیکن کنیز نے اس دن پرانا برقع دھو دھا کر جی کی فرکس مشین پر جڑ کر ڈالیں۔ سچ ہے بے چاریاں کب سے پچھلے حالوں پھر رہی تھیں۔ .... چلو مہینہ دو مہینے تو اس طرح گزر ہو ہی جائے گی۔ اس کے بعد..... اس کے بعد .... رب کیا سوچتے باپوں کے دل میں، اللہ رحم نہیں ڈالتا ......؟ کنیز نے سوچا اور اس کے کلیجے میں ٹھنڈی پڑ گئی۔

لیکن گزر ہوتی کیسے، تن ڈھکنے گئے آہستہ آہستہ پیٹ خالی رہنے لگے دادی کنیز کی صورت دیکھتے ہی کھڑا لے بیٹھتیں۔ "اب کہاں سے لاؤں، قسم لے لو جو اب کچھ ہو میرے پاس؟" روز روز کی چل پکار بچے گی.... لیکن دادی کو چھوڑ رات دن کنیز کے پیچھے لگی رہتیں۔

"اماں روٹی، اماں سالن۔" بڑی بیگم سنی ان سنی کر فوراً اپنے سامنے کی چیز اٹھا کر دے دیتیں اور کنیز شرما کر بچوں کو نچے

چھتروں کوڑوں کی طرح سینے لگتی جی چاہتا ارے غیرت کے مر جائے۔

"اے بچی مجھے کیا غیرت امیرے تو عقل سے نوا رشیں اترے گا انہیں بچوں کا دیکھ کر تمہیں ان کی مامتا ہے تو مجھے بھی ہے مگر میں کہتی ہوں بچی تمہیں میرے ہی گھر تو نہیں بیٹھا رہنا ہے۔ اللہ وہ دن لائے گا اپنے گھر بار کی ہوگی مرد ذات سوتیلے بچوں سے گزر نہیں کرتے میں تو کہتی ہوں بچی کلیجے پر پتھر رکھ کر ان دونوں کو عشرت گوڑے کو دے دے کم بخت کو ذرا پتہ تو چلے کہ طلاق دینا بچوں کا کھیل نہیں۔" بڑی بیگم کنیز کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھی۔

کنیز کے دماغ میں تو بات بیٹھ گئی لیکن دادی کسی طرح نہ مانتیں کنیز رو رو کر دادی سے کہتی۔ "ارے دادی مجھ بدنصیب کے ساتھ کیوں لڑکیوں کی مٹی پلید کرو گی تم اب کہاں سے کھلاؤ گی؟ مگر دادی تو کانوں پر ہاتھ رکھتیں۔

مگر جب ایک دن دادی باوجود دلی خواہش کے اپنا صندوق نہ کھول سکیں اور دن بھر چولہا نہ جلا تو کنیز ضبط نہ کر سکی۔

"اے دادی اب نکالو نا روکڑ" کیوں لڑکیوں کو عذاب دے کر مار رہی ہو۔ کنیز چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری بوٹیاں نوچ لو اب کیا دھرا ہے میرے پاس اب اپنی کوٹھی والی میاں سے کہو نا۔" دادی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

رہنے دو اماں بیگم کا نام کیوں بیچ میں گھسیٹتی ہو وہ کہاں سے لا دیں؟ ان کے پاس ہو تو میرے بچوں سے غرض کرنے والی نہیں وہ۔ کیا کیا کریں وہ وہ تو وہی سانپ کے بل میں سے ہی کے چھپے والی بات کرتی ہو۔" کنیز کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔

"اچھا تو پھر چل اپنے مرادآباد مہینے دو مہینے کا پرمٹ تو بن ہی جاوے گا۔" دادی نے آخری حربہ استعمال کیا اور کنیز کا دم نکل گیا۔

"اچھا کرایہ نکالو پرمٹ بنوالو۔" کنیز تنک کر کہہ کر کھاٹ پر منہ ڈھک کر پڑ رہی دادی کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ کہیں سے چار جانوں کا کرایہ اور وہ بھی ہوائی جہاز کا چلو ہو گیا مان لیا پرمٹ بھی بن گیا۔ پھر وکیل جو کہتا تھا پرمٹ ختم ہونے پر واپسی ہوگی پھر کیا ہوگا؟

رات کو کنیز نے ننھی بچی کو رو رو کر دادی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ دادی روتی کپکپاتی بچی کو گود میں اٹھائے ننھی کی انگلی پکڑے عشرت کی کوٹھری تک پہنچیں۔ عشرت نے ننھی کو تو چوم چاٹ کر گود میں بٹھا لیا اور بچی کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی بولا۔ "میں اتنی سی چھچھوندری کو کہاں اٹھائے پھروں۔ اب ایک ہی رکھو۔ مامتا ختم ہو گئی تمہاری؟"

دادی کے سینے سے لگے بچی کو زبردستی اتارنا چاہا تو بچی کی چیخوں سے کلیجہ ہل گیا دادی بغیر کچھ جواب دیے بچی کو لیے واپس آ گئیں۔ اور کنیز جو بچی کو دیکھ کر گود چھپائے روتی دوڑی تو بس بیگم کا کلیجہ ہل گیا۔ صمد دی نے اپنے کپکپاتے سر کو اور ہلا کر کہا۔

"سچ ہے مامتا بھی کیسی بری شے ہے۔"

لیکن وہ چار دن بعد ہی سوکھ کر زرد اور آدھے دن کی مریض بھی نے ٹی کی یاد میں مڑک کر دادی کی کمر پر رات دن چڑھائی جو شراب کی تو "ماما" کی طرف سے ان کے خیالات میں بڑی انقلاب تبدیلیاں برپا ہو گئیں۔

"اللہ تیرا پردہ ڈھک لے بچی اری بدنصیب کا کوئی نہیں ہووے ہے نہ ماں نہ باپ۔ "دادی کی زبردست آہیں کوٹھی کے کونے کونے میں گونج اٹھتیں۔

وہ یہ رات دن کے نوحے یہ آہیں سن سن کر بڑی بیگم کا دل ہل جاتا۔ گھر میں جوان بھتیجی بیٹی وریت میں پانچ سال کی چڑھائی کے لیے گئی ہوا جوان شیر سا بیٹا۔ وہ گھر کے ایک کونے میں ایلم کھا کر دو گھٹے ہوئے بوڑھے پھونس سسر اس کوٹھی کے واحد مرد اس پر قریب الوطنی مستزاد... ان حالوں میں کوٹھی کے اندر دادی کے وقت بے وقت کے نوحے نہ یہ دیکھیں کہ دونوں وقت مل رہے ہیں نہ یہ کہ اذان کی آواز آ رہی ہے۔ بس ہر وقت دنیا کی بے ثباتی کے نقشے کھنچ رہے ہیں' کوئی نے نہ نے دکھڑے بیان ہو رہے ہیں۔ .. بیگم خوست کم کرنے اور اپنا دھیان بٹانے کو اس سے زور زور سے سلمیٰ اور الطاف کی شادی بیاہ کی منظر کشی کرتیں .. کنیز کے جہیز کی تفصیلات کے بارے میں سلمیٰ سے مشورہ طلب کرتیں۔

"اے بھئی اب تو کنیز بی کا بھی اپنے ہی اوپر فرض ہے ابھی سے تیاری کریں گے تب جا کر دو چار سال میں ایسا جہیز بنے گا کہ ہزار پانسو والا بھی دیکھ کر خوش ہو جائے۔ سمو کنیز کے لیے وہ نگوں والا سوٹ کیسا رہے گا۔ اس پر گھٹے کا بھی خوب... بالکل سینما کی شہزادی دکھے گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ منہ سے یہ کنیز تھوڑی سی ہی بچی لگتی ہے کہ اگر کسی کو بے نہ دکھائے جائیں تو کنواری ہی لگے۔ "

بھی کو بڑی بیگم کے دیئے ہوئے قلمی آم کھا کر دست لگے ہوئے تھے کنیز کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت کہاں کہ اسے پتہ بھی نہ چلتا' ذرا فرصت ملی تو سلمیٰ بی کی ڈریسنگ ٹیبل کے بیچ آئینے کے سامنے کھڑی کامدانی والا دھانی دوپٹہ سینے سے ڈھلکائے دیر سے کنگھی کیے جا رہی تھی۔ خدا جانے کب تک آئینے کنگھے سے جوجھی رہتی اگر دادی کی پھٹی ہوئی آواز کمرے میں نہ گھستی۔

"اری کنیز دیکھ تو سہی نامراد ڈھونڈیا آنکھیں پھیرے لیوے ہے۔" اور کنیز غرارے میں الجھتی بھاگتی ہوئی۔ بھی بچی گردن ڈالے دے رہی تھی۔

"ہائے دادی میری بچی کو کیا زہر کھلا دیا' ہائے سب تو چھوٹ گئے تھے۔ یہ ایک ہی تمہیں کھل رہی تھی' یہ مر گئی تو مجھے بھی نہ پاؤ گی دادی۔"

اسی رات ہسپتال میں بچی چپ چاپ مرگئی۔ کنیز نے مرنے کی بہت کوشش کی۔ سر پھوڑ ڈالا۔ دھانی مدایکا دوپٹہ دانتوں سے نوچ کر چندی چندی کردیا۔ مگر دادی اس سے پہلی ساتھ ساتھ لڑھکتی پھریں اسے مرنے کا توقع ہی نہ دیا .. دادی کو تو اپنے پالے پوتے کی اتنی آگ تھی پھر جس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہو اس کے دل کا حال کون نہیں جانتا۔

کنیز نے کئی وقت کھانے کی طرف نگاہ اٹھائی رو رو کر آنکھیں اتنی سوج گئیں کہ وہ پلک اٹھانے سے بھی معذور ہو گئی' اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر بڑی بیگم کے دوپٹے کا پلو بھی آنکھوں سے نہ ہٹتا . .. سلمی بی بھی کئی بار کنیز کے گلے لگ کر سسکیاں لیتیں اور پھر آنکھوں پہ ہاتھ رکھے اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔

مگر کوئی کہاں تک روئے' دریاؤں تک کو نکاس کی راہ مل جائے تو اتر جاتے ہیں پھر بڑی بیگم کی غمخواریاں' وہ رات دن اسی فکر میں گھلتیں کہ کنیز بچی کا غم بھول جائے ایک منٹ کے لیے بھی اسے اپنے پاس سے جدا نہ کرتیں' چاہا بھی نہ بیٹھنے دیتیں' سلمی بی کو بھی اب اس کا اتنا ہی خیال رہتا۔

"آؤ کنیز دوپٹے میں ستارے ٹانکیں۔" وہ چنا دوپٹہ لے بیٹھتیں اور کنیز غم کی ماری کٹھ پتلی کی طرح ادھر ہی لگ جاتی' ایک ایک ستارہ یوں احتیاط سے ٹانکتی جیسے اپنے کلیجے کے ناسور نمائش کے لیے رکھ رہی ہو۔

"آؤ بیٹی کنیز سلطو کے دادا میاں کے پاجامے سی ڈالیں۔ بیگم لٹھے کا تھان اس کے سامنے پھیلا دیتیں اور کنیز وہاں بھی جٹ جاتی۔

غرض بڑی بیگم اور سلمی بی نے کنیز کا غم بھلانے کے لیے کوئی حد نہ اٹھا رکھی کئی بار بڑی بیگم کنیز کی خاطر سینما تک چلی گئیں . سلمی بی نے اپنے کپڑوں کی الماری کھول دی کہ جو چاہے لے لو .... بڑی بیگم نے ہی جھینگا کا سونے کا چھلا تک اتار کر اسے پہنا دیا۔

وہ چپکے سے اس پر جھک کر بولیں۔ "ہماری کنیز کا دولہا اسی طرح انگوٹھی پہنائے گا... . ."

وہ کنیز اس دن بچی کی موت کے بعد پہلی مرتبہ شرما کر کمرے میں بھاگ گئی۔ اور آہستہ آہستہ وہ پھر یوکلپٹس اور گولر کے درختوں میں دبکی ہوئی پراسرار سی کوٹھی میں چھلاوہ بن گئی۔ ابھی سلمی بی کے کمرے میں ہے تو ابھی باورچی خانے میں بیٹھی سویوں کا زردہ پکا رہی ہے۔ اسے لونڈا چوکی کہ وہ بڑی بیگم کے غسل خانے میں غائب ذرا وقت نہیں لگا کہ بڑی بیگم کا چوڑی دار پاجامہ اور سلمی بی کا دوپٹہ اوڑھے برآمدے کی چکنی سیڑھی پر کیسا کپڑا الٹا ستا کر فرش چمکا رہی ہے اب یہ بھی کوئی تک ہے نہا دھو کر یہ گندہ کام؟ بڑی بیگم ماکوار کہہ

رہی ہیں کہ ری کنیز تجھ سے کون کہتا ہے ایسے کاموں کو۔ جنگلن کن کاموں کے پیچھے ہے مگر کنیز بھی کسی کی سنتی بھلا۔ بڑی بیگم نے زیادہ ہڑ بڑی تو دوڑ کر نلکے سے ہاتھ دھوئے اور تیل کی شیشی لیے بڑی بیگم کے سر پہ موجود کہ ہم تو تیل دبائیں گے۔ بڑی بیگم کی آنکھوں سے محبت نور کی شعاعیں بن کر پھوٹنے لگتیں۔۔ اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہے بنا نہ رہ سکتیں کہ کنیز جس گھر جاؤ گی اجالا کر دو گی۔ عشرت موا گنوار کا لٹھ تیری قدر کیا کرتا؟

"اے تو پھر اب کنیز کے لئے بر ڈھونڈو نا میرے میاں کے خط آویں ہیں کہ مرتے وقت تو ساتھ دو۔ میں یہاں کب تک جوان لونڈیا کو لیے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو میں سوچوں لونڈیا کو ساتھ لے جاؤں رشتے برادری میں بہت لڑکے پڑے ہیں۔" دادی آئے دن تقاضا کرتیں۔

"اے اصغری بوا نام نہ لو اپنے رشتے برادری کا۔ تم نے پہلے ہی بچی کی قسمت پھوڑنے میں کوئی کسر رکھی تھی؟ میری زبان نہ کھلواؤ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ بچی سلو سے دو تین سال بڑی ہوگی اور بوا جو تم کو جلدی کی' تو میں جیسے سلمٰی کے لیے دیکھ بھال کروں گی ویسے ہی کنیز کے لیے۔ اب کوٹھی سے رخصت ہوگی تو ہمارے گھر والے کے ساتھ ہوگی۔۔ کنیز کے پیاسوں کی نہ کہو کئی مشٹنڈوں سے کہہ رکھا ہے' ہر چوتھے اٹھوارے کوئی نہ کوئی سوال کرتا ہے اب میں تمہیں کہاں تک دکھاؤں......؟" بڑی بیگم گھنٹوں بڑبڑاتی رہتیں۔

دوسرے چوتھے ہی موٹرسائیکل پر ایک شخص آیا۔ .. بڑی بیگم بہانے سے انھیں اور دادی کو بلا کر جھنکوا دیا۔

"اچھا تو ہے کر دو"..... .. دادی نے خوش ہو کر کہا۔

"تو جوئی کہہ دیا کر دو۔۔ .. میں نے پوچھ گچھ کی پتہ چلا شراب پیتا ہے میں تو نہ کروں چاہے روز آ کر ناک رگڑے۔" بڑی بیگم نے لٹکا سا جواب دیا۔

"کر دو کنیز کی قسمت سے سدھر جائے گا۔" دادی پر تو جلدی سوار تھی انہیں تو اچھا بھلا بھولا سا لگ رہا تھا لڑکا۔ پھر انہوں نے کاہے کو بھی ایسا "صاحب" دروازے آ پڑ دیکھا تھا۔ وہ تو کہتیں بدنصیب طلاقن کو کوئی مرد کی شکل جڑ جائے یہی بہت ہے۔

"پھر تم ہی لڑکے سے بات کرو میں تو بیچ میں نہ پڑوں گی۔ تمہاری ذمہ داری پھر شکایت نہ کرنا۔" بڑی بیگم دروازے سے ایک طرف ہو گئیں۔

دادی کلیجہ مسوس کر رہ گئیں انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ ان کی بدنصیب کنیز کے ایسے مرغاب کے پر لگ گئے ہیں۔

آئے دن بیگم راہ چلتے لوگوں کی طرف شارہ کر کے بتاتیں" ارے دیکھو! صغری بوا اس لڑکے کی اماں نے مجھ سے کہا تھا چاہے کنیز دے دو چاہے سلمٰی۔ نہ بیوی اس سے تو میں کبھی نہ کروں۔ کالا کلوٹا۔"

ہر شخص میں کوئی نہ کوئی عیب۔ دادی اکتا کر رہ گئیں' جہیز کے کپڑوں پر کپڑے بننے لگے برتن خریدے جانے لگے اور دادی کو ذرا ڈھارس ہونے لگی کہ دنیا میں منہ بولے کی بھی کچھ وقعت ہے۔ انہوں نے اپنے میاں کو لکھوایا۔

"ارے میاں ذرا صبر کرو منڈیا کا ٹھور ٹھکانہ کر کے بس جلدی جاتے میں پہنچوں گی .... پھر چاہے ہم دونوں پاکستان آ کر پڑے رہیں گے۔ لونڈیا کے گھر اپنے بے ایک کوٹھری تو کہیں نہیں گئی۔"

مگر ایک دن ان کی ساری اسکیم ملیا میٹ ہو گئی دادی اس دن کنیز کی بے تو جہی پر بہت بپھری ہوئی تھیں۔ بچی کے مرنے کے بعد بڑی بیگم نے اصرار کر کے دادی کو الگ کھانے پکانے سے منع کر دیا تھا۔ سو اب وہ شرما حضوری کوٹھی کے باورچی خانے سے کھاتی تھیں۔ حمید وہیں لگ گیا تھا اور بیگم کہتی تھیں کہ میرے سونے کے بندے لے کر بھاگا ہے۔ پولیس تھانہ کون کرتا' مگر انہوں نے آئندہ کے لیے توبہ کر لی تھی کہ مرد نوکر کو ہرگز کوٹھی میں نہ رکھیں گے۔ قریب کا سودا تو دادی مرچی کے لے ہی آتیں' مگر دور بازار جانا ہو تو اس کے لیے وہ مجبور تھیں۔ کنیز نے سلمٰی بی کی سائیکل چلانا تو سیکھ ہی لی تھی۔ ایک دن بولی۔" دادی سودا میں لے آؤں۔ سائیکل پر دوست لگیں گے۔"

دادی کے گھرانے میں بھلا کاہے کے جوان جہان عورتوں کی یہ جرأت تھی! آپے سے باہر ہو گئیں۔

"اے بڑی ہوش کی دوا کر' کیوں میاں دادا کی عزت کے درپے ہووے ہے' کھود کر گاڑ دوں گی اور آؤ نہ کروں گی ..... "

یہ تو گویا کھلم کھلا بڑی بیگم کی تربیت اور سلمٰی بی کے چال چلن کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ حد ہوتی ہے بے صبری کی۔ بڑی بیگم کو کوئی اور اس طرح کہتا تو جوتی سے منہ مسل دیتیں اس کا۔ جوتی تو نہ اٹھائی مگر سنائیں بے بھاؤ کی۔

"شرم نہیں آتی اتنی بوڑھی ہو گئیں۔ کوٹھیوں میں رہو گی تو کنجڑوں قصائیوں کی طرح رات دن کی بھاں بھاں نہ چلے گی۔ دادا کے ساروں میں ہمیں بدنام کر دو یہ سننے والے انہیں بھی تمہارے جیسا سمجھیں گے"

"اے دادی تو مجھ بدنصیب کو دم نہ لینے دیویں گی۔ یہ تو مجھے مار کر مریں گی" اللہ تو میرا پچھا کا نیوان ہے۔" کنیز بھی ضبط نہ کر سکی۔ آخر وہ اتنے دن سے کوٹھی والوں کے خلاف دادی کا معاندانہ اور جارحانہ انداز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اللہ یہ دنیا فرشتوں پر بھی عیب لگانے سے نہیں چوکتی۔

دادی کنیز کی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکیں خوب لڑیں اپنے سارے احسان گنائے اور اسی وقت ہندوستان کے لیے پرمٹ کی درخواست دینے نکل کھڑی ہوئیں۔

"اے بڑ جا مرے کوڑا دے جوان ہو گئے کو . پر دادی ایسی کہ بھاگنے کو ڈر دیں۔

"اے بڑ جا مرے کوڑا دے جوان ہو گئے کو .. پر دادی ایسی کہ بھاگنے کو ڈرا دیں۔ جا میں میرا کون ساتھ دینے والا ہے۔" کنیز کے ان طعنوں کے باوجود دادی نے اپنا پرمٹ بنوا لیا دبے دبائے زیور کام آ ہی گئے۔ گر وہ بھی کھلا دیئے گئے ہوتے تو آج مانگے بھیک نہ ملتی۔ چند مہینے سے کنیز کو نہ کھلایا تو آج کنیز کی آنکھیں بدل گئیں جوتے مارنے کی کسر رہ گئی۔ دادی سوچتیں' کہتے ہیں جس کے پاس دام ہوں اس کا مردہ بھی رونے والے بہت' پرمٹ کے دفتر کے ایک کلرک نے جلد ہی ہوائی جہاز کی ایک سیٹ بھی ریزرو کر دی' اور دادی اپنی پنجی اٹھا چلنے کو کھڑی ہو گئیں' ہر طرف سے دل شکستہ۔ اپنے میوں کے ساتھ مرنے جینے کو۔

تانگے میں سوار ہونے سے پہلے دادی کا دل بھر آیا ... "کنیز میری قدر ہووے گی..... ابھی کچھ نہیں گیا... بچے مجھے کے بیچ کر مرا دادا آ جائیو' مہینہ دو مہینے میں وہاں تیرا فیصد ..."

"جانے دو دادی... میری بچی کو مار ڈالا میری بی کو چھنا دیا کہ کھلانے کو نہیں ... اب کہاں سے تمہارے کرائے نکل آئے ہائے میاں مجھ بدنصیب کو کیوں جنا تھا؟" کنیز نے منہ پھیر لیا اور دادی کا منہ کڑوا ہو گیا۔

تانگہ چلنے پر کنیز باورچی خانے کی جالی سے لگ کر یوں روئی کہ سارے زخموں کی کھرانڈ تڑ گئی۔ ٹپ ٹپ خون کی بوندیں گرنے لگیں۔

عشرت' ممتاز' نی بجی' اور دودی سب دھم دھم کرتے زخمی کلیجے پر سے اچھلتے کودتے غائب ہو گئے۔

بیگم نے سینے سے لگایا۔ سمی بی نے تسلی کے لیے اس کا منہ تک چوم لیا۔ حد تو یہ ہے کہ سمی بی کے دادا تک نے اس دن اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور کنیز کے آنسو پلکوں پر ہی جل گئے۔ لیکن وہ کئی دن تک جیسے کھوئی سی رہی۔ وہ کوٹھی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے جاتے رک جاتی۔ سڑک پر نظر ڈالتے ڈالتے کچھ ٹھٹھک جاتی ..... کچھ اس طرح جیسے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ گئی ہوں اور وہ ایک دم کھلی فضا میں پھینک دی گئی ہو۔ اور اب یہ فضا اسے ڈرا رہی تھی... وہ ایک ٹوٹی تیلی اٹھا لی چونچ میں لے لگاتی اور پھر رکھ دیتی۔ سارے رشتوں سے آزاد ہو کر وہ خود کو کس قدر اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ مں

جاڑے کی تیز تیز ہوائیں چلتیں پیڑوں تلے آم' گولر' جنگل کے زرد پتے چرمر دب کر ٹوٹتے۔ ہر طرف ایک عجیب سا سناٹا' ایک

سوچتی سی ویرانی' بڑی بیگم لان میں پلنگ بچھوائے زیادہ وقت پنڈلیوں اور کمر پر تیل کی مالش کرواتی رہتیں' سورج سر پر چمکتا' پھر بھی ان کے جوڑوں میں سردی گھسی درد پیدا کرتی رہتی۔ انہیں دنوں ایک ڈاکٹر انہیں دیکھنے آیا کرتا۔

بڑی بیگم نے ایک دن دن ڈھلے دھندلی سی کنیز سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب تجھ کو کیسے لگتے ہیں؟"

وہ کنیز ایک عرصے بعد پھر چونکی۔ داری کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ وہ کنواریوں کی طرح مسکرا کر سرخ ہو گئی اور فوراً وہاں سے اٹھ گئی۔ بہت دنوں بعد جیسے پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بجلی کی پھرتی بھر گئی..... اس نے جی لگا کر باورچی خانے کی صفائی کی' برتن سوکھی راکھ سے اس طرح رگڑ کر' مانجھے کہ چاندی کے نئے زیوروں کی طرح چمک گئے... اس کے بعد جب وہ دلہائے گھر کی روزانہ صفائی اس محنت سے کرکے کہیں مکڑی کے جالے کا ایک تار شدہ رہ سکا۔ ایک تنکا نہ رہا۔

"اے سلمیٰ' اے سلمیٰ! اپنی بہن کا ہاتھ بٹا۔ بیٹھی کیا دیکھ رہی ہے' دیکھوں گی تو کون سے گھر جائے گی جہاں اٹھ کر تجھے تنکا توڑنا پڑے گا۔"

بیگم پکار پکار کر کہتی رہیں اور سلمیٰ بی بیٹھی اپنے ناخنوں پر پیازی رنگ کی پالش کرتی رہیں۔

کنیز نے اپنے جی میں سوچا" سلمیٰ بی جیسی کا مال لوٹھ تو ماں باپ کی نظر میں بھی گر جاوے ہیں' انسان کا کام پیارا ہووے ہے چام نہیں۔"

کاموں میں جہیز کے کپڑوں کی تیاری بھی تو شامل تھی۔ کنیز راتوں کو بھی مشین کھٹکھٹاتی رہتی' پنکھے' گوٹے ستارے اور آئینے ٹنکتے رہتے۔ بیگم سستی سے ٹانگیں پھیلا کر جماہی لیتیں اور کہا کرتیں۔"دیکھیں میری دونوں بچیوں میں سے پہلے کس کا نصیب کھلتا ہے؟"

وہ نصیب کھولنے کے لیے کنیز کے حساب دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب آتے ہاتھ میں بیگ جھلاتے آتے' بیگم کی مزاج پرسی کے بعد گول کمرے میں تشریف رکھتے۔ سلمیٰ بی بنا پایا چہرہ ایک خاص زاویے سے اونچا کیے پرانے صوفے پر بیٹھتیں۔ دوران کے پس منظر میں کنیز نمودار ہوتی۔ جھکی جھکی آنکھیں' چوڑی دار پاجامہ اور پتلی کمر میں پھنسی ہوئی سلمیٰ بی کی فراک۔ ہاتھوں پر چائے کی ٹرے اس سے سلمیٰ بی خود کو کسی گل کی رانی سے کیا کم سمجھتیں پرانے صوفے سے لے کر کنیز تک ہر چیز ان کے حسن اور شان میں اضافہ ہی کرتی۔

اور کنیز شرماتی جاتی، پردوں کے پیچھے غائب ہوتے ہوئے سوچتی "اسے سلمیٰ بی بی کی بھی کوئی شکل ہے، ٹیڑھا میڑھا نقشہ اس پر سے مہاسوں کے نیلے، اپنے آپ کو پری سمجھیں ہیں کوہ قاف کی۔"

مہینے نہیں گزرا سلمیٰ بی بی کی بات بھی پکی ہو گئی اور کڑکڑاتی سردی کی ایک رات کو سلمیٰ بی دلہن بن کر رخصت بھی ہو گئیں بقول بڑی بیگم نصیبے کی بات ہے۔ پہلے سلمیٰ بی کا نصیبہ ہی کھل گیا اس کے ساتھ ہی بڑے صندوق اور متروکہ جائیداد کی الماریوں کے بڑے بڑے پٹ بھی کھل گئے پرانی ڈریسنگ ٹیبل نئی پالش سے چمک کر چل دی پرانے صوفوں پر نیا کپڑا کیا منڈھا گیا۔ وہ بھی گون کھرو سوتا کر گئے۔ .... کوٹھی کی طرح سونے ویران صندوق اور الماریاں پڑی بھائیں بھائیں کرتیں اور کنیز کے دل کی حالت تو ان صندوقوں اور الماریوں سے بھی بدتر تھی شادی کی رات سے کہر سا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف ٹھنڈ، ہر چیز گیلی، دوسرے دن جب کنیز نے رات بھر کی جگائی کے بعد بڑی بیگم کے گٹھیے کے درد کی شکایت سن کر چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں قدم رکھا تو اس کی جلتی ہوئی آنکھیں کہرے سے دھندلائے ہوئے درختوں کی افسردگی اور ویرانی پر

کنیز کو گھٹے حالوں دیکھ کر تڑپ تڑپ جاتیں۔ بیٹی بیاہ کر وہ خود ویران ہو گئی تھیں۔ اب تو کوئی آ کر کوٹھی میں جھانکتا بھی نہ تھا۔ پھر کنیز کے پیام کون لاتا وہ بیٹھے بیٹھے تھک جاتیں تو لیٹ جاتیں، لیٹے لیٹے کر تھک جاتیں تو بیٹھ جاتیں، کنیز جو الگ الگ پھرتی ہوتی تو اسے پاس بلا تیں گلے لگاتیں۔

"کنیز تو بھی میرے کولھے سے کب تک بیٹھی رہے گی، ایک دن سلمیٰ بی بی کی طرح گھر لوٹ کر چلی جائے گی، گھر میں نصیبوں جلی اکیلی کی کیلی ہائے جلدی سے وقت گزر جاتا اور اطراف ولایت سے آ جاتا۔ اس کے سہرے کے پھول کھلتے دیکھ لیتی......"

یہ کہہ کر بڑی بیگم کی آنکھیں پُر آب ہو جاتیں اور یہ سب سن کر کنیز کی تھکی ہوئی رگوں میں تناؤ سا آتا جو فوراً ہی ٹوٹ جاتا ..... بس اس کا جی چاہتا کہ وہ کچھ نہ کرے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے یونہی اماں بیگم کی طرح پڑی رہے یا پھر انہی کی طرح بات پر رو دیا کرے۔

گھر میں جو دھوپ جمتی گئی، کمروں کے کونوں میں مکڑیوں نے جالے تان لیے اور مزے سے افزائش نسل کرنے لگیں۔ باورچی خانے میں دیگچیاں کالی ہو گئیں۔ بیگم کے سسر دن بھر بغیر حقے کے پڑے دکھا کرتے وہ اب اتنی زیادہ افیم کھانے لگے تھے کہ ان کو کھانے تک کا ہوش نہ رہتا۔ ہر چیز پر ایک جمود جیسے وقت پکڑ کر تھم کر سوچنے لگا ہو۔

سلمیٰ بی کے میاں کا کہیں تبادلہ ہو گیا تھا کافی عرصے بعد دو دن کے لیے سلمیٰ بی اپنے میاں کے ساتھ آئیں گھر کی حالت دیکھ کر ہول گئیں کہ کیا برا اثر پڑا ہو گا کہ ان کے میاں پر۔ وہ بڑی بیگم سے بات کیے بغیر نہ رہ سکیں' لیکن بڑی بیگم روٹھ گئیں۔ اب کہاں تک وہ اکیلی زندگی کی گاڑی دھکیلتیں۔ صاحب زادی نے تو آ کر اعتراض کر دیئے۔ بچا ہی کیا ہے جس کے برتے پر وہ دو چار تو کر لگا کر صاحب زادی کی مرضی کا معیار بنائیں۔ سلمیٰ بی کھسیا کر رہ گئیں۔ تیسرے دن سلمیٰ بی اپنے میاں کے ساتھ گرمیاں گزارنے مری چلی گئیں' جانے سے پہلے اپنے پرانے کمرے میں وہ کنیز سے گلے ملیں' اور کہا کہ "میں نے تمہاری شادی میں دینے کے لیے ایسا اچھا سوٹ کا کپڑا ابھی خریدا ہے کہ دیکھو گی تو آنکھیں کھل جائیں گی۔"

لیکن کنیز ان کے جانے کے بعد بھی اس سوٹ کے بارے میں کوئی واضح تصور قائم نہ کر سکی۔ اس کا دل پلٹ گیا تھا۔ وہ عشرت کو یاد کرنے کی کوشش کرتی اور جب اس کا خیال بھی نہ جمتا تو بس اس کا جی چاہتا آنکھیں بند کیے پڑی رہا کرے موسم بھی تو بڑا سخت گرم تھا۔

"اماں کس کا خط ہے۔" کنیز نے بحری ڈاک سے آئے ہوئے بڑے سے لفافے کو دیکھ کر بے دلی سے پوچھا۔ اسے جانے کیوں ان دنوں دادی کے خط کا دھڑکا رہتا۔

بیگم نے لفافہ کھول کر ایک بڑی سی تصویر نکالی... وجیہہ شکل و صورت کے مرد کی تصویر تھی' بڑی بیگم نے لپک کر تصویر کو چوم لیا۔

"یہ کون ہیں اماں بیگم۔" کنیز نے جاتے جاتے پوچھ لیا۔

"اے لو تمہیں خبر ہی نہیں' میرا الطاف ہے میں نے نئی تصویر منگائی تھی۔ اے دیکھو سور نے مونچھیں بالکل صاف کر دیں' کیا برا منہ لگتا ہے۔ مرد کا مونچھ بغیر" بڑی بیگم کی آنکھوں میں مارے محبت کے آنسو آ گئے۔

اسی وقت تصویر بغیر فریم کے صوفوں والے گول کمرے میں سجا دی گئی' سلمیٰ بی کے چھوڑے ہوئے البم میں الطاف کی ذرا سی تصویر تھی' جس میں صورت شکل کا پتہ نہ چلا پر اب تو ایک ایک چیز صاف تھی۔

جب تک سلمیٰ بی گھر میں تھیں تو دل بھر برائے ہوئے الطاف کے اتنے تذکرے نہ ہوتے' لیکن اب تنہائی میں بیگم کو اس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا' بیٹیاں تو ماں باپ کے گھر چڑیا کی طرح بسیرا لیتی ہیں اور پھر اپنے ٹھکانوں کو اڑ جاتی ہیں بیٹا بیٹا ہے دیس میں ہو یا پردیس میں رہے گا ماں باپ کے گھر کا' اور پھر اب تین سال ہی تو باقی تھے پڑھائی کے۔ بیگم ایک ایک دن گنا کرتیں

"اے بیٹا۔ اے بچی کنیز کہاں ہو' ادھر تو آؤ۔" بڑی بیگم کنیز کو پکارتیں۔ کنیز تھکے تھکے قدم اٹھاتی دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی

آئی۔

"کیوں بیٹی الطاف کے لیے کون سا کمرہ صاف کرلیا جائے؟ ابھی سے کرلیں ورنہ اس کے آنے کے بعد تو مارے خوشی کے مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔" بیگم بول کر پوچھتیں جیسے الطاف بس رات کی گاڑی سے وہاں پہنچ رہے ہوں۔

وہی سلمٰی بی والا اماں بیگم۔" کنیز بیگم کے دل کی بات کہتی

"اچھا تو پھر کل مل کر کمرہ ٹھیک کریں گے" بیگم طے کرتیں۔

لیکن کنیز اس "کل" کو عموماً اپنے روز مرہ کام میں بھول جاتی' بھی کیا کنیز تو ہفتوں کنگھی کرنا بھی بھول جاتی' عرصے سے وہ بیگم کی صندوقچی میں رکھے ہوئے ننھے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھنا تک بھی بھول چکی تھی۔ اسے اب عشرت کی یاد بھی نہ آتی' نہ ممتاز نہ کی اور نہ دادی.... اور بھی تو جیسے اس کے ہاں پیدا ہی نہیں ہوئی تھی بسا اوقات وہ تو یہ بھی بھول جاتی کہ وہ کہیں بیٹھی ہے اور بیگم جن پہ اس کی جان جاتی تھی' اس کی منہ بولی اماں ہیں۔ یا محض ایک سوکھا ہوا پتہ۔

الطاف کا خط مہینوں میں آتا' اور جب آتا تو بیگم کی عید ہو جاتی' گٹھیا کا درد بھول کر سارے گھر میں ناچی ناچی پھرتیں۔

تو اس دن بھی الطاف کا خط آیا تھا

الطاف کا خط مہینوں میں آتا' اور جب آتا تو بیگم کی عید ہو جاتی' گٹھیا کا درد بھول کر سارے گھر میں ناچی ناچی پھرتیں۔

تو اس دن بھی الطاف کا خط آیا تھا

بارش کا موسم ختم ہو چکا تھا اس کے باوجود فضا میں ٹھنڈک کے بجائے گرمی کی امس تھی' کم از کم کنیز کو تو ایسا ہی محسوس ہوتا اس کی پتلی سی ستواں ناک اور اوپر کے ہونٹ پر پسینا ہی پسینا رہتا۔ کھانا تو کھایا ہی نہ جاتا.... اس وقت وہ بمشکل آدھی روٹی حلق سے اتار کر بیٹھی تھی اور اسے جانے کیوں دادی بڑی شدت سے یاد آرہی تھیں۔

"اے کنیز اسے بچی لے اور سن۔" بڑی بیگم پیچھے سے جھومتی جھامتی کنجیوں کا گچھا ہلاتی آئیں اور کنیز اس طرح چونکی جیسے وہ میں چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا' ان دنوں ذرا سی آواز پر یکی حال ہو جاتا۔

"الطاف میاں نے لکھا ہے اماں اجازت دو تو تمہارے لیے ایک بہو لے آؤں' سنکی بہو کی انگریز بالکل میم سی لگتی۔ لو بھی میری تو کم بختی ہے۔" بیگم کا گلا رندھ گیا کنیز اسکی بے تعلق سی بیٹھی رہی جیسے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے سڑک پر نظر ڈال رہی ہو۔

کئی بہاریں آئیں اور گزر گئیں۔ موسموں کی تبدیلیاں اپنی پوری شدت سے ظاہر ہوتیں اور پھر مر جاتیں لیکن کنیز ایک مشین کی طرح اپنے کاموں سے چمٹی رہتی۔

بیگم کئی بار اسے دیکھ کر دہل جاتیں

"اری بچی تجھے اپنا کچھ ہوش نہیں' کبھی میرے پاس بیٹھ کر منٹ بھر کمر سیدھی کر لیا کر۔ تھوڑی کچھ کھائے پیئے گی نہیں تو پھر روز روز بے ہوشی کے دورے پڑیں گے۔"

بیگم ہمدردی سے لبریز آنکھوں سے اس کا تعاقب کرتیں جو ایک ضدی روح کی طرح بوکھلائی گولر' شیشم اور جامن کے درختوں میں رکی ہوئی ننھی سی کوئل میں بے تابی سے گھومتی پھرتی۔

بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں تیزی سے گزرتی چلی گئیں۔ جیسے وقت ریل پر بیٹھ کر چلنے لگا ہو۔

سلمیٰ بی پچھلے دنوں آئی تھیں۔ تو وہ دو بچوں کی ماں تھیں۔ اور تیسرا پیٹ میں تھا صاف ستھری لیکن نسبتاً تیکھی کی منڈیروں پر وقت کے اثرات کائی کی شکل میں نمایاں ہونے لگے۔ جیسی کی دبائی ہوئی آم کی گٹھلی سے پھوٹا ہوا درخت نہ ہوگا تو جیسی ہی کے قد کے برابر ہوگا۔ لیکن کنیز کے چھوٹے چھوٹے پاؤں اس درخت کے پاس سے اتنی تیزی سے گزر جاتے کہ ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے وہ کانپ کر رہ جاتا مگر یہ تیزی یہ لپک جھپک تو کنیز کی سرشت بن چکی تھی۔

بھری گرمیوں کی ایک صبح میاں الطاف ولایت سے واپس آ گئے دنیا کا اتنا بڑا واقعہ' اتنی شدید خوشی ایک دن ظہور پذیر ہو گئی۔ مارے مسرت کے بیگم کے دو آنسو پلکوں پر آ کر ٹک گئے۔ سلمیٰ بی مارے خوشی کے دادی سے بھی زیادہ زور زور سے بول رہی تھیں' اور ان کے بچے اماں کی بے توجہی پر جی سے زیادہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔

سلمیٰ بی کے میاں الطاف سے ولایت کی تعریفیں سن سن کر تھکتے ہی نہ تھے' اور کنیز منٹ منٹ پر ہاتھ دھو کر باورچی خانے میں آتی' اور دروازے میں سے جھانک کر ساری رونقیں دیکھ جاتی۔ الطاف سے یک بارہ آنکھیں چار کر کے وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی تھی

"ہائے کیسے دیکھیں ہیں۔" کنیز چھپ کر سوچتی اور باورچی خانے میں جا کر منہ دھونے لگتی۔

"مائی۔ ذرا پانی دینا۔" الطاف میاں نے آواز لگائی ان کا حلق ولایت خوانی کرتے کرتے خشک ہو چکا تھا۔

"اوئی بیچے اس طرح نہ کہو۔" بڑی بیگم روٹھ گئیں۔ "اے وہ تو اسی گھر ہے دیکھی ری' بھلا اس کی وجہ سے مہینے کا سارا خرچ پاپاؤں سے کبھی کم ہوتا نہ چورنہ چکار۔ ویسے ہی تمہیں دو چار سو نہیں پہنچتا رہا۔ ایسی سلیقے وری ہے کہ کیا کہوں۔" بس بیگم نے کنیز کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

"ایسی ہی سلیقہ مند ہے خان بہادر وسیم کی لونڈیا میں تو... "اور اس پل پر سے بہو کا ڈولا بھی گزر گیا۔ پر پانی نہیں آیا۔

"اماں پانی تو..." الطاف میاں بڑبڑائے۔

"اے پانی نہیں آیا..... اوئی کنیز کانوں میں تیل ڈال لیا کیا؟" بیگم بڑبڑاتی اٹھیں۔

پانی نہیں آیا.. کنیز اپنا منہ دھونے میں سارا پانی بہا چکی تھی۔ وہ اپنی بے سیلقگی کے بارے میں ذرہ برابر نہیں سوچ رہی تھی ..... وہ تو درختوں کے سائے میں خزاں زدہ زرد پتوں پر قدم رکھتی سوچتی جا رہی تھی... موئے درخت بھی بے فائدہ ہوویں ہیں۔

صبح سے کتنی بار پتے سمیٹے پھر بھی ساری کوٹھی میں پتے ہی پتے۔

کوٹھی سے نکل کر وہ سول لائنز کی سب سے کھلی سڑک پر آ گئی۔ باورچی خانے میں کیسی ٹھنڈک تھی اسے اپنی ہڈیوں میں گٹھیا کا درد اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس کا دوپٹہ فراٹے بھرتی ہوئی لو میں پھڑ پھڑ رہا تھا لیکن وہ چلتی گئی اور آگے اور پھر وہ ہر ایک کوٹھی کے پھاٹک سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ اس کا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ لیکن کوٹھی کے دروازے کے قریب ہی لگے ہوئے نل سے پانی پینے کا اسے دھیان تک نہ آیا۔ بس وہ بیٹھی ہوئی لوہے کے پھاٹک کی سلاخوں پر اپنی انگلیاں پھیرتی رہی' اس کے چاروں طرف لو کے مارے زرد پتے کھڑکھڑاتے رہے اور لو غراتی رہی۔

کوٹھی کے پھاٹک سے ایک نئی کار نکلی اور رک گئی اس میں سے ایک نئی نئی سجی ہوئی بیگم نکلیں اور کنیز کے پاس آ گئیں۔

"ارے تم کنیز ہو' منی بی کے ہاں کام کرتی تھیں؟" نو عمر بیگم نے خوش ہو کر پوچھا کنیز نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا نکال دیا انہوں نے؟" بیگم نے آنکھیں نچائیں۔

کنیز پھر بھی چپ رہی۔

بیگم کار کی طرف بڑھیں۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹیں۔

"میرے پاس رہو۔ کھانا کپڑا میرے ذمے۔ ماں کی طرح سمجھوں گی۔" بیگم نے کہا۔ ور کنیز حیران رہ گئی۔

"ماں! اس جوان بیگم کی ماں۔ اے کیا کہویں ہیں لوگ! ایک دم سب کے دیدے پھٹ ہو گئے ابھی تو میری اصلی عمر تین ور تیس کی ہووے گی۔

اس نے ایک ذرد پتہ اٹھا کر پوری قوت سے مٹھی میں چرمر کر دیا۔ پانچ سال کے عرصے میں وہ بوڑھی ہو چکی ہے اس بات کا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں سے چند آنسو ٹپک کر چہرے کی مہین مہین چنٹوں میں پھیل گئے۔ اور کھچڑی بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر لوٹ رہی منٹ بھر میں اس نے سوکھے پتوں کو مسل مسل کر اپنے سامنے ڈھیر کر دیا۔

◆◆◆

بھالو

آج جمعرات تھی۔ ابھی چراغ بھی نہ جلے تھے...... اللہ رکھی کاہی چھینٹ کا لہنگا اور سکین ململ کا کرتہ پہنے اور سر پر ہرا دوپٹہ جھنڈوں کی طرح لپیٹے آج بھی سپیریل گھسیٹتی درگاہ میں حاضری دینے نکلی لیکن کسی بے تابی سے کہ نوری اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی۔ سکی برابر چپکے اس پر دل کی پیاس کا سوت شلوار پیٹ پر لگی ہی نہ تھی۔ ویسے پر وہ سوچتی کبھی کبھار پاؤں میں پڑنے والے گر گابی سے ہو تو جیسے گوشت کا بوٹا ہو کر آ بے پڑتے۔ گھر سے دو قدم پر درگاہ تھی مگر معلوم ہوتا کالے کوسوں کی بات ہے۔ مٹھی میں چراغی کے چار پیسے اور دوسری ہتھیلی پر بلیسے کی طشتری یوں منوں کا بوجھ معلوم ہوتی اگر اللہ رکھی کی چال پر کسی منہ زور جوانی نہ ہوتی۔

نوری نے ہانپتے ہوئے سوچا۔ "سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے۔ اب جیسے اماں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں بھی تو ساتھ ہوں۔" یہ سوچتے ہی اس کے رونگٹے رونگٹے سے کوئی شے کھول کھول کر سر تک آئی اور پھر وہ ننھے ننھے قطروں کی صورت میں آنکھوں میں پھیل گئی۔

لیکن یہ قطرے اسی وقت بھاپ بن کر اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی مزار شریف کے پاس کھڑی تنباکو سے پیلی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر روتے ہوئے کہہ رہی ہے "میاں اے میرے میاں ...... ہار یا دن ہو میری۔ وہ حرامجادی پھر بھاگ گئی۔ میں تو تھک گئی سے نوں کی اس حرامخور کو میاں اے میاں۔" فرطِ احترام سے وہ چھٹ چھٹ کر کم سے کم "روزمرہ" میں اپنا دکھڑا میاں حضور کی درگاہ میں پیش کر رہی تھی۔

نوری کا دل بھی کچھ غوطہ سا کھا گیا۔ مگر کھل کر روتی کیسے۔ درگاہ تو درگاہ ہے۔ کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ کچھ لوگ بعد میں آ کر چھیڑتے۔ نظریں نیچی کیے کیے بلیسے کی طشتری اور چراغی کے پیسے مزار کے مجاور احسان اللہ میاں کے حوالے کیے جو انہوں نے پھرتی سے مزار کے مطابق میں چڑھا دیے۔ چڑھاوے کے ساتھ ہی اللہ رکھی اور بھی بکھر گئی۔ ایسا بلک کر روئی کہ نوری کے آنسو بھی بہہ نکلے۔ سویرے سے بھوکی بھی تھی۔ صبح محمد قصائی نے کچھ چھیچھڑے اور ہڈیاں کاغذ میں لپیٹ لایا تھا جو پک کر بھی نظر میں نہ سمائے۔ پھر پہلوان سے جو بچے وہ اللہ رکھی اور بچوں کے نیک لگے۔ اسے بالشت بھر اونچے شوربے میں ایک ہڈی ڈوبی ملی۔ وہ بھی

بچھڑنے کو جی نہ چاہا۔ ان دنوں گوشت تو اسے یوں بھی اچھا نہ لگتا۔ سویرے سے کیسا کیسا جی ہو رہا تھا۔ کہ ایک گھٹی ہاری سی جی میں ہے۔ مگر ان دنوں اس کی فرمائش آج کل پر ہی ٹلتی رہتی۔ حد تو یہ ہے کہ صبح چولہے کی مٹی کھانے کو جی چاہا۔ یک ذرا سی کھرچی تھی کہ اللہ رکھی ڈکاری۔

"اری ماں بچی چولہا تھونسنے لگتی ہے۔ تیرے یار آکر چولہا بنائیں گے؟"

نوری نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اللہ رکھی کی بانہہ پکڑ کر باہر لائی میاں احسان اللہ ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے

"نہ دو بھی زمانہ ہی برا ہے۔ اور دماں سے سرتابی کر کے بھی سرخرو نہیں ہو سکتی۔ نوری اللہ رکھی کو سمجھا دو! رپٹ لکھا دو تھانے میں جہاں ہوگی پکڑ آئے گی سالی۔"

خوب تو گویا اللہ رکھی اب میاں احسان اللہ سے عقل سیکھے گی . . . وہ تو اسی دن رپورٹ لکھا چکی تھی جس دن بھانو غائب ہوئی۔ داروغہ جی نے پہلے تو اللہ رکھی کو فحش گالیاں سنائیں مگر جب اللہ رکھی نے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتار کر ان کے قدموں پر رکھے تو کہیں جا کر کچھ دھیمے پڑے۔

داروغہ جی کا غصہ کم ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ جو اللہ رکھی کے علاوہ اور سبھوں کو بھی معلوم تھی۔ لیکن کس کے سر پر اتنے بال تھے جو یہ بات زور سے کہہ سکتا؟

اس وقت جب کہ وہ چھوٹے سے اجڑے ہوئے قصبے کے واحد کھلے بندوں طوائف گھرانے کی طرف سے رپورٹ سن رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے تو گھر سے ملازم بلوا کر نکلا . اور کہا۔ "اندر بلاتی ہیں۔"

اندر پہنچے تو نازک بدن سنگار پٹار سے لدی ہوئی بیگم تھانے کی طرف کھلنے والے دروازے سے لگی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ سرمگیں آنکھوں میں آنسو۔ داروغہ جی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولیں۔

"اللہ سے کچھ تو خوف کھاؤ۔ کیوں بے قصور نگوڑی بڑھیا کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے.... یہ نہیں سوچتے کہ اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والوں کا کیا دوش . کئی دن سے قدیر میاں جو رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ ایسے ننھے بن گئے کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" یہ کہتے کہتے آواز بھرا گئی رک رک آواز میں کہا۔ "بھئی واہ خوب خاندان کا نام روشن ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی ہو کر اتنا بھی نہ کر سکتے کہ آج تک ہمارے گھرانے کے لڑکے رنڈیوں منڈیوں کے پیچھے بھاگے ہیں بھلا؟"

اس پر داروغہ جی گھبرا گئے۔ ہکلا گئے۔ کانپتے ہوئے کہنے لگے۔

"ارے بھئی کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھالو کے معاملے میں قدیر میاں۔   واہ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"اچھا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج ہی قدیر میاں کا پیچھا کرکے دیکھ لو۔ ارے میں تو قدیر میاں کی آنکھیں پہچان لیتی ہوں، ہاں نہیں تو۔" اتنا کہہ کر بیگم جھاگ جیسی سفید چاندنیوں سے ڈھکے ہوئے تختوں والے کمرے میں کھسک لیں اور گاؤ تکیے سے ٹیک کر بیٹھ رہیں۔ اس ادا سے داروغہ جی نے سمجھ لیا کہ بیگم اپنی بات سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہونے والی نہیں۔

وہ دل و جاں سے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے تھانے میں پہنچ گئے۔

رپورٹ رجسٹر میں درج نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جی نے چپ چپاتے بھالو کو برآمد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے چاری اللہ رکھی کو اس کا کیا علم ہوتا۔ اس کے کلیجے میں تو آگ بھڑک رہی تھی۔ بچھڑی ہوئی سارنی کی طرح ڈول رہی تھی۔ ہر طرف منہ اٹھا کر پکار رہی تھی۔ ارے بھالو تجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ کیسے دکھوں سے پالا خود بھوکا رہ کر تجھے کھلایا۔ پال پوس کر سانڈ کر دیا۔ ارے ان بالشت بھر کی چھچھوریوں کے سامنے کمائی کو کمائی نہیں سمجھا۔ آنے جانے والوں کی بغل سے اٹھا اٹھا کر دودھ پلایا اور باتیں سنیں۔ یہی تو زندگی کا آسرا تھیں۔ اور اب جب کہ بڑھاپا آیا تو دنیا یوں اندھیر ہو گئی۔ انوری زندگی کا آسرا تھیں۔ اور اب جب کہ بڑھاپا آیا تو دنیا یوں اندھیر ہو گئی۔ انوری فرمانبردار کس پر کتیا کا جنم لے کر آئی تھی۔ بچوں پر بچے۔ لاکھ لاکھ علاج کرو۔ پچاسوں روپے جیادائی کھا گئی مگر بات نہ بنی اور بنگی بھالو جو برے وقت میں ماں کا سہارا بنتی۔ اس کا یہ حال کہ آئے دن کم بخت ماری ہونڈوں ماڑیوں کی طرح گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رکھی کسی کے گھر برتن مانجھ کر پیٹ پالے؟ اپنا ہی پیٹ ہوتا تو خیر مگر یہاں تو کھانے والے کتنے تھے۔ اللہ رکھی پہلوان انوری کے تین لڑکے اور پھر نوری بھی تو ..... اب ایسے دنوں میں جب کہ اٹھتے بیٹھتے میں بے چاری کی سانس پھولتی تو اسے کوئی کہاں ڈھکیل دیتا۔ پورے دنوں سے بیٹھی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید کھریا مٹی ہونٹ نیلے آنکھیں مارے نقاہت کے خالی خالی۔ اس پر سے اس کا چھوٹا بچہ ابھی تک خالی چھاتی چچوڑنے سے باز نہ آتا تھا۔ ساری جان کھنچنے لگتی۔ ابھی دو ایک مہینے تک وہ ہنس بول کر کسی نہ کسی سے اٹھنی چونی تو جھٹک ہی لیتی۔ مگر اب تو اسے مارے بوجھ کے ہنسی تک نہ آتی تھی۔

اور اس زمانے میں بھالو پھر بھاگ گئی۔

"ہائے بچی! برا زمانہ لگا ہے۔ نفسی نفسی کی ہے۔ یہ قرب قیامت نہیں تو اور کیا؟ یہ بھالو و حرامزادی میری کمائی پر پل پل کر جوان

ہوئی اور جب احسان چکانے کے دن قریب ہوئی تو حرافہ ہوری کی انگلی پر سوئی بھی نہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے یاروں کے پیچھے بھاگی ہے۔ ارے کیا ہم بھی اس کی عمر کے نہیں تھے۔ کبھی پیسے کے سوا کسی سے کوئی ناطہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ بھالو ہے۔ ارے کیا یہ بھانو جاتی نہیں کہ انوری کسی کی کمائی کھانے والی نہیں۔ بس یہ مجبوری کے دن سدا تھوڑی رہیں گے۔ یہ وقت نکل جاتا تو پتی جوانی کا صدقہ اسے سال بھر بٹھا کر روٹی کھلا دیتی۔ پر اسے میرا خیال کہاں؟" انوری درگاہ سے واپسی پر رینگ رینگ کر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اجڑے قصبے کا اجڑا بازار اس وقت چراغوں اور ماشیوں کی روشنی میں چمک گیا تھا۔ کئی لوگوں نے انوری کو یوں چلتے دیکھ کر آوازے بھی کسے۔ اور انوری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے چپکے سے آنکھ اٹھا کر دیکھا اللہ رکھی سیپریں' کھسیلی' گلابی چینٹ کا لہنگا گھرتی۔ گھر کے دروازے میں غائب ہو گئی اور انوری پھر کھول اٹھی۔

"سچ ہے کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ اب اماں کو نہیں معلوم کہ میں بھی ساتھ ہوں۔ اور یہ دکھی پیاس کی شلوار بھی تو مصیبت ہے۔"

انوری کا جی چاہا کہ بیچ بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بات پر خوب روئے۔ پر وہ رو نہ سکی۔ بس چکرا کر ایک دوکان کے تختے سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اے بے انوری، یہاں کیوں رک گئیں، گھر چلو۔" کسی نے دھیرے سے کہا۔ انوری نے پسینے میں ڈوبے ڈوبے ایک ذرا آنکھیں کھولیں۔ یہ غالباً حنیفہ تھی۔ نہیں یہ یقیناً حنیفہ تھی۔ یہ نرمی حنیفہ کے سوا کس کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے؟ اس نے کمر میں درد کی لہر محسوس کرتے ہوئے آنکھیں تھوڑی سی کھول کر سوچا اور پھر بنا بازو حنیفہ کے نرم ہاتھ میں پکڑائے اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ . . . اور انگنائی میں پڑی ہوئی کھاٹ پر دھم سے گر پڑی۔ . . گھر میں بھی ذرا دیر کو سکون نہ ملا۔

اللہ رکھی اور پہلوان گھریلو اور بازاری سیاست پر زور شور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

"اے خالہ ذرا انوری کو دیکھو۔ اس کا جی بگڑ رہا ہے۔" حنیفہ غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ کڑی آواز میں بولا۔

"اللہ خیر کرے میاں تیرا کا صدقہ۔" اللہ رکھی جھپٹ کر انوری کے قریب آئی اور جھلنگی کھاٹ میں انوری کے ڈوبے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ "جیا دائی کو بلوا دوں بیٹا؟"

"اے نہیں بس اب ٹھیک ہے جی۔" انوری نقاہت سے بولی۔ اور اللہ رکھی لمحہ بھر رک کر پھر اپنے مورچے پر جا ڈٹی۔ چھپر تلے بنے ہوئے چولہے کے پاس لہنگا پھیلا کر بدستور بیٹھ گئی۔ چلم کو ہتھیلیوں میں ایک خاص زاویے سے دبا کر ایک دو زور کے کش لیے۔

حنیفا چیزی سلگاتا بولا "خالہ میں دوکان پر چل کر آؤں گا۔"

اللہ رکھی نے جواباً ایک دو کش اور لیے۔

"اس بار لونڈیا آتی دکھائی پڑے ہے۔ پورے دن بھر رہے ہیں۔" اللہ رکھی نے

روتے ہوئے پہلوان کو خوشخبری سنائی۔

"ہاں رے حنیفا۔ ہوئی نہ ہو لونڈیا۔ دیکھیو۔ پیشاب سے مونچھ منڈا دوں جو پھر لونڈ نہ جنے۔ چھاتی پر چڑھ کر کمائی کھائیں گے

کتے کے بچے۔ تین کیا کم ہیں جو چوتھا بھی گھر دیکھ رہا ہے۔ چڑیا ذات شرم نہیں آتی۔ شریف زادیوں کی طرح لونڈے جنے۔"

پہلوان اپنی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرتے ہوئے ڈکارا۔

"چل رہنے دے نکھٹو۔ لونڈے ہوں یا لونڈیاں۔ تیری کمائی تھوڑی کھا لیں گے۔" اللہ رکھی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "ارے

ہاں کمبخت کی ناک بھوں ہر وقت چڑھی رہتی ہے۔ جیسے سچ مچ کا خاوند ہو۔ کما کما کے سارے کمائی اڑا دی کمبخت نے۔ بے دو کوڑی کا

نہیں۔ تجھ سے لاکھ روپے کے۔"

"ہوں بڑی کمائی ہے تیرے گھر خود تو دو کوڑی کی تھی۔ ایک لونڈیا کتیوں کی طرح سال بچے جنے بیٹھ جاتی ہے۔ دوسری مستانی

ہاتھ ہو رہی ہے۔ کمائی کے نام دھیلا نہیں بھاگ بھاگ کر تبرک کی طرح بٹتی ہے تو بھی جوانی میں ایسی ہو گی۔ بیٹی ماں پر جاتی ہے۔"

پہلوان نے چیخ چیخ کر کہا۔

"کہے دیتی ہوں زبان روک لے۔ موبھلا میں کیوں ایسی ہوتی، جو ماں نے کہہ دو کیا۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے ماں کی مرضی کے

بغیر ہاتھ میں بھی چھوا یا ہو۔ اب تو زمانہ ہی برا ہے اس میں کسی کا کیا دوش۔"

دوش کیوں نہیں۔ اری تو نے کسی میرے جیسے کے پاس ایک بار رکھا ہوتا تو ساری منہ زوری .... اونٹ پہاڑ تلے آئے تو بلبلا

چھوڑ دے۔ میں نے کتنی بار کہا کہ .... "پہلوان کے منہ پر دل کی بات آ گئی۔

"بس بس شرم گھول کر پی گیا۔ ہائے بھلا کوئی دیکھو تو سہی ہائے مری ماں!" اللہ رکھی چلم چولہے میں اوندھا کر بے بسی سے رو پڑی۔

سچ مچ رونے کی بات تھی۔ جب لوگ سوارے قاعدے قرینے پاؤں تلے روندنے کو تیار ہو جائیں تو پھر بے چاری اللہ رکھی اور

کرے بھی کیا۔ دو دن سے پیسے کوڑی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ آج تو پنساری نے "تا دال" بھی ادھار دیا تھا۔ بھالو جو بھاگی ہوئی

تھی۔ اب اس میں بے چارے پنساری کا بھی کیا قصور جب گردی رکھنے کو چیز ہی نہ ہو تو پھر ادھار کوئی کس برتے پر دے؟ ادھر تو پیٹ

کی ہائے دیا پڑی ادھر پہلوان پر پہلوانی سوار۔ اللہ رکھی کمر پہ ہاتھ رکھے جیسی درد سے آنسو بہا رہی تھی۔ کچھ خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ننھی تنگ گھر میں چراغ بھی نہ جلا تھا۔

پہلوان محاذ پر خاموشی دیکھ کر لال لنگوٹ پر تہبند باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ آج یہاں روٹی کا آسرا نہ تھا پھر بیٹھ کر کیا کرے؟ اس بے رخی پر اللہ رکھی اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک زمانہ وہ تھا ایک زمانہ یہ ہے۔" اللہ رکھی نے روتے ہوئے سوچا۔ "ماں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دانت ٹوٹ رہے تھے۔ پر تیور کافی تانی تھا۔ اس کی بیاہتا کے گھر دو سال پہلے ہی بچہ ہوا تھا..... مگر لتہ اللہ کی وضع داری تھی۔ اس زمانے میں اللہ رکھی کی جوانی کچے پھوٹ کی طرح کھل رہی تھی۔ مجال ہے جو خیر قصائی نے بھی اللہ رکھی کی طرف ایسی ویسی نظر ڈالی ہو۔ بیٹی کہہ کر پکارا اور بیٹی ہی سمجھا۔ اور ایک یہ پہلوان ہے 'کھانے چائے' کو آگے آگے۔ نام کرے اللہ رکھی سے یاری کا اور نظر رکھے اس کی بیٹی بھالو پر . . . آگ لگے ایسے زمانے کو۔ عزتیں سلامت نہیں رہیں۔ جبھی تو ہر چیز سونے کے بھاؤ ہو گئی۔ جوان جوان لڑکے قصبے سے بھاگ لیتے ہیں۔ کبھی برس دو برس میں فوجی سپاہی بن کر آتے ہیں۔ یا پھر کسی مل کے مزدور تو ناک بھوؤں چڑھاتے پھرتے ہیں جو اس اجڑے دیار میں دو رہ گئے تو سمجھو دور اندیش ہیں۔ اللہ رکھی کے گھر قدم رکھتے ہیں تو پیسے پیسے پر تکرار کرتے ہیں۔ نہ کوئی تحفہ نہ کوئی تحفہ۔ قصبے میں سچ پوچھو تو اب ایک اللہ رکھی کا گھر ہی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا منبع نہ تھا۔ اب تو چوری چھپے ہاں کیوں کے گھر فیض جاری تھا۔ ہائے دوسروں کے پیشے میں گھستے۔ دوسرے کے پیٹ پر لات مارتے شرم نہیں آتی لوگوں کو . . . اماں نانی کے زمانے کا بنا ہوا مکان جگہ جگہ سے تنک الگ الگ کر گر رہا ہے۔ پتا نہیں کہ دو ہی اینٹیں لگ جائیں ارے جس کے دو بیٹیاں پہلے زمانے میں ہوتیں تو سمجھو کھیتی کی ہمہاری۔ اور اب دو بیٹیوں کے ہوتے بھکارن سے بدتر۔ آٹا روپے کا دو سیر نہیں جڑتا۔ اس پر ایک جنم جلی سہرے جلووں والی شریف زادی کی طرح سال پیچھے بچہ جنتی ہے۔ اور دوسری آگ لگی دوسروں کے پیچھے چھچھوندر کی طرح گھمتی پھرتی ہے۔ اور یہ پہلوان بس کم بخت روٹیاں ٹھونسنے بیٹھ جاتا ہے اس سے کیا کوئی بیٹی اٹھائے۔

اللہ رکھی امنڈ امنڈ کر آنسو برسانے لگی۔

"اری بھالو تو مر جائے۔ کسی کوے کتے کی آئی تجھے آ جائے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اری بھالو گھپا لی کھٹیا لگے۔

اری مینو سا میری یہ اولاد تو میرے لیے سب ہی بھو ہو گئی ری میا"

وہ اسی لیے تین عدد اولاد گھر کے اندھیرے میں چیں چیں کر رہی تھی۔ اللہ رکھی کا رونا پیٹنا سن کر ٹھٹھکی۔ کسی نے کچھڑے سے ست

پیٹ کرتے سے ناک پونچھی۔ کسی نے آنکھ اور کسی نے ناک۔ اور بڑی آسانی سے بھول گئی کہ اس وقت ملنے کی امید نہیں۔

اور پھر سب نے اکٹھا رونا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی پرانی اینٹوں کی گرتی ہوئی دیواریں ایک دم جیسے تنگ سی لگنے لگیں۔ آسمان پر ایک تارہ چمک کر ٹوٹا۔ انوری ہول کر رہ گئی۔ "اے ہے اماں بچوں والے گھر میں شام کو تنے" اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سب سے چھوٹے بچے کو گھسیٹ لیا جیسے وہ اسے کہیں بھاگنے سے روک رہی ہو۔

اللہ رکھی اس مداخلت بے جا پر سانپ کی طرح پھنپھنا کر اٹھی۔

"کیا کہا تو نے؟ لو یہ اور آئی حرام جادی بچوں والی۔ اری یہ جو نچلے تجھے نہیں سجتے۔ شرم ہوتی تو ڈوب مرتی کسی کنویں میں۔ ایک تو حرامی پلوں کی فوج کھڑی کر دی۔ اس پر سے صدقے کروں اس فوج کو۔"

انوری غریب سدا کی نازک، کم سخن اور فرمانبردار، مگر اس وقت تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بس بس اماں خبردار جو میرے بچوں کو کوسا، وہ ذرا خیال نہیں۔ میرے بچے کسی کی روٹی نہیں توڑیں گے۔ اپنی جوانی کا صدقہ تمہیں بہت کھلایا۔ اپنی جان کو جان نہیں سمجھا۔ ساری زندگی میں بھی کبھی کسی سے منہ نہیں موڑا۔ اور تمہاری مٹھی گرم کی۔ کونسا ہے تو اس حرافہ کو کوسو۔ میرا نام ہوگی تو میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ جہاں تنکوں کی روکھی سوکھی کھاؤں گی۔ پھر دیکھیں گے تم بہو کو کیسے میری طرح دبا لو گی۔"

انوری کی اس خوفناک دھمکی کے بعد خدا جانے اللہ رکھی کیا طوفان اٹھاتی۔ مگر خیر ہوئی کہ اس وقت بازار کے بہت سے لوگ ایک لال پگڑی کے پیچھے پیچھے اندر گھس آئے۔ اور پھر کسی نے بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ یہ حفیظ تھا۔ وہی شلوار اور مرمری ریشمی قمیض اور وہی تیل میں چپڑے ہوئے پٹے۔ سرمے سے لبریز آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ۔ انوری کو بے تکا سا خیال بجلی کی طرح کوند کر آیا۔ "ارے یہ تو موا حفیظ دوستی دوستی میں ہمارے گھر گھس کر ہمارے گاہک اپنے واسطے پھنسانے آتا ہے۔۔۔۔ "توبہ حفیظ کو انوری کے اس خیال کا پتہ لگ جاتا تو اس کے خلوص کو کیسی ٹھیس لگتی ۔۔۔ اسے یہی کرنا ہوتا تو کم بخت پنواڑی کی دوکان سے سر کیوں مارتا؟

"اے خالہ بھولو آ گئی۔ مبارک۔" حفیظ خوشی سے چہک کر بولا۔

اور اسی وقت مجمع میں گپ شپ شروع ہو گئی۔ بھولو کو مجمع کے بیچ میں سے دھکیل کر تھانے کا سپاہی سامنے لایا۔

ہاتھ رسی سے کس کر بندھے ہوئے۔ ململ کی وہی نئی ساری جو وہ بھاگتے کی وقت پہنے ہوئے تھی۔ بیچ گوٹ کے بجائے سرخ رنگ کا حاشیہ اور وہی چھوٹی سی کرتی۔ مگر ہر چیز کیچڑ میں لت پت اور ادھڑی ہوئی۔ جیسے سخت گھنگھریالے بال جھوجھو کی طرح

کھوپڑی پر چھائے ہوئے۔ جیسے اس نے مدتوں سے خوب ڈٹ کر ہاتھا پائی کی ہو۔ مگر اب وہ اس کے سامنے نظر نیچی کیے کھڑی جھوم رہی تھی۔ ویسے تندرستی کے بھوت سے رہنا اس کی عادت تھی۔ جبھی تو سب اسے بھالو کہتے تھے۔

"چل اندر" یہ کہہ کر اس نے بھالو کا ہاتھ پکڑا اور کوٹھری میں دھکیل کر کنڈی چڑھا دی۔ قصہ ختم۔ مجمع بڑا مایوس ہوا۔ ذرا بھی تو گرما گرمی نہ پیدا ہوئی۔

لیکن اللہ رکھی کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ گئی تھیں کہ اس وقت لوگ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں ہیں۔ ہاں بھئی کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے .... اچھا تماشہ پتہ دیا ہوا بھلا۔ اللہ رکھی تیوری چڑھائے چولہے کے پاس گئی اور چلم بھرنے لگی۔

"جنگل میں مانک پوری کی طرف جاتی تھی۔ میں نے پکڑ لیا۔" سپاہی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

اللہ رکھی چلم بھرتی رہی۔

"اب باندھ کر رکھو اسے .... کہ اب کبھی تنگ کرے تو مجھے بتانا۔ ساری مستی مار مار کر نکال دوں گا...."

پنساری باڈنگ کھنکار کر بولا۔ "بھائی اللہ رکھی کم مار دیتی ہے؟ پچھلی دفعہ بھاگی تھی تو تین دن کھانا نہیں دیا۔ زنجیر میں باندھ کر رکھا۔ پہلوان نے جو تیار ہے سوانگ بالکل سیدھی ہو گئی تھی مگر پھر تھوڑے دن میں بھاگ لی .... کیوں اللہ رکھی؟"

اللہ رکھی اطمینان سے مسکرا دی اور چلم سپاہی کو پکڑا دی اور خود انوری کے بچوں کو لے کر لٹکتی ہوئی چھپریا تلے بیٹھ کر چولہا سلگانے لگی۔

مطلب یہ کہ دربار برخاست۔ کھانے پکانے کا وقت ہے۔

لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا ہرج کرتے۔ ایک ایک کر کے کھسک لیے۔ سپاہی نے بیٹھ کر تمباکو کے دو ایک کش لگائے۔ انوری یا تو اب تک مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھی تھی یا سپاہی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر دوبارہ جھلنگا کھاٹ میں ڈوب گئی۔ اس کا چھوٹا بچہ دودھ چچوڑے جا رہا تھا۔

سپاہی نے اکتا کر گوبر جیسی بے مزہ تمباکو کے دو ایک کش اور لیے۔ قطعی گھریلو فضا تھی وہاں وہ زیادہ دیر نہ رکا۔ چلتے چلتے سوچا۔ آج بھالو ہے بڑی۔ کل پرسوں اللہ رکھی سے بات کروں گا۔

سپاہی کے جانے کے بعد اللہ رکھی ہنڈیا چھوڑ کر اٹھی اور باہر نکل گئی اور جب چند منٹ بعد واپس آئی تو دوپٹے کے پلو میں ادھر کی کھچڑی بندھی ہوئی تھی۔ چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں کی آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک اٹھیں۔

نوری اور اللہ رکھی میں کوئی بات نہ ہوئی۔ انوری کو انگنائی میں ٹھنڈک رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ مگر وہ جائے کہاں۔ چھپر یا تلے الٹی رکھی اور کوٹھری میں بس ہوا اس وقت تو سے بھی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پڑی اونگھتی رہی۔ رات کافی گذر چکی تھی۔

"او نوری! لو یہ کھا لے۔" اللہ رکھی تام چینی کی پلیٹ میں بڑے سلیقے سے کھچڑی لیے حاضر ہوئی۔

"نہیں کھانا۔" انوری کی ناک میں گھی کی خوشبو آئی۔ اس نے جبر کر کے کروٹ بدل لی۔

"کھا لو انوری" حنیفا عطر میں مہکتا پٹی پر بیٹھ گیا۔ "اے بے چاری خالہ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تم کھا لو۔ . . . "

مگر حنیفا کا صلح کا جھنڈا انوری نے پیروں تلے روند دیا۔

"نہیں مجھے دوسرے کی کمائی سور حرام ہے۔ اب تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انوری نے زور سے کہا پلیٹ میں کھچڑی پر رکھی ہوئی آم کے اچار کی پھانک بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ انوری نے منہ کا پانی نگل کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"اری تو کہیں نہیں جائے گی۔ بس چھوڑ' تجھے کھانا ہے' سو کہنے سے کھا لے۔"

حنیفا اسے اکھڑنے لگا۔ اور اس وقت اسے حنیفا زہر لگا "آخر یہ کیوں ہمارے پھٹے میں پاؤں اڑاتا ہے۔ سوا نخوڑی اپنی دوکان سنبھالے جا کر۔ انوری نے بگڑ کر سوچا۔ وہ حنیفا کے اور اپنے گھرانے کے گہرے ہمدردانہ تعلقات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔

مگر حنیفا نے جو کہہ دو وہ سچ ہی تھا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا۔ اور کھانا تو بہر حال کھانا ہی ہے انسان کو۔ پھر جب کہ آم کا اچار ہو۔ ہاں آخر وہ نیند کے جھونکوں میں پلیٹ صاف کر کے چھپر یا تلے بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ پہلوان چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھا کھچڑی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ انوری کو دیکھ کر اس نے بھالو کی جنسیت کے بارے میں کچھ گفتگو چھیڑی مگر انوری تو سو بھی چکی تھی۔ پہلوان سچ کہتا تھا انوری تو تھی ہی سدا کی مٹی پتہ نہیں ایسی مٹی پر کون اپنے دام پھینک جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب جب آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور انگنائی شبنم سے بھیگ رہی تھی تو بے چارہ حنیفا اللہ رکھی کے مشورے کے مطابق کھچڑی کے پیسے اور چراغ لے کر بھولی کوٹھری میں پہنچا۔

بھولو زمین پر پڑی مزے سے سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب تک رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ململ کی ساری گھٹنوں سے اوپر تھی۔ اور سرخ جانگیہ رانوں پر بالکل فٹ تھا۔

حنیفا کو ہنسی آ گئی۔ کیسی جنگلی ہے یہ بھی۔ رنڈی کو مردوں کی کیا کمی۔ پھر بھی مردوں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ سچ کہتا ہے پہلوان اس

کے لیے تو سچ مچ بھالو ہی ہو   مگر ہماری اس کی خاطر کتنی بدنام ہے۔ کتنے جوتے کھاتی ہے۔ کئی بار تھانے میں بھی پٹی۔ ہزار بار تو بکی۔ مگر کیا پھر وہی۔ اللہ یہ کیسی آگ کی بنی ہوئی ہے؟

حفیظا کے دل میں ہمدردی، دو حیرانی کی ایک ملی جلی سی لہر اٹھی اور اس نے چراغ طاق پر رکھ کر بھالو کو جگایا۔

بھالو نے لال لال آنکھیں کھول دیں۔

"بھالو یہ کھالے خالہ سے چرا کر لایا ہوں۔"

بھالو کیچڑ میں سنے ہوئے ہاتھوں سے کھچڑی کھانے لگی۔

حفیظا اپنی سفید شلوار سمیت کر اکڑوں بیٹھ گیا اور بیڑی پیتے ہوئے گفتگو شروع کرنے کے لیے کوئی عمدہ فقرہ تلاش کرنے لگا۔

"بھالو تو جانتی ہے میرا تجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ منہ خالہ مجھے کچھ دے دیتی ہے نہ تو.... پر کہوں گا کہ بات بھلا بتا تو سہی اس طرح روز روز بھاگنے سے کیا فائدہ۔ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اب تو ہی دیکھ لے یہ تو چھٹی دفعہ بھاگی ہے۔ اب کی کس کے پاس رہی تھی۔۔۔ مجھے دکھا اس نے تجھے کیا دیا؟"

بھالو نے ایک لمحے کو کھچڑی پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اپنی موٹی سیاہ روئیں سے ڈھکی ہوئی پنڈلی کھجا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سچ بتا قدیر بابو کے پاس رہی تھی۔ نا؟ تو ملا کچھ نہیں ارے یہ بابو لوگ تو مفت کام چلاتے ہیں ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

بھالو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور کھچڑی کھاتی رہی۔

"اری سر تو ڈھائی سیر کا یوں ہلاتی ہے جیسے تجھے پہلے ہی سب پتہ تھا۔ پھر تو گئی کیوں تھی؟ بس بجھ لے تھانے دار و شم ہو گیا کہ تو اس کے بھائی کو پھانستی ہے اب یوں بھی اس نے تیرے منہ میں کون سا سونے کا نوالہ دیا؟"

"روٹی کا نوالہ بھی پیٹ بھر نہ دیا۔ بڑے گھر کوٹھری میں بند کر کے دن بھر کو چلا جاتا تھا۔ اور شام کو ایک دو روٹی لے کر آتا تھا۔ رات بھر سونے نہ دیتا تھا۔ پھر بھی صبر کیا۔ بھالو روہانسی ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔

"اری دیوانی اس طرح بھلا رنڈیاں کرتی ہیں۔ صبر کرے تیری جوتی۔ اس سے پہلے تو جس کے ساتھ بھاگی تھی انہوں نے بھی دو چار دن کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ اچھا قدیر بابو کے پاس سے تو خود بھاگی یا   ؟ حفیظا کریدتا ہی گیا۔

"انہوں نے کہا اب جاؤ بھالو بھی ناگن کی طرح چھپتا رہی ہے۔ میں وہاں سے چل پڑی۔"

"اچھا یہ تو بتا تو اس کے ساتھ گئی کس لیے تھی؟" حفیظ اسے داؤں پر لا کر چاروں شانے چت قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"قدیر بابو کہتے تھے بھابی کے نخرے ہیں اٹھتے' سوکھی چھوہارا تو ہے پر نخرے کاری بھر دکھاتی ہے۔"

"یہ بات تھی تو بابو صاحب کو اپنے گھر بلاتی۔ ذرا بابو صاحب کی گرہ سے کچھ نکلتا۔ ارے بابو دو پیسے آنے سے کم میں تو پان بھی نہیں ملتا ہے۔ مجھے تو تیری عقل پر غصہ آتا ہے۔ بس میں تو کہتا ہوں اگر خالہ سے تیرا دل خوش نہیں تو الگ ہو جا۔ مکان دلانے کا میرا ذمہ بس خالہ کا روپیہ باندھ دینا۔ اب بیچاری خالہ کا بھی تیرا سوا کون بیٹھا ہے؟" حفیظ نے اللہ رکھی کی پوری پوری وکالت کی ...... بھالو خاموشی سے کھاتی رہی۔

حفیظ کو اپنا جادو اثر کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ قصبے بھر میں اس کا کوئی سنجیدگی سے نوٹس تک نہ لیتا تھا۔ اس گھر میں اس کی بات تو سنی جاتی تھی پھر وہ کیوں نہ اس گھر کو بنانے کی کوشش کرتا۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں کوئی سونے یا ہیرے کا بنا تھوڑی ہوتا ہے۔ حفیظ نے ہزار باتوں کو ایک بات میں سمو دیا۔

بھالو نے کچھڑی سے ہاتھ اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا اور بڑی دیر تک ہلاتی رہی۔ اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو گھورتی رہی... . حفیظ سمجھا بیڑا ہو راہ پر لگ گیا۔

"چل اٹھ بھالو خالہ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ اور وعدہ کر پھر کبھی کسی مرد کے پیچھے نہیں بھاگے گی۔" حفیظ نے بھالو کا موٹا سا بازو پکڑ کر کھینچا۔

بھالو چپ رہی مگر وہ اٹھی بھی نہیں۔ بس چپ چاپ چراغ کو گھورتی رہی۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

بھالو پھر بھی چپ رہی۔ حفیظ تنگ آ کر اپنے سر کے پٹے کھجانے لگا۔ یہ بھالو بھی بس سالی. . . !

"حفیظ" "حفیظ" بھالو نے دھیرے سے پکارا

"ہاں بھالو؟" حفیظ نے بھالو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

بھالو کی آنکھوں میں جانے کہاں سے یک دم آنسو ابل پڑے۔ تھانے میں ایک ہر چودوں سے جوتے مار پڑی جب تو آنسو نہ گرایا اور آج پتہ نہیں کیسی چوٹ لگی۔ حفیظ ہوا کر رہ گیا۔

"میں جس کے ساتھ بھاگی' اچھا کیا یا برا کیا۔ اس بات کو جانے دے۔" بھالو نے جلدی جلدی آنسو خشک کیے۔

"پھر تو کیا چاہتی ہے؟" حنیفا جھنجھلا گیا۔

"میں تو سوچتی تھی میرے بچے ہوں، میں بھی ٹاٹ کے پردے والے گھر میں رہوں جیسے تیری ماں رہتی ہے۔" بھالو دھیرے سے بولی۔

"اچھا؟" حنیفا کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی بیوہ دکھیاری ماں کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"اچھا؟" حنیفا کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیائی کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی بیوہ دکھیاری ماں کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"سچ؟"

"ہاں؟"

"تو کیا بچے مر گئیں؟" بھالو نے بھولے پن سے منہ اٹھا کر پوچھا۔

حنیفا اس اچانک حملے سے چوک گیا۔ ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کے آنکھوں میں آنسو آگئے وہ مر گئیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ بقول اس کی ماں، اللہ دینے والا ہے جو چاہے دے دے۔

"میں تیری دوکان کے لیے چھالیہ کتر کروں گی۔ تیری ماں کی خدمت کروں گی۔ ٹھیک، میں جیون بن کر رہوں گی۔ سچ، سچ!"

اسی رات بھالو پھر بھاگ گئی۔

دوسرے دن حنیفا اکڑا اکڑ کر چلتا جو دوکان پر آیا تو لوگ وہ سارے گھسے پٹے فقرے بھول گئے۔ جنہیں سن سن کر حنیفا کے کان پک گئے تھے۔

صندوقچہ

وقت کچھوے کی چال چلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ملکہ بیگم نے تھپک تھپک کر بچوں کو سلایا تھا لیکن ان کی ساس کی عشاء کی نماز طول کھینچتی جا رہی تھی اور محمود میاں تو جیسے آج سارے سال کی پڑھائی ختم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ حد یہ کہ مسعود میاں ابھی تک اپنی بیکاری کے غم میں اپنی امریکی بشرٹ سمیت غائب تھے اور اسی تاؤ میں ان کی نئی نویلی دلہن اپنے کمرے میں خدا جانے کیا اٹھا دھری کر رہی تھیں۔

"مسعود میاں پر دھونس جمانے کو بنا جہیز سمیٹ رہی ہوں گی۔ دلہن بیگم! خوب ہیں آج کل کی لڑکیاں سمجھتی ہیں اس طرح میاں قابو خوب ہیں آج کل کی لڑکیاں سمجھتی ہیں اس طرح میاں قابو میں آ جائے گا۔" ملکہ بیگم نے اپنی سب سے چھوٹی بچی کے منہ سے دودھ نکالتے ہوئے سوچا۔ "اونہہ! یہ سارے ہتھکنڈے بھول جائیں گی بنو۔ ابھی نئی نئی ہیں اس لیے مسعود میاں جھک مار کے منا بیٹھے ہوں گے۔ بیچاری جہیز پر اترا رہی ہیں۔ ارے ہم اتنا لائے تھے کہ گھر بھر گیا تھا۔ اس پر بھی کسی نے ٹھیکے پر نہ مارا ہمیں۔"

مسعود میاں کی دلہن کے انجام کے بارے میں سوچ کر ملکہ بیگم کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ سچ ہے جلے ہوئے گھر کے ملبے پر بیٹھ کر جلتی ہوئی دنیا کا تماشہ دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑتی تو ہوک بھی نہیں اٹھتی۔

"مگر آج یہ سب سوتے کیوں نہیں؟" ملکہ بیگم نے جماہیوں پر جماہیاں لے کر جھنجھلاہٹ میں سوچا۔ "سب کے کام ہی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

توبہ"

چوکی کے گھنٹے دس بجے ملکہ بیگم نے اپنی جلتی اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں چیر کر ہر طرف دیکھا۔ محمود میاں کے سرہانے بجلی کا لیمپ اسی طرح روشنی بکھیر رہا تھا۔ اور وہ اپنی اسکول کی کاپی میں عورتوں کی تصویروں والی کتاب رکھے پڑھے چلے جا رہے تھے۔ دلہن بیگم کا کمرہ بھی ابھی تک روشن تھا۔ خدا جانے اتنی شدید گرمی میں کمروں کے اندر بیٹھ کر میاں کا انتظار کرنے میں لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے؟ ارے باہر پلنگ پر لیٹ کر انتظار کریں تا کہ تھکیں تو ذرا سو لیں۔ اور پھر ملکہ بیگم چپکے سے اٹھ کر

ملکہ بیگم کی بے تابی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سوتی اس خیال سے نہ تھیں کہ ایک بار آنکھ لگ گئی تو پھر چاہے ڈھول بجے دن بھر کی معروفیت سے ٹوٹا ہوا جسم کروٹ تک نہیں لینے کا۔ پھر تو صاف بات ہے کہ آج کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

خدا سمجھے مسعود میاں سے آج ہی نہیں پہنچے' اتنی رات گئے نہ معلوم کن دفتروں کی خاک چھان رہے ہیں۔ ہائے کس مزے سے لوگ سوتے ہیں ایک ہماری قسمت میں چین کی نیند بھی نہیں۔" انہوں نے گردن گھما کر اپنے شوہر منظور میاں کی طرف دیکھا جو اپنی راج کپور ٹائپ مونچھوں کے نیچے چوڑے دانتوں والا منہ کھولے خراٹے لے رہے تھے۔

چوک کے گھنٹے نے اب کی گیارہ بجائے۔ مگر اس سے پہلے مسعود میاں آ چکے تھے۔ وہ بہی دلہن کے کمرے کے اندر ایک معرکہ سر کرنے کے بعد اسے وہیں چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھ سگریٹ پی رہے تھے...... ارے ہاں نہیں تو کون روز روز بیوی کی خوشامدیں کر کے اس کا دماغ بگاڑے۔ آج یوں ہی سہی۔

"ارے اب مر بھی چکو کو! خدا سمجھے تمہیں نیند بھی نہیں آتی۔" ملکہ بیگم کے دل سے دھواں سا اٹھا اور انہوں نے بے چینی میں اپنا سر تکیے پر رگڑ ڈالا۔ اس بات پر فوراً ہی ان کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ مت میں بیٹے کوکوں کوں شروع کر دی۔

"او محمود روشنی بند کر دو۔ پڑھنا ہے تو اندر جا کر پڑھو گرمی میں سب کے سر پر روشنی کر رکھی ہے۔ مسعود میاں نے سگریٹ ختم کر کے دھیمی آواز میں محمود کو ڈانٹا

"ہاں محمود تو فیل ہو ہو کر اس عمر میں پی۔ اے کیا کہ سرکاری نوکری کی عمر گئی اور اب اتنے دن سے بیٹھے بھائی کی روٹیاں توڑ رہے ہو۔ شرم نہیں آتی چھوٹے بھائی کو پڑھائی سے منع کرتے۔"

ماں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مسعود میاں کو کھری کھری سنادی ورنہ وہ تو ہمیشہ مسعود میاں کو بے قصور ٹھہراتی تھیں۔ اس جھگڑے سے ملکہ بیگم کا جی خوش سا ہو گیا انہوں نے سوچا یہ بھی کہیں کہ اوپر سے دلہن بھی لا کر بٹھا دی۔ دوسروں کی کمائی کے بل بوتے پر۔

"اماں جان بس رہنے دیجئے اس وقت۔ ہاں نہیں تو..... ." مسعود میاں بکارے۔ "تجھ سے کہتا ہوں محمود بند کر روشنی۔ ذرا دیکھوں کیا پڑھ رہا ہے؟"

"کیوں دکھاؤں۔ دیکھ لو اماں جان یہ بڑے آئے کہیں کے" محمود میاں منہناتے کتابیں سمیت لیمپ اٹھا کر اماں کے کمرے کی طرف بڑھے۔

"اے بے لونڈے کو گرمی میں مارے گا۔ یہیں بیٹھ کر پڑھے گا۔ نیند نہیں آتی تو نہ سو . اس وقت کسی کی نیند کا حیا نہیں

آتا جب رات کے بارہ بجے آ کر دروازے بھڑ بھڑاتے ہوئے" اماں جان نے محمود کی حمایت کی جب سے مسعود کی شادی ہوئی تھی ان کا جی بھر گیا تھا اس طرف سے۔

ب یک بیک صحن میں منظوریوں کے خراٹے ٹوٹ گئے۔

"کیا شور مچ رہا ہے کمبخت رات کو چین سے سونا بھی نہیں ملتا۔ اور یہ روشنی کیوں ہے؟ بند کرو بجلی مفت کی نہیں ہے۔"

اس فیصلے پر ملکہ بیگم کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سب بھی ٹھنڈے پڑ گئے صرف اماں جان نے پاندان بند کر کے دو تین زوردار آہیں بھریں۔

ب ملکہ بیگم کو اپنی آنکھیں پر نیند پتھروں کی طرح رکھی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن وہ سو کیسے جائیں؟ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر وہ ان پتھروں کو دھکیلنے کی کوشش کرتی رہیں۔

صحن میں اندھیرا ہو گیا۔ خاموشی ہو گئی لیکن دلہن بیگم کے کمرے میں ابھی روشنی باقی تھی۔ پھر آہستہ سے ان کے کمرے کی چٹخنی چڑھنے کی آواز آئی اور پھر مکمل اندھیرا چھا گیا۔

ندھیرے سے آسمان پر ستاروں کی چمک بڑھ گئی۔ کہکشاں نے اپنی راہ موڑ دی۔ ساڑھے بارہ تو بج گئے ہوں گے۔ ملکہ بیگم نے حساب لگایا۔ . سب سو گئے۔ اماں جان کے دھیمے خراٹے سنائی دے رہے ہیں۔ مسعود میاں اور محمود میاں کی سانسوں تک کی آواز آ رہی ہے۔ سب سو گئے بس اب موقع ہے اب وقت ہے۔ ملکہ بیگم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس موقعہ پر ہمیشہ ان کا دل یوں ہی دھڑکتا۔ لاکھ جی کو بہلاوے دو ہزار دوں تاویلیں کرو مگر دنیا جس چیز کو گناہ کہہ دے گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر گناہ کھل جائے تو۔ ملکہ بیگم کا جسم ہمیشہ کی طرح اس خیال سے آج بھی شل ہو گیا۔

چارپائی پر زور دیئے بغیر وہ ہوئے ہوئے اٹھنے لگیں پھر بھی ایک بار پلنگ کی چول چرچرا گئی۔ اور وہ تیزی سے دوبارہ لیٹ گئیں۔

"اللہ میری توبہ" ایک ستارہ ٹوٹ کر نشیب کی طرف لپکا اور ملکہ بیگم کے دل میں بدشگونی نے اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ ستارے نہیں ٹوٹتے۔ یہ تو فرشتے شیطان کو آسمان پر آتا دیکھ کر بھالا گرز چلاتے ہیں۔

ملکہ بیگم کی قوت ایک بار جواب دے گئی۔

"یا اللہ معاف کر دے۔ تو منصف ہے تو دلوں کا بھید جانتا ہے۔ تو وہ بے انصافی بھی دیکھتا ہے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اللہ

چیونٹی بھی پاؤں کے دبی جائے تو کاٹتی ہے۔ بس تو میرے گناہ بخشنے والا ہے ـــــ" اور ملکہ بیگم کی نیند بھری آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلک آئے۔ یہ سارے خیالات سنگ ریزوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر انہیں اپنے اوپر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے ــــ۔ ذرا سی دیر کے لیے وہ دبی ہوئی سی پڑی رہیں۔ اس موقع پر انہیں اکثر ایسی کیفیات سے سامنا کرنا پڑتا۔ اور جب یہ پر عذاب کیفیات ان پر طاری ہوتیں تو وہ سمجھتیں کہ ان کے گناہ کا کفارہ ادا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملکہ بھوت کی طرح اندھیرے گھپ کمرے میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے کمرے کے اندھیرے کو جانتی پہچانتی تھیں۔ دھیمے مگر نپے تلے قدموں سے وہ اس جگہ تک گئیں جہاں وہ کنجی رکھتی تھیں۔ یہ کنجی پہلے ان کے میاں چھپا کے رکھتے تھے۔ ایک دن یہ ان کے ہاتھ لگ گئی۔ (میاں بیچارے یہ کنجی ڈھونڈ ڈھونڈ کر رہ گئے' تھک کر انہوں نے تالے کی دوسری کنجی بنوا لی تھی) اور اب وہ اس کنجی کو ایسی جگہ چھپا کے رکھتی تھیں کہ کسی کا خیال بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔

لیکن آج جب ملکہ بیگم کا ہاتھ اس جگہ پہنچا تو کنجی لے کر نہ پلٹا۔ ملکہ بیگم اندھیرے میں اسٹول سے گرتے گرتے بچیں۔ انہوں نے چیخ روکنے کے لیے اپنا کانپتا ہوا خالی ہاتھ کاٹ کھایا۔ انہیں ایک دم یوں معلوم ہوا جیسے ان کے گرد اونچی اونچی دیواریں اٹھتی جا رہی ہیں۔ اور اب وہ قیدی ہیں۔ بے بس قیدی وہ گم سم سی چپکے فرش پر بیٹھ گئیں۔ مگر انہیں یوں لگا جیسے تیز بھنور میں گھومتی ہوئی ڈوبتی جا رہی ہوں۔

اندھیرے کمرے میں مچھر گنگنا کر ان پر جھپٹتے' چیونٹیاں کپڑوں تلے رینگتیں اور کاٹتیں لیکن انہیں تو جیسے اپنا ہوش ہی نہ تھا۔ پولیس چوکی پر گھنٹی بار گھنٹے بج گئے انہیں اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔ ان سے ان کی جنتوں کی کنجی چھن گئی تھی۔ اور اب انہیں سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا بھلے ہی مچھر خون چوس لیں۔ چیونٹیاں بوٹیاں توڑ کر لے جائیں۔ پسینے میں ناک تک غرق ہو جائیں۔ کیا رکھا ہے اب اس زندگی میں۔ کیسے ارمانوں سے انہوں نے سخت اور بے رس زندگی کی دیواروں کو کھرچ کر ایک سرنگ نکالی تھی اور اس سرنگ میں ناک ڈال کر وہ اپنے آپ کو کتنا آزاد و کتنا خوش پاتی تھیں۔ لیکن آج وہ سرنگ بھی نہ جانے کن ظالم ہاتھوں ڈھے گئی۔ اتنے بڑے حادثے نے ملکہ بیگم کو سن کر دیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ دماغ پتھر کے ٹکڑے کی طرح بے حس تھا اور دل' وہ تو بس عادتاً اندھیرے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ یا ہو سکتا ہے صرف گھڑی ہی ٹک ٹک کر رہی ہو۔ ملکہ بیگم اس وقت سوچنے اور فیصلہ کرنے کی حد سے باہر تھیں۔ انہیں یہ خیال ستاتا کہ اگر باہر کسی کی آنکھ کھلی تو انہیں غائب پا کر لوگ کیا سوچیں گے۔

لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے سفید ہوتے ہوئے آسمان کی روشنی آ کر کمرے کے اندھیرے کو ہلکا کرنے لگی۔ آنگن میں ملکہ

بیگم کی سب سے چھوٹی بچی نے دودھ منہ لینے میں ناکام ہو کر ایک سے کو بکھ جھپک چاں کی اور پھر ٹھنڈی ہواؤں میں غٹ ہو گئی۔ رات بھر کی گہری نیند کے بعد منظور میاں کا جسم جاگا اور انہوں نے ساتھ کی چارپائی ٹٹولی اور پھر یک دم آنکھیں کھول دیں۔

"ارے جان۔" انہوں نے ملکہ بیگم کو کمرے میں چپ چاپ مسہری پر بیٹھے دیکھ کر کہا۔

اور ملکہ بیگم کو احساس ہوا کہ ان کے کولہوں کا گوشت بیٹھے بیٹھے سن ہو چکا ہے۔ اور صبح ہو رہی ہے۔ مگر وہ چپ رہیں۔

"یہاں میرا انتظار ہو رہا ہے' جگا لیا ہوتا مجھے۔ گرمیوں میں عجیب مصیبت ہوتی ہے کہ تم سے بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا۔" اور پھر انہوں نے کمرے کے ایک کونے میں تھوک کر ملکہ بیگم کو چوتھی کی دلہن کی طرح اٹھا کر ششیشم کی مسہری پر ڈال دیا۔

ملکہ بیگم ایک اذیت ناک ضبط سے چھٹکارہ پا کر آن کی آن میں ہچکیوں اور سسکیوں کے طوفان میں بہہ گئیں۔

ب میاں بے چارے پسپے تو مجرم بنے کھڑے رہے۔ پھر ایک دم بیٹھ گئے" آخر کچھ بولو بھی تمہیں ہو کیا گیا؟"

مگر ملکہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ بس روئے چلی گئیں۔ رات کی امڈی ہوئی گھٹا ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گئی۔ گھر میں سب جاگ اٹھے۔ ملکہ بیگم کے کمرے سے رونے کی آواز بڑی صاف آ رہی تھی۔ مگر جب میاں بیوی دونوں یک جگہ ہوں تو ور کون وہاں قدم رکھے؟

"میاں بیوی کی کوئی بات ہوگی' ملکہ بیگم کو تیل بچانے کی عادت نہ تھی۔ مسعود کی دلہن کے رنگ ڈھنگ وہ بھی دیکھ رہی ہیں' کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔" وضو کے لیے لوٹا سنبھالتے ہوئے ماں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود میاں سے کہا جو بستر پر بیٹھے سر کھجا کر نیند کا خمار اتار رہے تھے۔

"یہ عورتیں واللہ قتل کرنے میں اول" مسعود میاں نے اپنی دلہن کے بند کمرے کی طرف دیکھ کر سوچا۔ اور پھر غسل سے کھڑے ہی کھڑے متحد ہونے لگے۔

وقت بہت اذیت سے گزر رہا تھا۔ ملکہ بیگم کا کمرہ پراسرار بنا جا رہا تھا۔ منظور میاں منہ پھلائے ہوئے نکلے منہ دھویا اور پھر کمرے میں چلے گئے۔ ان سے کسی کو کوئی سوال کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

"ارے اماں جان اسکول کا وقت ہو گیا ناشتہ دیجیے۔" محمود میاں سب سے پہلے باورچی خانے میں گھسے۔

"ارے منحوس تھہر تو پہلے بڑا بھائی تو دو نقے منہ میں ڈال لے۔ سویرے سویرے ہی مچل رہا ہے میرا لال۔ اس کے دکان جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اللہ میری توبہ۔ آگ لگے ایسی زندگی کو . . ." اماں نے دانت کٹکٹا کر کہا۔ توے سے اڑتی ہوئی دھی

کی چھینٹ نے انہیں اور بھی چراغ پا کر دیا۔ انگوٹھا جل کر رہ گیا تھا۔

مگر محمود میاں نے ناشتے کا بے تابی سے انتظار کرتے ہوئے دیکھا کہ بڑے بھائی حسب معمول سیاہ صندوقچی ہاتھ میں لیے باہر نکل گئے۔ ابھی آٹھ بھی نہ بجے تھے۔ اور پھر بغیر ناشتہ کیے۔

"ارے منظور! اے ناشتہ تو کرلو تمہاری دکان پر کون نصیبوں جلا صبح صبح اپنا کفن خریدنے آ رہا ہے۔ جو اتنی جلدی نہ رہتہ چل دیئے۔" اماں جان چلائیں۔

مگر منظور میاں نہ پلٹے وہ کافی تاؤ میں تھے۔ بگڑنے کی بات تو تھی ہی گھنٹہ بھر سے بیوی سے یوں چھپکوں پھپکوں رونے کی وجہ پوچھ رہے تھے مگر وہاں کوئی جواب نہ تھا۔ ملکہ بیگم کے رونے سسکنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ مسعود میاں کی دلہن بھی اپنی خفگی بھول کمرے سے باہر نکلیں اور سیدھی ملکہ بیگم کے کمرے کی طرف چلیں۔ ان کے پیچھے اماں جان بھی پر شفا دلیا میں پیچ کر بھاگیں۔

"ارے جب سے سن سن کر کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ منظور کے ہوتے ہوئے کمرے میں آتے شرم آتی تھی۔ اب تک کلیجے پر سل رکھے بیٹھی تھی۔ بتاؤ تو ملکہ بیگم آخر ہوا کیا؟ اماں جان نے جلدی جلدی پوچھا۔

پھر مسعود میاں بھی اندر آ گئے ان کے پیچھے محمود میاں اور پھر ملکہ بیگم کے تینوں بچے۔ باہر صحن میں ان کی سب سے چھوٹی بچی حلق پھاڑ کر رونے لگی۔ مگر ملکہ بیگم سب کی موجودگی میں بھی اسی طرح گھٹنوں پر اپنا پھول سوجا منہ رکھے روتی رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت روتی تھیں۔ جب ان کا پہلا بچہ مرا تھا۔

"کیا بات ہے بہن منظور بھائی نے کچھ کہا؟" مسعود میاں نے سینہ سپر ہو کر پوچھا۔

وہی آنسو!

"کہیں درد ورد تو نہیں بھابی۔" مسعود کی دلہن نے مسہری پر بیٹھ کر لپٹتے ہوئے سوال کیا۔

وہی سسکیاں!

للہ کچھ جس نے میری بچی کا دل دکھایا ہو۔ ارے یہ بہو نہیں میری بیٹی کی طرح ہے۔ اسی سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے۔ کیا ہوا میری بچی مجھے بتا دے۔" اماں جان نے گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں پوچھنا چاہا۔

مگر وہی آنسو۔ وہی سسکیاں!

بچے بھی تنگ آ کر رونے لگے۔ بہو اور پوتوں پوتیوں کو اس طرح روتے دیکھ کر بے چاری بڑھیا بھی پھوٹ پڑیں۔

"کیا ہو گیا کسی کی شتی ہی نہیں۔ بچے بے چارے بھوک کے مارے رو رہے ہیں!" انہوں نے سفید دوپٹے سے آنسو پونچھے اور ناک سرخ کیے، اپنے پوتے پوتیوں کو سمیٹ کر باہر نکل گئیں۔

مسعود کی دلہن دوڑ کر بے بسی کے عالم میں سب سے چھوٹی بچی کو ہمدردی کا آخری حربہ سمجھ کر اٹھا لائیں۔ لیکن وہ دو بالشت کی جان اتنا تڑپی، تنا بلک کر بے چاری دلہن نے گھبرا کر اسے ملکہ بیگم کی گود میں ٹھونس دیا۔ بچی نے دودھ کی خوشبو سونگھی تو کوں کوں کر کے چہرے پر ہاتھ اور منہ مارنا شروع کر دیے۔ اچانک ملکہ بیگم کی آواز تھم گئی۔ اور انہوں نے دوپٹے تلے بچی کو چھپا کر دودھ اس کے منہ میں دے دیا۔

مسعود کی دلہن نے ملکہ بیگم کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھ دیے۔ اور پھر ملکہ بیگم کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا۔

ناشتہ مسعود میاں خود لائے۔ مگر ملکہ بیگم نے ادھر آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ دوپہر بھی فاقہ کیا۔ شام بھی ایک کھیل اڑ کر منہ میں نہ گئی۔ وہ تمام دن مسہری پر گم سم بیٹھی سوکھی سسکیاں لیتی رہیں۔ رات کو نیند بھی بڑی بھیانک آئی۔ معلوم ہوتا جیسے خواب میں پلنگ سے گر پڑی ہیں۔ سینے میں دل ڈاکو کی طرح دھم سے کودتا۔ اور آنکھ کھل جاتی۔ کبھی لگتا بچے کا نچوڑ والے گھر میں چھوٹی سی ہیں۔ "اباجی سر دو گنڈیریاں لیں گے۔" وہ ابا سے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہی ہیں۔ اور ابا پیسے نہیں دیتے کیونکہ لڑکی ذات کی چٹورے پن کی عادت پڑنے کا خدشہ ہے۔ پھر گھر میں ویسے اوپر کے چھپنے چھپے آتے ہی رہتے۔ پھر انہیں کسی طرح ایک پیسہ مل جاتا ہے۔ اپنے پچھواڑے کے کھنڈر نما زینے سے اتر کر وہ گلی میں بیٹھنے والے گنڈیری والے کی طرف بھاگی ہیں ور پھر پھسل جاتی ہیں نیچے ہی نیچے ایک غار میں وہ چارپائی پر خوف سے اچھل پڑتیں ور پھر ان پر غنودگی طاری ہونے لگتی پھر خواب ا جانے کہاں کہاں کے تک بے تک سلسلے چلتے جاتے۔ وہ دیکھتیں کہ ان کی دور کی رشتے کی پھوپی برات لے کر آئی ہیں۔ دونوں دروازے پر روشن چوکی بیٹھی شہنائیوں کی آواز سے سارا محل گونج اٹھا۔ پھر وہ خواب ہی خواب میں نہ جانے کتنی صدیوں تک گھونگھٹ تلے ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا لگائے چاندی کی گھنگروں والے چھلے دسوں انگلیوں میں پہنے بیٹھی۔ پھوپی اماں (جنہیں اب وہ اماں جان کہتی) کے اصرار پر پلاؤ زردے کے تر نوالے اڑاتی رہیں۔ .... پھر آندھی سی چلی دسترخوان اڑ گیا دعائیں دعائیں بادلوں کی طرح کہیں چھپ گئیں وراس کے سر کی سفید داڑھی خون میں لال ہو گئی، رو رو کر وہ دیوانی ہو گئی پھر نہ جانے خواب میں وہ کہاں نکل گئی کوئی اجنبی سا دیس کوئی گھٹا گھٹا سا گھر۔ دسترخوان بچھا لیکن روٹی سوکھی پر بھوکوں کے اتنے جھتے بڑھے کہ ملکہ بیگم کا منہ خالی رہ گیا۔ ایک دم خالی بھوک سے ان کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اور پھر عجیب بات ہے کہ بچوں پر بچے ان کا بھوکا پیٹ پھاڑ پھاڑ کر باہر آنے لگے۔ ایک قطار کھڑی ہو گئی۔ پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔

بڑھتا گیا اور چیخیں مارنے لگیں۔

"ملکہ ملکہ! جو کیا خواب دیکھ رہی ہو" منظور میاں نے نیند سے اٹھ کر ملکہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا خواب میں ڈر گئیں؟" اماں جان نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کچھ نہیں۔" ملکہ بیگم نے چکراتا ہوا سر پکڑ کر جواب دیا۔ ستارے چھپکے پڑ رہے تھے۔ سویرا ہونے والا تھا۔ اور ملکہ بیگم کو خواب سے جاگ کر محسوس ہوا کہ انہیں شدید بھوک لگ رہی ہے۔

سویرے ملکہ بیگم نے تھوڑے سے اصرار پر ڈٹ کر ناشتہ کر لیا اور جب پیٹ بھر گیا تو پھر اچانک انہیں اپنی جنت گم گشتہ یاد آ گئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا جو ایک تارے کی کنجی کی شکل میں ڈھل گیا تھا...... اور روٹی کا ٹکڑا جواب انہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔

ملکہ بیگم نے دوپہری کو مچھی میں پھر رونا بلکنا شروع کر دیا۔ مسعود کی دلہن اور اماں جان نے بہت بہت پوچھا، مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ کیسے کہتیں کہ اپنے گناہ کا راستہ مسدود ہونے پر سوگ منا رہی ہوں ... اور یہ نہ کہہ سکنے کی بے بسی انہیں اور بھی رلا رہی تھی۔ آخر ہار کر ساس غریب روتی بین کرتی پٹی کوٹھری میں جا پڑیں۔

"ارے آج کو خدا بخشے وہ شہید میرے سر کا تاج ہوتا تو کیوں میری یہ درگتیں ہوتیں۔ کوئی میری نہیں سنتا۔ بجھتے ہیں موئی بڑھن بک بک کر رہی ہے۔ آج کو منظور کھلا رہے ہیں اپنے بھائیوں کو تو ماں تنگی سے سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں۔ کل میں ناشتے کو بدلتی رہی منہ پھیر سے نکل گئے۔ مسعود ہیں وہ لگ ہر وقت تیوری چڑھاتے ہوئے ہیں۔ ارے میں کسی کی جوتیاں کھانے والی نہیں دو نوالے کھاتی ہوں تو نوکروں کی طرح سارا گھر سنبھالتی ہوں۔ مجھ پر کسی کا احسان نہیں۔ میں اپنے ہاتھ پیروں کا صدقہ کھاتی ہوں۔ ہاں اب تو سب نوچ لیا مجھ سے، اب کوئی کیوں پوچھے کہ اماں مرتی ہو کہ جیتی ...." بھری دوپہر میں اماں جان چلاتی رہیں۔

اور ملکہ بیگم کے آنسو یہ سب سن سن کر اور بھی شدت سے بہنے لگے۔ آخر وہ دو دن کے سوگ کے بعد پہلی دفعہ ہچکیوں بیچ مسعود کی دلہن سے کہنے لگیں۔ "خدا گواہ ہے دلہن! اماں نے پنا چھلا چھلا انہیں دے دیا کہ دکان پر لگا دیں اس پر بھی انہوں نے میری بات نہ پوچھی۔ روٹی کے علاوہ بھی بچوں کو کچھ چاہیے' انہیں ذرا خیال نہ آیا۔ میں نے صبر کیا' کیا اس کبھی انہیں نہیں سمجھا سکی تھی۔ میں نے تو اتنا کر کے بھی کبھی احسان نہیں جتایا۔ مگر اماں نے ہے سونے کے کڑے دیے کہ جیٹھی گنا رہی ہیں۔ میرا کیا ہوا کوئی نہیں گنتا' کوئی نہیں پوچھتا اب ایسے میں مجھ سے کوئی گناہ ثواب ہو جائے تو تو سب!" ملکہ بیگم کو یکلخت اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔

"بھابی یہ حال دیکھ دیکھ کر میں تو اپنے جی میں چور بنی رہتی ہوں تمہارے دیور بھی نوکری کی پوری کوشش نہیں کرتے۔ مجھے شادی سے پہلے معلوم ہوتا کہ ایسی جگہ قسمت پھوٹ رہی ہے تو زہر کھا کر سو رہتی..." مسعود کی نئی دلہن کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

ور اس دن آنکھوں کا یہ پانی آنکھوں ہی آنکھوں میں پھیلتا گیا.. اسکول سے آ کر محمود میاں نے کھانا مانگا تو ماں نے غصے میں جواب دیا کہ ایسی بے عزتی کے کھانے سے بہتر ہے ڈوب مرو۔ محمود میاں بھوک کے تھے بھوک میں رونا ذرا جلدی آتا ہے۔ سو وہ اچھے خاصے بڑے ہونے کے باوجود بھوں بھوں رونے لگے۔

مسعود میاں جو ابھی دلہن کے ساتھ کھانے بیٹھے ہی تھے۔ اماں جان کی باتوں کے اصل رخ کو سمجھ گئے۔ نوالہ پٹخ کر اٹھے اور اپنے کمرے میں جا پڑے۔

"اب ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی تو کیا کریں؟ آدھی زندگی تو اسی امید میں بسر ہو گئی کہ بی۔ اے کر لیں تو پھر گھر کے سارے دلدر دور کر دیں گے۔ سب کے احسانات یوں چٹکی بجاتے میں اتار دیں گے۔ پر نوکری اپنی جیب میں تو رکھی نہیں کہ نکالی اور کر لی۔ مسعود میاں مارے کھسیاہٹ کے اپنی اکلوتی بشرٹ کی استری کا خیال کیے بغیر آنکھوں کے آنسو چھپانے کو پلنگ پر اوندھے گئے۔

اس دن سارا گھر اوندھ گیا۔ بچے گلی میں دھوں اڑاتے رہے۔ بڑوں میں کسی نے کچھ نہ کھایا۔ صرف منظور میاں کی دکان کا نوکر کھانا لینے آیا تو کھانا بھیج دیا گیا۔ شام کو بھی اماں جان نے چولہا نہ جلایا۔ صبح ہی کا کھانا جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ ملکہ بیگم اپنے کمرے میں پڑی پڑی اپنے آپ کو اس اداسی اور کشیدگی کا ذمہ دار سمجھے گئیں۔ لیکن رات کو جب منظور میاں بغل میں سیاہ صندوقچہ دبائے گھر لوٹے اور جو سب اوندھا دیکھا تو صورت حال سمجھ کر چیخنے لگے۔

"سب کے دکھوں کا ٹھیکیدار میں ہی ہوں میری بوٹیاں نوچ لو . . میں یہاں سے منہ کالا کر جاؤں تو سب کے دماغ درست ہو جائیں گے۔ دونوں وقت روٹی مل جاتی ہے نا۔ اس لیے سارے لڑائی جھگڑے سوجھتے ہیں' کسی دن بھر چار گز کپڑا بیچنے کے لیے دکان پر سارا دن بیٹھنا پڑے تو . . . . "منظور میاں کو مارے غصے کے اچھو لگ گیا اور وہ نیم بے ہوش ہو کر پلنگ پر گر پڑے۔ اور دوسرے ہی لمحے سب ہوش میں آ گئے۔ کوئی دوڑ کر پانی لایا۔ کسی نے پنکھا جھلا اور جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس رات سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور کھانے کے بعد بڑی دیر تک بڑے اچھے موڈ میں گپ شپ ہوتی رہی۔

ملکہ بیگم کے دل پر گہرا صدمہ تھا مگر پھر بھی انسان غم بھول ہی جاتا ہے۔ ان کا پہلا بچہ مرا تھا تو کیا ساتھ وہ مر گئی تھیں۔ مسعود

مہینوں کے کئی ایمپٹوں پر وہ بھی آوازے کس پڑیں۔ ایک زمانے کے بعد یہ خوشگوار رت آئی تھی۔

باتوں سے تھک کر سب سے پہلے منظور میاں کے خراٹے بلند ہونے لگے اور پھر روشنی گل کر دی گئی۔ آہستہ آہستہ سب سو گئے۔
ملکہ بیگم نے حسب معمول سب کے سو جانے کا انتظار کیا اور جب سب کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو چند لمبی لمبی سانسیں لے کر آنکھیں موند لیں جب راتیں اپنی پراسرار سرگوشیوں میں جاگتے رہنے کی تلقین کرتی تھیں تو انہیں نیند کتنی پیاری معلوم ہوتی تھی مگر آج جب رات قبر کی طرح سونی اور خاموش تھی تو نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ کتنی اجاڑ مردہ سی رت ہے۔ ملکہ بیگم نے بڑے دکھ سے محسوس کیا اور جانے کب تک یونہی بے حس و حرکت اس احساس کے دلدل میں پڑی رہیں اور کہیں کوئی کتا بڑی منحوس آواز میں روئے چلا جا رہا تھا۔ اور جب بہت رات گئے ایک کتا ان کے دروازے پر آ کر منحوس آواز میں رویا تو منظور میاں کی آنکھ کھل گئی۔ اچانک انہیں اپنے کمرے سے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی رو رہا ہو اور کہہ رہا ہو "میرا حصہ دو اس میں سے میرا حصہ!" منظور میاں کے غنودہ ذہن پر چڑیلوں بھوتوں کا تصور ابھرا۔ لیکن جب انہوں نے اپنی بیوی کی چارپائی کی طرف دیکھا تو چانک اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمرے میں کوئی چیز کسی چیز سے ٹکرا کر زور سے گری سارے گھر والے جاگ پڑے اور منظور میاں کے کمرے میں روشنی دیکھ کر خوف زدہ ادھر ہی بھاگے اور پھر سب سناٹے میں آ گئے۔

ملکہ بیگم جو ننگے سر ننگے پاؤں کھڑی تھی ان کی روتی ہوئی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ اور اماں جان کی بند مٹھی تھرتھرا رہی۔

"ملکہ! اماں یہاں آپ دونوں کیا کر رہی ہیں؟" منظور نے حیرت سے پوچھا۔ ملکہ بیگم ساکت کھڑی زمین پر گرے ہوئے صندوقچے کو گھور رہی تھیں۔ اور اماں جان کی تھرتھراتی ہوئی مٹھی بے جان ہو کر کھل رہی تھی۔

مٹھی بڑے آہستہ انداز سے کھل گئی۔ منظور میاں کے سیاہ صندوقچے پر کوئی چیز چھن سے گری۔ سب نے دیکھا یہ ایک چونی تھی اور دو پیسے کی ایک ٹکی۔

"ارے خدا کی شان ہے اماں پر بھی ڈاکے پڑ گئے ہیں۔ جبھی تو میں کہوں کہ چار چھ آنے روز روز حساب میں کم کیوں ہوتے ہیں..... "منظور میاں نے انتہائی دکھ میں اپنے سر کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچ لیے۔

دوسرے دن صندوقچہ گھر نہیں آیا۔ دوکان کا چھوٹا سا بہی خانہ کیا گھر سے کم محفوظ تھا؟"

◆◆◆

بے چاری

بھی ابھی جناب گڈو صاحب گھر میں گھسے...... گھر سے دفتر تک نہ ہوگی تو دو میل کی مسافت تو ضرور ہوگی۔ ابھی خاصی گرمی کا زمانہ اس پر سے سائیکل چلانے کی ورزش گھر پہنچتے پہنچتے سانس بگڑ جاتی۔ جن دنوں یہ حضرت شادی کے ارمان میں سوکھ رہے تھے تو ایک دوست نے نہایت محبت سے مشورہ دیا تھا کہ شادی کے بجائے فی الحال تو موٹر خرید لو۔ موٹر نہیں تو کم از کم ایک بھینس پالو۔ تمہاری پوزیشن کو دیکھتے موٹر ضروری ہے ورنہ سائیکل چلانے کے لیے خالص دودھ پینا تو اشد ضروری۔ . . . لیکن ان مشوروں کا حشر معلوم گھر میں نہ موٹر تھی نہ بھینس بیوی ضرور تھی!

وہ بھی اس وقت غائب تھی۔

ملازم نے بڑھ کر سائیکل تھامی تو گڈو نے مزید سانس لینے کے بجائے ملازم سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی ہیں، کہہ گئی تھیں صاحب کے آنے سے پہلے آ جاؤں گی۔'' ملازم نے جواب دیا۔

ور گڈو کو واقعی اس وقت تھکن معلوم ہونے لگے۔ فی البدیہہ چائے کو جی چاہا، پھر سوچا شاید وہ آ رہی ہوں، دفتر سے آ کر اپنے گھر میں کیسے بیٹھ کر چائے پینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ادھی چاندنی رات میں تن تنہا اپنی نہایت بدصورت قسم کی بیوہ کے ساتھ انتہائی زور شور کی ''واک'' فرما رہے ہوں۔

سوچا اتنی دیر میں نہا لیا جائے۔

نل سے پانی گرنے کے شور میں کئی بار محسوس ہوا کہ کسی نے ادھر آ کر پکارا ہے۔ گڈو نے نل بند کر کے سننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا محض وہم تھا۔

نہا کر نکلے تو چائے تپائی پر موجود تھی۔ کپڑے بدل کر ایونگ ان پیرس میں مہک کر بیٹھے تو سوچا کہ چائے ابھی بہت گرم ہے۔ ذرا رک کر پئیں گے۔ سو بے چارے صبح کے اخبارات کا پلندہ اٹھا کر مسہری پر دراز ہو گئے۔ ابھی دو چار خبریں ہی پڑھیں تھیں کہ نظر ایک

عجیب الفت سے بچے کی سرخی پر پڑی۔ گڈو کے لیے ایسی خبریں عموماً غیر اہم ہوتی تھیں مگر اس وقت تو رقیق القلبی طاری تھی۔ اس لیے ذہن فوراً بھٹک گیا۔ افوہ! ایک ہی بچے میں ان کی صحت کتنی خراب ہو گئی۔ شاید یہ سب آپریشن ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ بچے آخر انہیں پیدا ہونے پر کون مجبور کرتا ہے جو پیدا ہونے کے لیے بے تاب رہتے ہیں' کالے پیلے' بکری کے سر والے کتے کے منہ والے لعنت ہو۔ شادی کرو تو یہ سب ضرور بھگتو۔ اوہ بے چاری بیگم! اور گڈو صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہسپتال کا وہ کمرہ گھوم گیا' جہاں وہ پڑی کئی دن تک روتی چیختی رہی تھیں۔ اور پھر آخر کار آپریشن کی نوبت آ گئی تھی' اس کا چہرہ کتنا بھیانک ہو گیا تھا اس نے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر جا لیے تھے۔ وہ آنکھیں پھٹ کر رہ گئی تھیں۔ بالکل اپنا بھوت بن گئی تھی۔ اف توبہ' بچہ پیدا کرنے کا قدرتی عمل کتنا غیر قدرتی نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ مر جاتی تو؟

اور گڈو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پتہ نہیں ڈاکٹر کے پاس اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ کہیں تانگے میں جانے سے طبیعت زیادہ تو نہیں بگڑ گئی۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ ان دنوں ٹیکسی پر جاؤ .... یہ عورتیں ویسے بے تکے پن سے خرچ کرنے میں تو حاتم ہوتی ہیں۔ مگر جہاں کچھ بچنے کا معاملہ ہو تو پھر کفایت شعاری دکھانے کی حد کر دیتی ہیں... . . اس وقت آئے تو سہی' اچھی طرح ڈانٹا تو

مگر جب کافی دیر بعد وہ اندر آئی تو گڈو اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر سب بھول بیٹھے۔ باہر بے بی کی چیاؤں میاؤں دور شور سے سنی جا سکتی تھی۔

گڈو نے نہایت مہذب شوہروں کی طرح جلدی سے اسے سہارا دے کر مسہری پر لٹانا چاہا' مگر وہ خود کو ذرا بیزاری سے چھڑا کر آرام کرسی پر ٹک گئی۔ .. اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور زرد چہرے پر پسینہ تھا۔

خوبصورت تو وہ خیر قطعی نہ تھی' مگر اسے کیا کیجیے کہ وہ گڈو کو اکثر بڑی خوبصورت نظر آتی' خصوصاً وہ زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوتی' لیکن اس وقت تو بس وہ حور پری تھی... . اس لیے گڈو نے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر سہلایا۔ مگر اس نے ہاتھ چھڑا لیا... . گڈو نے برا نہیں مانا' بے چارے اب اس ادا کے عادی ہوتے جا رہے تھے... . بات ہی ایسی تھی۔

گڈو چائے بنانے لگے' چائے تقریباً ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"لو جلدی سے پی لو ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔"

"نہیں!"

''کیوں؟'' گدّو نے اپنی پیالی بھی ٹرے میں رکھ دی۔

''جی خراب ہو رہا ہے۔''

اس نے دو تین گھونٹ لیے

''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

''کہتا ہے ابھی تک خون نہیں بنا!''

گدّو کا جی جل گیا۔

''خون کہاں سے بنے جتنے ٹانک آتے ہیں یوں ہی سڑ سڑ کر پھینکے جاتے ہیں۔ نہ انڈے کھاؤ نہ دودھ پیو' سبزیاں تو تمہیں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ ٹہلنے چلنے پھرنے کو کہتا ہوں تو تم چلتی نہیں ..... دراصل تم خود مرنا چاہتی ہو۔'' سچ تو یہ ہے کہ بات کہنے کی ہوگی تو کیک چائے کی' دوا بد مزہ ہوتی ہے' انڈوں سے اس زمانے سے بو آتی تھی جب بے بی پیٹ میں اور ادھم مچائے رکھتا تھا۔ مگر اب تو نارمل معاملہ ہے ۔ . بھئی اب مرد ذات کا بھی کام تو نہیں رہ گیا کہ بس کھانا اور دوا لیے بیگم صاحب کے پیچھے پیچھے گھومتا رہے۔

گدّو کی اماں کیا غلط کہتی ہیں کہ ''ایک تو لڑکا یوں ہی فکروں کے مارے گھلا جا رہا ہے اس پر سے بہو بیگم کے نخرے! توبہ بیوی اب بھی کیا۔ پہلے زمانے میں تو مردوں کو بھلا اتنی فرصت کہاں' بچے جنوائے جنو تم ہمارا معاملہ دوا پیو' کھانا کھاؤ' یہ بھی تمہارا ذاتی فعل' تو بھئی اس حالت میں دو تین ذچہ ہو در جن کا اوسط بیٹھ جاتا تھا۔ آج کل تو بیوی ایک گھگھر جنے تو بس میاں صدقے واری جا رہے ہیں۔ لوگ بیوی مردوں ہی نے تو عورتوں کے مزاج بگاڑے ہیں ورنہ مجال تھی۔ ..''

واقعی ورنہ مجال تھی کہ گدّو کی اتنی سی بات پر وہ ہونٹ لٹکا کر چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ دیتی' اور فوراً رونے پر آمادہ ہو جاتی؟

اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے تم سے تمہارے برے بھلے کو کہا جاتا ہے تو پھر یہ ہوتا ہے۔ کم از کم تمہیں تو عام عورتوں کی طرح''

''ہاں مجھے برا نہیں ماننا چاہیے' میں عام عورت تھوڑی ہی ہوں۔ گائے بھینس ہوں' ارے گائے بھینس کو بھی مارو گے تو سینگ تو لے گی ہاں۔''

''تو میں نے تمہیں مارا' خوب بھئی' کمال ہے۔'' گدّو اس بے ہودہ تہمت پر بوکھلا گئے۔

''تمہاری باتیں مار سے کچھ کم ہیں' ساس نندوں کی طرح بیٹھ کر طعنے دیتے ہو۔''

اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

اچھا بھئی اگر غلطی ہو گئی تو معاف کر دو ۔۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ ہر ذرا سی بات میں بس تم مظلوم بن جاتی ہو یہ جذبہ تم میں۔ "؟

"بڑے آئے ماہر نفسیات بنے۔ میری تو جان نکل رہی ہے اور تمہیں تجزیہ سوجھا ہے۔" اب وہ واقعی دکھی سے رونے لگی۔

"ارے جان میری گڑیا بس بس۔ اچھا بھئی معاف بھی کر دو میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔۔" گڈو بڑے گھبرائے بہت کسمسائے بےچارے جب بھی ہمدردی کرنا چاہتے تو نتیجہ اس سے بالکل برآمد ہوتا۔

وہ روئے چلی گئی۔

"مجھے اس وقت سچے دل سے تم سے نفرت ہو گئی۔ ہاں نہیں تو...... میری تکلیف کا تمہیں ذرا سا احساس نہیں ...... اندر سے میرا جی جانے کیسا ہوتا رہتا ہے بس خودکشی کر لینے کو طبیعت چاہتی ہے۔"

"ارے میری گڑیا جبھی تو کہتا ہوں صحت ٹھیک کرو صحت ٹھیک ہو تو زندگی سے محبت ہو جاتی ہے ۔۔ وہ نہیں سنا تندرستی ہزار نعمت ہے۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں سنا مجھے ہر چیز سے نفرت ہے مجھے زندگی نہیں چاہیے۔ اتنی تکلیف دہ زندگی ۔۔ میں ہسپتال کا وہ کمرہ کیسے بھول جاؤں..... ابھی تک وہی تو بھگت رہی ہوں لعنت ہے ہزار بار تھو ہے ایسی زندگی پر گڈو اس کی اس روانی طبع کے آگے تنکے کی طرح بہنے لگے بڑے ہولائے۔ سہارے کے لیے اسے گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا۔

"ہائے گھسیٹو مت۔ درد ہوتا ہے بےدرد کہیں کے۔۔" اس نے چیخ کر نفرت اور غصے سے گڈو کو گھورا۔

"اوہ معاف کرنا..... اچھا آؤ یہاں میرے پاس آرام سے بیٹھ جاؤ ۔۔۔ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں"

"نہیں تم مجھے مت چھوا کرو ورنہ میں دیوانی ہو جاؤں گی خود غرض ہو تم تمہارا کیا جائے گا اور مجھے پھر موت کے منہ میں گھسنا پڑے گا۔"

"اب دیکھو تم زیادتی کر رہی ہو جان..... میں کب تنی جلدی بچے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ تم ہی کو تو ماں بننا کا چسکا ری تھی..... اللہ سے مانگا تھا ل گیا" اب گڈو کہاں تک ہر معاملے میں اپنے سر الزام لیتے؟"

"اچھا جاؤ میں نے ہی چاہا تھا ہر عورت بچہ چاہتی ہے تو اس میں گناہ کیا ہے؟ مگر اب نہیں چاہیے کان پکڑے توبہ کی خوب سزا مل گئی۔"

"تو میں کب چاہتا ہوں میری تم سے زیادہ توبہ۔" گڈو نے مسخرے پن سے اپنے کان پکڑ کر توبہ کی مگر وہ تو بس ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی رہی۔

"واہ کسی کی جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ مجھے تو ڈر کے مارے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔" اس نے چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔

لو بھلا کیا ہو سوائے اس کے کہ انسان دیوانہ ہو جائے اس پر بھی گڈو نے اسے سینے سے لگا کر تسلی دینا چاہی۔

"ہائے۔ میرے اللہ! میں نے کہہ دیا کہ بس مجھے نہ چھوؤ۔ تمہارے ہاتھ مجھے کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں .... گر تمہیں میرا ذرا سا خیال ہو تو بس یہ سمجھو کہ ... بس تم مجھے چھوا نہ کرو ..... "

"اچھا ہوں' کیا باتیں کر رہی ہو خواہ مخواہ ... شرمندہ کر کے رکھ دیتی ہو مجھے بالکل چالور مجھتی ہو ..... ارے بھئی میری دلی خواہش ہے کہ بس تم اچھی رہو۔" گڈو نے صمیم قلب سے اعتراف کیا۔

"خاک ... میں خوب سمجھتی ہوں ابھی میں ذرا ڈھیل دوں تو بس ...... تمہارا کیا جائے گا میں مر رہوں گی .... میری رگوں میں خون نہیں رہا اٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں۔ ابھی تک سیدھا چلا نہیں جاتا۔" اس نے پھر رو رو کر بین شروع کر دیے۔ اسی وقت دوسرے کمرے میں بے بی بلک بلک کر رونے لگا۔

آیا' بے بی کو لے آؤ۔" وہ غصے سے چیخی۔

"آیا بے بی کو نہ لاؤ۔" گڈو اس سے بھی زیادہ زور سے چیخے۔

"کیوں ظالم کس بات کا دکھ رہے ہو؟" اسے دودھ نہ پلاؤں' بھوکا مار دوں' کیا مرضی ہے تمہاری؟ ایک تو اس بدنصیب کو دودھ ہی کون سا ٹھیک نصیب ہو رہا ہے۔" اس نے آنسو پونچھ کر دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں پوچھا۔

"مر جائے اچھا ہے' ایسی کمزوری میں اپنا دودھ دینا بھی فرض ہے جب ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ ڈبے کا دودھ پلاؤ تو "

ے گڈو ذرا زبان سنبھالو۔ وہ کیوں مر جائے' اس کا برا چاہنے والے مریں۔ آخر وہ تمہیں کون سی تکلیف دیتا ہے جو آنکھوں میں کھٹک رہا ہے؟"

تمہیں راتوں کو رو رو کر جگاتا ہے بدتمیز' اس لیے تو تم اور بھی چڑچڑی ہو گئی ہو۔ سوکھ کر تیلی جیسی ہوئی جا رہی ہو۔"

"رہنے دو مجھ سے ہمدردی جتانے کو ۔ ۔ واہ اچھی دشمنی ہے ۔ نو مہینے لے کر اپنے پیٹ میں رکھا ہوتا اور پھر چار دن چیخ کر پھر پوچھتے کہ اب گلا گھونٹنے کے بارے میں کیا خیال ہے بڑے آئے

اسی لیے تو اس نالائق پر مجھے اور بھی غصہ آتا ہے کہ یہ ماں کے پیٹ میں رہنے کی بجائے باپ کے پیٹ میں کیوں نہیں رہا۔"

گڈو اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

مگر ادھر غصے تو لگام نہ ملی۔ بولیں۔ "واہ غصہ کرو کو سوکا تو اپنے بیٹوں کو میرا ایک تو ایک بچہ ہے بھی میری زندگی کا آسرا ہے۔ میری آنکھوں کا نور میر بھی سلامت رہے اب مجھے موت بدلے کو اور بچے نہیں چاہئیں۔ میں تو اپنے اس لال کے پیے اپنی زندگی کی بھوکی ہوں' اسی طرح کبھی ہسپتال میں چیخ چیخ کر مرگئی تو تمہارا کیا جائے گا' تم دوسری کرلاؤ گے۔ اور وہ تمہارے پیے بچوں کی فوج تیار کردے گی۔ ....." اب اس نے ہچکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔

گڈو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس طرح ہمدردی کریں انہیں اس پگلی ہوئی عورت کے جذبات کے الجھاؤ کا پورا پورا احساس تھا۔ معاملہ کافی سنجیدہ تھا اور وہ خود ایک ڈاکٹر کی طرح اس معاملے کو سمجھ رہے تھے مگر پھر بھی وہ حیران تھے کہ اپنی تائیدی رائے اس وقت کیونکر اس کے دماغ میں ٹھونسیں۔ جو بات کرتے انہی پڑتی چھکارنا' سہلانا چاہا تو محترمہ کے احساس کی کڑیاں ایک اور بچے کی پیدائش سے جا کر ملنے لگیں بچے سے نفرت کا اظہار کیا تو وہ بھی غضب ہو گیا۔ پھر کیا سر کے بل کھڑا ہوا جائے'

چائے ٹھنڈی برف ہو چکی تھی۔ گڈو نے سہارے کے لیے ایک سگریٹ سلگایا۔ اور جلدی جلدی کش لگانے لگے۔ .. دفتر سے کیا کیا ارمان لے کر چلے تھے کہ شام اس طرح گزاریں گے۔ اس طرح گزاریں گے۔ مگر یہاں کوئی تک نہیں

گڈو نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور نرم نرم گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں۔

"ہاں اب منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرے ساتھ موجودہ صورت حال میں خوش نہیں رہ سکتے۔ تم کیا کوئی مرد بھی نہیں رہ سکتا۔ میری بدنصیبی! تم دوسری شادی کرلو۔ میں تمہارے گھر کے ایک کمرے میں اپنے ننھے کے ساتھ رہ کرتی رہوں گی ..... تمہیں خوش دیکھ کر میں خوش ہو جایا کروں گی"۔ . . اس کے تھکے ہوئے بیمار چہرے پر صدیوں پرانی عورت کا روایتی ایثار نور بن کر جھما جھم برس رہا تھا۔

"اُفوہ بھئی' تم کتنی عجیب ہو' تمہیں خود کو تکلیف پہنچا کر کیا مزا آتا ہے۔ اب اس وقت دوسری شادی کا کیا سوال اٹھ بیٹھا؟"

"اب صورت حال تبدیل ہونے سے رہی' بیوی صرف کھانے پینے بھر کی تو نہیں ہوتی' اب ہو نہیں! ایک نہ ایک دن یہ سوال اٹھے گا مرد ذات۔"

"جہنم میں ڈالو دو سال پہلے بھی شادی کے بغیر جیا تھا۔"

"وہ اب جب کی اور بات تھی۔"

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ وہاں ان چیزوں کے بارے میں مت سوچا کرو۔ تم رات دن یہی فضول باتیں سوچ سوچ کر آدھی ہو رہی ہو، تمہارے تو خون نہیں بنتا۔"

"کیا کروں کیسے نہ جو مجھ سے پر گزر رہی ہے بس میں ہی جانتی ہوں۔ ایک طرف گھر ہے جو جنت ہے۔ جس کے پیچھے بچے کی صورت میں موت چھپی بیٹھی ہے۔ دوسری طرف۔"

"جہنم میں جائے یہ شاعری..... رہے یہ ضروری تو نہیں کہ ہر جنوں بچوں کے بغیر میاں بیوی کی نہ بنے..... میں کہہ چکا مجھے اور بچے نہیں چاہئیں۔"

"تم نہ چاہو جب بھی بچہ ہو سکتا ہے اور میری موت آ جائے گی یقینی بات تو کچھ نہیں۔" "ہے کوئی نہیں میڈیکل سائنس..... ۔"

"بالکل نہیں۔ تم مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔"

"اچھا سب باتوں کو جانے دو، آؤ ہم عہد کریں کہ ہم دونوں دوستوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ بس اب مطمئن ہو جاؤ۔"

گڈو نے نہایت آسانی قسم کے لہجے میں کہا اور اپنی گڑیا کا ہاتھ زور سے دبایا..... !

"پھر..... ہائے اللہ ابھی کہہ تو دوستوں کی طرح.......؟"

"تو کیا دوست ایک دوسرے کو چھوتے نہیں؟"

"ہمیں ایسا ہی دوست ہونا چاہیے..... مجھے ڈر لگتا ہے اگر کہیں؟"

"نہیں اس کی شرط نہیں۔ اب ایام جاہلیت کی باتیں نہ کرو۔ پھر تم کہو گی کہ ہم الگ الگ گھر میں رہیں۔ پھر کہو گی میں تم سے پردہ کروں گی۔ بھئی مجھ پر بھروسہ کرو۔"

"وعدے کی بات، دیکھو پھر نہ جانا۔"

"تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا پڑے گا!"

"کیا؟"

"دو وقت پر بیچ کی۔ خوب کھاؤ گی میرے ساتھ سیر کو جایا کرو گی اور کچھ سوچا نہ کرو گی..... تا کہ تم جلد از جلد نارمل ہو جاؤ۔"

"ہوں اب دیکھو تم سمجھتے ہو کہ میں ان دنوں پاگل ہوں..... جلدی سے دماغ درست ہو جائے تا کہ..... آپ؟"

"نہیں ہرگز نہیں، اب دوسری بات سنو بے بی کی زیادہ فکر نہ کیا کرو ابھی سے اس کے اتنے ناز کرو گی تو بالکل بگڑ کر رہ جائے گا۔

ویسے بچے بڑے ہو کر دو کوڑی کے نہیں رہتے۔"

"واہ اب تم نے ماں بچے کے تعلقات میں دخل اندازی شروع کردی' میرا ایک ہی بچہ ہے۔ میں خوب جانتی ہوں اس کی بہتری کے لیے مجھے کیا کرنا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ کو محبت نہیں ہوتی اپنے بچے سے؟"

"کیا معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ ماں کے برابر نہیں ہوتی... کبھی نو مہینے جھیل کر جنم دو تو پھر پوچھیں... ابھی تم نے اسے کوسا تھا' میرا کلیجہ پھٹ گیا تم سے۔"

"اے لو پھر وہی باتیں' اچھی بابا خوب مزے پیار کر کے ستیاناس کر دو اس کا۔ چونکہ میں نے اسے نو مہینے پیٹ میں نہیں رکھا اس لیے مجھے محبت کرنے کا کیا حق ہے؟" گڈو نے بے سنجیدگی سے منہ چلایا۔

"ہاں اگر محبت ہوتی تو اس کے لیے کچھ کرتے نا' کہا تھا ایک بچہ گاڑی خرید دو اسے لٹا کر سیر کو بھیجا کریں گے گود میں لدے لدے بچے کی عادت بگڑ جاتی ہے۔ تو جناب نے نوٹس تک نہ لیا... تمہیں تکلیف تھوڑی ہوگی اگر کبھی آیا چلی گئی تو مجھے ہی کندھے پر لادے پھرنا پڑے گا۔"

"نوٹس کیوں نہیں لیا تھا میں نے کہا تھا کہ بجٹ ذرا گڑبڑ ہے دو ایک مہینے میں لے لیں گے مگر اب تم نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔ اور پھر میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں اب ہی چاؤ تو خود جا کر گاڑی خرید لاتیں۔ دیکھو جان! تمہیں معلوم ہے کہ دفتر سے" کر میں تھک جاتا ہوں وقت بھی تو اتنا نہیں ہوتا کہ۔"

"ہاں اگر محبت ہوتی تو وقت نکل سکتا تھا۔ میں بیمار ہوں اس حالت میں بازار میں گھومتی پھروں... جھٹک مار کر میں ہی گئی آج... پھر کہتے ہو مجھے مظلوم بننے کی عادت ہے۔" اس کی پلکیں پھر بھیگیں۔

"اچھا جبھی تو میں کہوں کہ آج میری گڑیا کیوں اس قدر چڑچڑی ہے بازار گئی تھی' گاڑیاں دیکھیں' کوئی پسند آئی۔ کل تاریخ کو چل کر لے آئیں گے۔"

"ہر کام کل پر ٹالو۔" وہ بدبدائی۔

"آیہ بے بی کو لے آؤ۔" وہ اب گویا ہر طرح سے بے تعلق ہو گئی۔

آیا صاحبہ خوشی سے نہایت فراخ قسم کی ہنسی ہنسی ایک بچہ گاڑی دھکیلتی خود تشریف لا رہی ہیں!

"اوہو! تو یہ کیوٹم گاڑی لے بھی آئیں" گڈو حیران ہو کر کھڑے ہو گئے "خوب بھئی سی بیویاں سب کی ہوں تو شوہروں کو بھی گھر جنت لگنے لگے۔"

"وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے بچے کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔ بچے نے گاڑی سے اٹھائے جانے پر شدید احتجاج کیا، مگر ماں کی گود سونگھ کر کوں کوں کرنے لگا۔

گڈو نے ہر طرف سے گھوم پھر کر گاڑی کو دیکھا۔ انگلی سے چھوا، ہتھیلی پھیری، پھر اس پر دو دو دے کر اسپرنگ کی مضبوطی آزمائی۔

"بڑی خوبصورت ہے، کیوں کتنے کی لی؟"

اس کے بجائے آیا نے جواب دیا۔ "ایک سو چالیس کی جی،"

"میں تو کہوں تھی جی، چھوٹی گاڑی لے لو، پچاس روپے کی تھی، بالکل کرسی لگے تھی۔ پھر جیسی بیگم صاحب بولیں چھوٹی گاڑی میں ایک بچہ بیٹھ سکے گا۔ فر میں کہا جی یہ بات تو ہے۔ اور بے بی چاہے پاؤں چلنے پر جی جب چھوٹا بے بی گاڑی میں بیٹھنے کا تو ہمارا یہ بے بی ضد کرے گا۔ اس واسطے جی بیگم صاحب بولیں بڑی گاڑی لینا چاہیے۔

دیکھو جی صاحب بہت بڑی گاڑی ہے، دو تین بے بی تو بیٹھ جائے گا... کیوں جی صاحب!" آیا نے داد طلب نظروں سے گڈو کو دیکھنا شروع کیا۔

گڈو پہلے تو حیران ہوئے پھر چھپا کر مسکرانے کی کوشش کی اور پھر اچانک قہقہوں پر قہقہے لگانے لگے۔

وہ بے بی کو دوپٹے میں چھپائے کرسی پر آلتی پالتی مارے سنجیدگی سے بیٹھی تھی۔ گڈو کو اس کا یہ روپ پہلی بار اتنا نیا، اتنا پیارا، اتنا خالص اور اتنا نکھرا ستھرا لگا جیسے نیلے طوفانی سمندروں کا جھاگ۔ وہ جھاگ جو لہروں کے اترنے پر کسی چٹان پر پڑا اچرج سے سارا تماشا دیکھ رہا ہو۔

فضل دین

اب تو مجھے جب ہنسی آنے لگتی ہے تو میں شگفتہ کی وہ تیز سی تیکھی ہنسی یاد کر کے اپنے ہونٹ بھینچ لیتی ہوں۔

پہلے یہ بھی کہہ دوں کہ شگفتہ کی ہنسی ہمیشہ سے تیز سی تیکھی نہ تھی۔ وہ تو بڑی سادگی سے بچوں کی طرح منہ کھول کر کھلکھلانے لگتی تھی۔ اس کے اوپر کے سامنے والے دو دو دانتوں کے بیچ میں کھڑکی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا بھولا سا چہرہ ہنستے ہوئے بالکل ننھے بچوں کی طرح کھِلا اور احمق سا لگتا۔

راہ چلتے ہنس پڑنا کوئی جرم نہیں۔ یہ میرا ذاتی خیال سہی لیکن شگفتہ اس دن یوں ہنستے ہوئے مجھے زہر لگی۔ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو میں فوراً اسے سولی دے دیتی لیکن خیر ہوئی ہم کافی دیر سے اپنے ٹھکانے پہنچے اور جب ہلکی اطمینان کی سانس لی تو شگفتہ کے ساتھ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اور قصہ بظاہر ختم ہو گیا۔

بات تھی بھی بالکل معمولی سی اس روز شگفتہ اختر اور میری رات کو ڈیوٹی کا ہفتہ شروع ہو رہا تھا۔ پچھلی رات حسب معمول گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔ لیکن ناشتے کے بعد سے پھر خیال ہوا کہ مزید سو لیا جائے۔ اس لیے تقریباً تمام دن پلنگ پر لوٹ پوٹ کر سونے کی کوشش کی۔ اس زبردستی سے طبیعت اور سست ہو گئی غسل خانے میں دیر تک نل تلے بیٹھ کر جب میں نہایت بیزاری کے عالم میں یونیفارم پہننے پر خود کو آمادہ کر رہی تھی تو اختر اور شگفتہ آ گئیں اور انہوں نے کہا چلو ذرا باہر ٹہل آئیں۔ وہ اسی ٹہلنے کے سلسلے میں وہ واقعہ پیش آیا۔

ہمارا ہسپتال تھا ہی شہر سے بہت دور اور اس وقت تو سڑک کافی سنسان تھی۔

پندرہ بیس منٹ کے وقفے سے کوئی بس تیزی سے گزر جاتی یا پھر کوئی چھکڑا اطمینان سے چرخ چوں کرتا رینگ جاتا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ مجھے اپنے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا غالباً شگفتہ اور اختر کی بھی یہی کیفیت ہو گی۔ دراصل ہم تینوں ہی نرسیں تھیں۔ اوروں کا نہیں معلوم مگر اپنی کہتی ہوں ایک بار میرے ابا جی بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھنے کے لیے مجھے بھی ہسپتال جانا پڑا۔ بتا نہیں سکتی کہ نوجوان اور بھلی شکلوں کی نرسوں کو یونیفارم میں ملبوس صاف ستھرے وارڈ میں خرگوشوں کی طرح تیز تیز چلتے

دیکھ کر کیسی رومان خیز سنسنی طاری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا ہائے کیا مزے دار بات ہے کہ ایسے ٹھاٹ سے لوگوں کی تیمارداری کی جائے ایک اپنے گھر ہیں کہ اگر کوئی بیمار ہو وہ اس کے پاس صاف ستھرے ہو کر مزاج پرسی کو جاؤ تو بیمار کی ناک بھوں بے قابو ہو جاتی ہے۔ بیمار سوچتا ہے کہ لو بھلا ہم بیمار ہیں اور دوسرے تندرستوں کی طرح صاف ستھرے بنے پھر رہے ہیں ہماری بیماری کا ذرا دکھ نہیں۔ سچ کہہ دوں اس روز بھی بار نرسوں کو دیکھ کر میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنا برقعہ نوچ کر پھینک دوں اور پھر راج ہنس کی طرح ہسپتال کے چکنے فرش پر تیرتی ہوئی اباجی کی نظروں سے گم ہو جاؤں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم جب جرنیل تھے اور ماں ابا شہید نہیں ہوئے تھے۔ ہمارا ایک اونچی دیوروں والا گھر تھا۔ جس کی کھڑکیوں پر میلی دھوپ کھائی چقیں لگی رہتی تھیں اور میں باجی کے کمرے سے کتابیں رسالے چرا کر رومانوی نظمیں اور کہانیاں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ لیکن اب وقت نے والٹن کیمپ سے مجھے ہسپتال میں دھکیل دیا تھا تو میں خود عجیب بندھا بندھا سا محسوس کرتی تھی اور دوں کا بھی شاید یہی حال ہو اس لیے تو ساری نئی نئی مسلمان نرسیں بڑی حساس تھیں ڈاکٹروں کے ذرا سے تخت لہجے پر آنسو بہانے لگتیں' چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں خوب لڑتیں اور جی بھر کر روتیں اور ہر وقت تھکی تھکی سی رہتیں' شگفتہ کہتی یہی حال خود اس کا بھی ہے' لیکن ہمیں یقین نہ آتا کیونکہ وہ بات بات پر رونے کی بجائے بات بات پر بے تکے پن سے ہنس پڑتی تھی اور اس بے تکے پن پر شگفتہ کئی بار ڈاکٹروں اور میٹرن کی جھڑکیاں کھا چکی تھی۔ آخری بار سے سمجھا چکی تھی کہ "مسلمان لڑکیوں کو ایسا زیب نہیں دیتا" لیکن شگفتہ نے اس بات کو ہمیشہ سچے دل سے تسلیم کر لینے کے باوجود کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔

تو اس دن بھی وہی ہوا۔ یعنی وہ ایک دم بے تکے پن سے ہنس پڑی بات یہ تھی کہ ہماری مخالف سمت سے دو آدمی تیز تیز آ رہے تھے۔ ان کی بشرٹوں کے رنگ بے حد شوخ تھے اور بال خوب دھڑلے سے ماتھے پر بکھرا گئے تھے۔ ظاہر ہے یہ کوئی عجوبہ نہ تھا آئے دن ایسے لوگ سڑکوں پر نظر آتے ہی ہیں۔

وہ جب ہمارے قریب سے گزرے تو شگفتہ ایک دم زور سے ہنس پڑی۔ اور اس کے بعد وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ سورج اپنی سرخیوں میں ڈوب رہا تھا۔ وہ سڑک بہت سنسان تھی۔ ان کے جوتوں کی چاپ بالکل ہمارے پیچھے گونج رہی تھی۔ ہم دم بخود آگے ہی بڑھتے رہے۔ شگفتہ کا چہرہ پسینے سے بھیگ رہا تھا جیسے وہ اپنی غلطی محسوس کر کے سخت شرمندہ ہو رہی ہو۔ اور اس کی یہ کیفیت دیکھ دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسی جگہ شگفتہ کو پکڑ کر بری طرح پیٹوں تاکہ ان لفنگوں کو پتہ چل جائے کہ ہم شگفتہ جیسی فضول اور احمق لڑکیوں سے بہت مختلف ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ پلٹ کر ان بدمعاشوں کو جھنجھوڑ ڈالوں' لیکن میں جانتی تھی کہ یہ دونوں باتیں

ناممکن ہیں۔ کیونکہ مارے گھبراہٹ کے میں اپنے سارے جسم کو کانپتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

ہم شام کے اندھیرے میں آگے ہی بڑھتے رہے۔ ڈیوٹی کا وقت قریب تھا اور ہم ہسپتال سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

''ہسپتال چلو'' اختر نے سرگوشی کرتے ہوئے اپنا ٹھنڈا ہاتھ میرے کانپتے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔

''نہیں یہ پیچھا کریں گے ۔ وہاں سب کو پتہ چل جائے گا۔'' شگفتہ نے میرا دوسرا ہاتھ اپنے پسیجے ہوئے ہاتھ میں دبوچ لیا۔

میں عجیب کشمکش میں تھی۔ میں جانتی تھی کہ ان کو ہماری جائے رہائش کا پتہ چلنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن شام کے بعد ہسپتال سے باہر رہنا اور بھی خطرناک تھا۔ ہم بغیر کسی فیصلے کے آگے ہی بڑھتے رہے۔

ہمارے عقب میں جوتوں کی چاپ کانوں پر پٹاخوں کی طرح پھٹ رہی تھی۔ آخرکار اختر کچھ کہے بغیر ہسپتال کی سمت مڑ کر چل پڑی اور میں بھی جیسے تارے سے بندھی اس کے ساتھ ہو گئی۔ لیکن شگفتہ جوں کی توں کٹھ پتلی کی طرح ہسپتال کی طرف سے منہ پھیرے جا رہی تھی اور ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں مرد بیچ سڑک پر رک گئے جیسے وہ فیصلہ کرنا چاہتے ہوں کہ کس کا پیچھا کریں دفعتاً شگفتہ بھاگ کر ہم سے آملی جوتے ہمارے عقب میں اسی طرح بج رہے تھے۔

ہسپتال کے پھاٹک میں ہم یوں داخل ہوئے جیسے اماں کی گود مل گئی ہو۔

یونیفارم پہنتے ہوئے میں ان گالیوں کی فہرست مرتب کر رہی تھی۔ جو میں شگفتہ کو دینا چاہتی تھی کہ راستے میں وہ ہنسی سے دوہری ہوتی ہوئی آئی۔

''عجیب بات ہے۔ الو کے پٹھے جانے کیا سمجھے؟ سمجھے ہوں گے میں ان کی بشرٹ پر مر گئی۔ قطعی الو کے پٹھے۔'' شگفتہ کھلکھلا کر کہنے لگی۔

رہنے دو ہنسنے کو۔ ''میں پوچھتی ہوں تم ہنسی کیوں تھیں؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''ہائے تم نے نہیں دیکھا تھا ایک صاحب کی بشرٹ پر ہوائی جہاز چھپے ہوئے تھے۔'' شگفتہ زور سے تالی بجا کر ہنستے ہوئے بولی اور وہ مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح احمق لگی پھر بھی میں نے غصے کے اظہار کے لیے منہ پھیر لیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا شگفتہ کا چہرہ اتر گیا۔

''ہائے خیر ہو گئی۔ میری توبہ اب کبھی نہیں ہنسوں گی کسی بات پر۔'' شگفتہ اب کے پھیکی ہنسی ہنس کر بولی۔

بظاہر یہ قصہ ختم ہو چکا تھا ۔ اس کے بعد ہم عرصے تک باہر نہیں نکلے۔

اس واقعے کو دس بارہ دن گزر چکے تھے میں تو وہ بات بھول سی گئی تھی کہ اچانک ایک دن اس سلسلے کی ایک اور کڑی سامنے آ گئی۔

شگفتہ کی ڈیوٹی پرائیویٹ وارڈ میں تھی اور میری جنرل وارڈ میں ۔ میں کسی کام سے نہایت تیزی میں برآمدے سے گزر رہی تھی کہ کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ یہ شگفتہ تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ضرورت سے زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"شمی۔ شمی وہ...... وہ اندر آ گیا۔"

"کون ارے کون بھئی مجھے چھوڑو تو سہی۔" میرا دھیان اپنے کام کی طرف تھا۔

"وہ..... ... وہی ہوائی جہاز، کمرہ نمبر 9 میں بیٹھا ہے۔" شگفتہ نے انگلی سے ادھر اشارہ کیا۔ اس وقت وہ پھر مجھے اس بچے جیسی لگی جو باہر کسی چیز سے ڈر کر ماں سے فریاد کر رہا ہو۔

"اونہو تو آنے دو۔ ہسپتال سے یہاں کسی کے آنے پر پابندی تو نہیں' اپنا کام کرو جا کر' خواہ مخواہ تماشہ نہ بنو۔" اور میں تیزی سے اپنے کام پر چلی آئی۔

ڈیوٹی کے خاتمے پر جب میں کمرے میں پہنچی تو شگفتہ یونیفارم میں جکڑی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اور اختر نہایت فصاحت و بلاغت سے اسے نصیحت کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے قصہ مختصر کیا۔

"عورت پھر عورت ہے۔ یہ کبھی نہ بھولو۔" اختر نے حرف آخر صادر کر کے کپڑے تبدیل کرنا شروع کر دیئے۔ اور میں جھنجھلا گئی۔

"جانے دو اختر باجی اتنا کمزور بن کر تقریر کرنا بھی کس کام کا ... میں کہتی ہوں اگر وہ ہسپتال میں اپنے کسی عزیز یا دوست سے ملنے آ گیا تو ایسا کون سا غضب ہو گیا۔ یہ سمجھنا کہ وہ ہمارے پیچھے آیا ہے خوش فہمی ہے... اور یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم کپڑے بدل رہی ہو اور سمجھتی ہو ہم نہیں دیکھ رہے... " میں نے شگفتہ کو اداس دیکھ کر ہنسی کا سماں پیدا کرنا چاہا۔

مگر اختر اس وقت جھوٹوں بھی نہ شرمائیں۔ تا کہ ان کے بھونڈے طریقے پر شرمانے سے ہم دل کھول کر ہنس ہی لیتے۔

"مگر وہ تو شگفتہ کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کمرے میں میٹرن بھی تھی۔ وہ اس سے بھی نہ ڈرا۔ اللہ رحم کرے۔" اختر خطرناک فضا پیدا کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

"اچھا اگر ایسا ہے تو شگفتہ شادی کر لے اس سے۔ اتنے بہت سے ہوائی جہاز ملیں گے۔" میں نے قصہ ختم کرنے کی غرض سے کہا اور ہم تینوں دل کھول کر ہنسے۔

لیکن ہنسی سے شروع ہونے والی بات ہنسی پر ختم نہ ہوئی۔

اب تقریباً روزانہ وہ ہسپتال میں نظر آنے لگا۔ کبھی اکیلا' کبھی کئی اور لوگوں کے ساتھ ۔ اس کی آمد کی اطلاع کبھی اختر مجھے دیتی' کبھی میں اختر کو' کبھی شگفتہ مجھے بتاتی۔

ہم تینوں کافی فکرمند رہنے لگے۔ ہم ٹھیک سے یہی نہیں سمجھ سکے تھے کہ دراصل وہ ہم میں سے کس کا عاشق ہے یا اس کی پوری ٹیم کا رخ کس طرف ہے۔ وہ فلمی انداز سے سگریٹ پیتا نظر آتا اور ہم تینوں میں سے جو بھی نظر آتا اسے گھورنے لگتا۔

اب یہ چیز ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن میں نے طے کر لیا کہ میں میٹرن سے اس شخص کی رپورٹ کر دوں گی۔ لیکن اختر نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"توبہ کرو میٹرن ویسے ہی ہمارے خلاف ہے' جانے وہ ہمیں کیا سمجھے۔ بات آگے بڑھ جائے گی۔" اختر بولی۔

"کیوں ہم نے جرم کیا کیا ہے۔ وہ گندہ ہے' وہ بلاوجہ ہسپتال میں آ کر گھومتا ہے . . . ." میں اپنی بات پر اڑ گئی۔

"جرم؟ شگفتہ ہنسی نہیں تھی اسے دیکھ کر؟ وہ یہ بات کہہ سکتا ہے۔ اور بھی جو چاہے گا کہہ دے گا . . " اختر بھنا کر بولی۔

اور شگفتہ آئینے کے سامنے کنگھی کرتے ہوئے یکدم یوں پلٹی جیسے کسی نے اس کی پشت پر خنجر بھونک دیا ہو۔ خوف سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"اختر باجی' اختر باجی تم . . تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔" اور یہ کہہ کر شگفتہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میں جان بوجھ کر نہیں ہنسی تھی۔ بس مجھے ہنسی آ گئی بس میں ہنس پڑی' میں کیا کروں مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔" شگفتہ آنکھوں پر مٹھیاں رکھے سسک سسک کر روتے ہوئے بولی۔ اس کا قدرے موٹا جسم کانپ رہا تھا اور کھلے ہوئے بالوں کی ایک لٹ بھیگے ہوئے گال پر چپک گئی تھی۔

مجھے شگفتہ پر رحم آ گیا۔ میں نے سوچا اب شکایت کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔ شگفتہ اکیلی تو نہیں تھی' ہم بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ ہمیں گھورتا ہے' ہم تو نہیں ہنسے تھے وہ غنڈہ ہے اس کے جوتے پڑنا چاہئیں۔

میں نے اسی دن اپنی ذمہ داری پر شگفتہ کی ہنسی کا قصہ گول کر کے سارا واقعہ میٹرن کو سنا دیا۔ بس کچھ نہ پوچھیے اس بوڑھی بھیڑ نے اس سلسلے میں ہم پر کیسے کیسے نکتے جڑے۔ بہرحال یہ سب اس لیے قابل قبول تھا کہ دوسرے دن سے وہ ہسپتال میں نظر نہ آیا۔

بظاہر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ شگفتہ کا منہ بنتے اور ہونٹ سی لینے کا عہد ٹوٹنے لگا تھا۔ اختر اپنی نصیحتیں بھول کر اب پھر اکثر دبی زبان سے اپنے چھوٹے ماموں زاد بھائی کا ذکر کرنے لگی تھی' جو ایک سال سے میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا اور کبھی کبھی اختر سے ملنے آ

جاتا تھا۔ اور جب آتا تو اختر کو آپا کہتے کہتے اس کی زبان خشک ہوتی ۔ ور اختر اس دن ماتھے کے شوخ رنگ دوپٹے میں لپٹی بالکل چھوٹی لڑکیوں کی طرح ہائے اللہ ہائے اللہ کر کے باتیں کرتی اور میں پھر اطمینان سے کوڑی کوڑی جوڑنے میں مصروف ہو جاتی تا کہ ایک دن میرے پاس اتنا روپیہ ہو جائے کہ میں نرسنگ چھوڑ کر مزید تعلیم حاصل کر سکوں۔ غرض ہمارا ماحول پھر ایک گہری نیلی جھیل کی طرح اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ جس پر سے کوئی خیال' کوئی ارمان' کوئی چھوٹی سی عادت راج ہنس کی طرح چپکے سے تیر جاتی۔ یا پھر کنول کے پھولوں کی طرح کانپ کر ساکن ہو جاتی۔

لیکن چند ہفتے بعد جیسے اچانک یک ہیبت ناک چٹان جھیل پر پھٹ پڑی۔

"وہ یک مریض کی حیثیت سے ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل ہو گیا۔" یہ خبر مجھے اختر نے ہانپتے کانپتے سنائی۔

"یعنی جب میں نے مریض کے سرہانے چارٹ لگا کر انجکشن لگانے جھکی تو اس نے چادر سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا ... ہائے میں مرتے مرتے بچی۔ جب میں انجکشن لگانے لگی تو بولا "مار ڈالو ظالم" ہائے اب کیا ہوگا؟" اختر کے ہوش وحواس غائب تھے۔

میں خود بری طرح پریشان ہو گئی۔ لیکن جانے کیوں دوسرے کے سامنے اکڑے رہنا میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ میں نے یہ سب بظاہر سکون سے سنا۔

"نصیبہ یوں ہی کھلتا ہے اختر بی بی! اللہ گھر بیٹھے بر بھیجتا ہے۔" میں نے بات مذاق میں اڑانا چاہی۔

"چپ رہو دادی! کریں شگفتہ اور بھریں ہم ہائے میں تو بدنام ہو جاؤں گی' صوبے کا تو کیا بگڑے گا؟" اختر ہاتھ نچا کر چلائی۔

ور میں نے سوچا ہسپتال ہماری جاگیر تو نہیں۔ جو بیمار ہوگا آئے گا۔ اور اختر تو مارے وہم کے ہر چیز میں مبالغہ برتنے کی عادی تھی۔

میں نے شگفتہ کو یہ خبر سنائی تو وہ سفید پڑ گئی۔ لیکن جب میں نے بتایا کہ وہ اختر پر "مہربان" ہے تو شگفتہ کی جان میں جان آئی۔

"ایسا برا بھی نہیں بس ذرا کالا ہے اور چیچک کے داغ ہیں مڈل پاس تو ضرور ہوگا....... تو اختر کونسی حسینہ ہیں بوڑھیا ہوئی جا رہی ہیں اس عمر میں تو اپنے سے کمتر ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔ خندہ پن تو اختر دو دن میں نصیحتیں کر کے دور کر دیں گی۔ ہے نا؟ اور دیکھو نہیں اس دن اختر کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے جلنے کی وجہ سے پیچھے پڑا وہ خوب بہانے بازیاں جانتی ہیں۔ ان کی ضرور پہچان ہو گی کہیں سے۔" شگفتہ نے اطمینان سے پلنگ پر بیٹے لیٹے کہنا شروع کیا اور پھر وہ کافی رات گئے تک اختر کے ڈھلتے کنوارے پن کے لطیفے گھڑ گھڑ کر

ستاتی رہی۔ میں بھی اس معاملے میں شگفتہ کا ساتھ دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

سر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔

لیکن جب دوسرے دن مجھے "ہوائی جہاز" کے سامنے انجکشن لگانے حاضر ہونا پڑا تو سارے نقشے بگڑ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ پر بھی عاشق ہے۔ اچھا تو اب ہم اس معیار کے رہ گئے ہیں۔ منہ پر ایک چانٹا سا پڑ گیا۔ میں نے گھبرا کر انجکشن کی سوئی خوب گہری اتار دی لیکن جب انجکشن لگا رہی تو وہ "جور و جفا" سہنے والوں کی دھج بنائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسی گہری اتار دی لیکن جب انجکشن لگا رہی تو وہ "جور و جفا" سہنے والوں کی دھج بنائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بس گیلی کیچڑ جیسی نظروں سے کہ میرا جی چاہا اس کے اس کے قتل کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں ...... منت کے منت میں چوری چوری پڑھی ہوئی ساری رومانوی کہانیوں کے ہیرو غنڈے بن گئے .... . ملاحظہ ہو ایک نظر ہی میں کیا سے کیا ہو گیا۔

"قطعی بدمعاش غنڈہ ہے۔ لوکا پٹھہ۔" ڈیوٹی کے بعد جب اختر اور شگفتہ کمرے میں آئیں تو میں نے انہیں فیصلہ سنایا۔ یہ فیصلہ سن کر شگفتہ کا چہرہ مرجھا گیا اور اختر کھل اٹھی۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی ... اب کہو۔ بھئی یہ غنڈے تو ذرا سے اشارے پر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ شگفتہ اس دن نہ ہنستی تو۔" اختر نے نصیحت شروع کر دی۔ اور شگفتہ کا چہرہ اس کی یونیفارم کا ہم رنگ ہو گیا۔ وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بھولے بھولے گالوں کا گوشت تک کانپتا نظر آ رہا تھا۔

"نہیں اللہ اس میں میرا قصور مجھے ہنسی آ گئی تھی، میں ہنس دی۔" شگفتہ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"قصور کسی کا نہیں اس کی رپورٹ پولیس میں کر دو ہتھکڑیاں پڑیں گے تو ..." میں نے اپنی ٹوپی اتار کر پلنگ پر اچھال دی۔

"ہائے دیوانے پن کی حد ہے؟ پولیس میں رپورٹ ہو گئی تو خدا جانے وہ کیا سے کیا کہہ دے پھر پولیس ہم سے بھی تو پوچھے گی کیسی بے عزتی ہوگی صولت آپا کو تو" اختر صلو کے خوف سے رونے لگی۔

"جہنم میں جائے صلو چلو وہ یہ اچھی رہی" ن کے ٹھینگا برابر صلو کی وجہ سے ہم کچھ نہ کریں۔ .... پولیس ساری چوکڑی بھلا دے گی سور کی۔ "اختر کے رونے پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ "میں ابھی پولیس کو فون کروں گی۔"

"ہائے خدا کے لیے نہیں۔ میرے ابا تو بس مجھے مروا لیں گے۔" شگفتہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔ "اختر باجی ٹھیک کہتیں یا تم۔ تم لوگوں کا عاشق ہے۔ میرا نام خواہ مخواہ بیچ میں نہ گھسیٹو کہ میں ہنسی تو یہ ہو گیا وہ ہو گیا۔"

اس کے بعد ہم آپس میں خوب لڑے۔ اختر شگفتہ کو تھپڑ مارنے پر آمادہ ہوگئیں شگفتہ خودکشی کا ارادہ کرنے لگی اور میں کبھی اختر کو بے نقط سناتی اور کبھی شگفتہ کو روتی۔ غرض ہم نہ صرف اپنی اپنی بوٹیاں نوچ رہے تھے بلکہ ایک دوسرے کی بھی گت بنا رہے تھے۔ رو رو کر ہماری آنکھیں سوج گئیں۔ دوسری نرسوں نے کن سوئیاں لینے کی کوشش کی۔ لیکن ہم نے کسی کو اپنا شریک نہ بنایا۔ رات کو جب ہم میس سے دو چار نوالے زہر مار کر کے لوٹے تو ایک دوسرے کی حالت دیکھ کر ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑے۔ تینوں بڑوں کی کانفرنس ہوئی اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ میں فی الحال اس ہوئی جہار سے جا کر پوچھوں کہ وہ ہم میں سے کس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اور اسے یہ بھی بتا دوں کہ ہم بے حد اونچے گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے ماموں یا چچا حکومت کے کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ اور وہ ہمیں ایسا ویسا نہ سمجھے ورنہ اس کو شہر بدر کروا دیا جائے گا۔ اور اس کے گھر والوں کو کولہو میں پلوا دیا جائے گا۔

لیکن جب میں اس کا جواب سن کر لوٹی ہوں تو میرے ماتھے کی ساری تیوریاں ادھر ہو چکی تھیں۔

''بھئی اب صاف صاف سن لو۔ وہ کہتا ہے تمہارے ساتھ والی نے مجھ پر ہنس کر میری بے عزتی کی ہے۔ میں اس سے نکاح کر کے اسے ٹھیک بنا دوں گا۔ اور اگر میں نے اور اختر نے اس سے نکاح کروانے میں مدد نہ کی تو وہ انتقاماً ہمارا عاشق بھی رہے گا۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کیس سے نہیں ڈرتا وہ خود بے حد اثر ورسوخ کا آدمی ہے بڑے بڑے اس سے اپنا کام کروانے کو خوشامد کرتے پھرتے ہیں وہ ایک قتل کر کے صاف نکل چکا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اسے منتظم بنا کر جلسے تک کرتے ہیں۔''

اختر نے جیسے کھلی فضا میں پہلی بار سانس لی۔

''شکر ہے میری جوتی سے میرا تو مری تبادلہ ہو رہا ہے آج ہی میٹرن نے بتایا ہے۔'' اختر نے اطمینان سے کہا۔

میرے سر سے بھی بوجھ اتر چکا تھا۔ میں ایک اور ٹریننگ کے لیے دوسرے ہسپتال میں بھیجی جا رہی تھی۔

لیکن جب ہم نے شگفتہ کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم سفید پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پلکیں تک ساکت تھیں۔

''شگفتہ........ شگفتہ ......'' میں نے اسے پکارا لیکن وہ ساکت رہی۔

''کوئی بات نہیں بس دھمکی دیتا ہے۔ لیکن دیکھو آئندہ زندگی میں کبھی اس طرح نہ ہنسنا۔ عورت ذات کو چاہیے کہ مردوں کے سامنے منہ بنائے رہے۔ اختر نے ہمدردی کے طور پر نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔

''دیکھو شگو تم اپنے ابا کو خط لکھ دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

شگفتہ اس مشورے سے پھوٹ پڑی۔ ہم اسے بڑی دیر تک تسلیاں دیتے رہے لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔ بس

وہ مسلسل روئے چلی گئی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آنے لگا۔ میں نے اسے سچے دل سے بہت سے مشورے دیئے کہ وہ کس طرح اس بدمعاش سے نمٹے۔ میں نے یہ تک کہا کہ مجھے کمزور عورتوں سے نفرت ہو جاتی ہے' مگر حریم بھی وہ سسک کر روتی رہی۔ وہ تمام رات تکیے سینے سے لگائے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ . صبح سے تیز بخار تھا

وہ کئی ہفتے تک ٹائیفائیڈ کا شکار رہی۔ . . اور اس دوران میں نہ صرف اختر مری چلی گئی' بلکہ ہوناہی جہانزیب کوئی مرض نہ ہونے کے باعث ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

بظاہر یہ واقعہ شگفتہ کے حق میں تھا' مگر میں سوچتی ہوں کاش وہ ہسپتال میں ہی رہتا اور شگفتہ اس دوران میں چھٹی لے کر لاہور سے باہر اپنے ابا کے پاس چلی گئی ہوتی۔

وہ ہسپتال سے نکل کر اور بھی خطرناک بن گیا۔ اب آئے دن شگفتہ کے نام ایسے محبت بھرے گمنام خطوط آنے لگے' جن میں لکھا ہوتا کہ "پچھلی ملاقات پر تم نے وعدہ کیا تھا فلاں جگہ ملوں گی' کیوں نہیں ملیں؟" شگفتہ ایسے خطوط پڑھ کر آپے سے باہر ہو جاتی۔ وہ موقع پاتے ہی میرے گلے لپٹ کر اس طرح روتی جیسے میں اسے ان حالات سے بچا سکتی ہوں۔ وہ کہا کرتی۔ "یہی میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اگر یہ خط ہسپتال میں کسی کو مل گئے تو میں یہاں سے نکال دی جاؤں گی۔ میرا سنکار ہو جائے گا۔

"تم اپنا ابا کے پاس چلی جاؤ' انہیں سب کچھ بتا دو۔" میں ہمیشہ بڑے خلوص سے اسے یہی مشورہ دیا کرتی۔

"نہیں' نہیں ابا مجھے مار ڈالیں گے یا وہ خود مر جائیں گے ابا مجھے کیا سمجھیں گے۔" شگفتہ ہسٹیریا کے مریض کی طرح چلانے لگتی' روتے روتے اس کی انگلیاں اینٹھ جاتیں اور وہ اپنا سر پھوڑنے لگتی۔ مجھے اس پر بہت ترس آتا۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کے ابا سید ہیں اور بڑی تنگی میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ . . . . انہوں نے بڑی مجبوری کے عالم میں شگفتہ کو گھر سے نکلنے کی اجازت دی تھی۔ وہ سید خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو گھر میں کام کرنے کی بجائے ہسپتال میں کام کرتی تھی وہ کہا کرتی تھی کہ میں نے ابا سے کہا تھا کہ ابا فاقہ مرنے سے بہتر ہے کہ میں کوئی کام کروں ابا میں تمہیں دکھا دوں گی کہ بیٹیاں کتنی اچھی ہوتی ہیں۔ ابا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی مگر اب میں کس منہ سے انہیں بتاؤں گی کہ میں ضدی تھی اس لیے وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔

میرے خیال میں شگفتہ کی یہ ہچکچاہٹ بے زاویہ نظر نری جذباتیت پر مبنی تھی مگر وہ اس پر اڑی ہوئی تھی کہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے مجھے اس کا یہ استدلال ذرا بھی متاثر نہ کرتا' ہو سکتا ہے کہ اس کے ان جذبات کا اس سے صحیح تجزیہ کر سکتی ہوں کہ میں اب اپنے گھرانے کی اکیلی رہ گئی تھی اور اکیلا آدمی خود پرست ہو جاتا ہے وہ اپنے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ بہرحال خط آتے رہے' ڈاک

میں مریضوں کے ہاتھوں آدمیوں میں بیٹھے ہوئے بحرانی کے ذریعے کئی بار ہم نے اسے ایک دقیانوسی کار نما چھکڑے میں بیٹھا بار بار ہسپتال کے سامنے آتا جاتا دیکھا۔

"آخر کار شگفتہ نے فیصلہ کیا کہ چھٹی لے کر وہ ایک مہینے کے لیے اپنے گھر جائے گی اور وہاں کوشش کرے گی کہ اس کا کہیں دور تبادلہ ہو جائے۔

شگفتہ نے بہت رازداری سے چھٹی لی' میرے علاوہ شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ وہ کب اور کس وقت جا رہی ہے....... برقعہ اوڑھ کر جب وہ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے مجھ سے ملی تو اس نے کہا میرے لیے دعا کرو..... میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ گھر پہنچتے ہی مجھے خط لکھے گی' کہ تبادلے کے لیے وہ کیا کر رہی ہے۔

یک وعدہ شگفتہ نے پورا نہ کیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ میرا تبادلہ دوسرے ہسپتال میں ہو گیا اور میں اس گلابی گالوں جیسی لڑکی کو بھول سی گئی۔ نئے ہسپتال میں مجھے زچہ خانے کی ٹریننگ حاصل کرنی تھی اتنی تھکا دینے والی اور تکلیف دہ تھی کہ اس ماحول سے ذہنی فرار حاصل کر کے میں صرف خواب دیکھ سکتی تھی' وہ بھی اچھے خواب بجائے اس کے کہ میں شگفتہ کو یاد کرتی' جس کے ساتھ ایک انتہائی غیر رومانی تکلیف دہ واقعہ وابستہ تھا۔

یک روز میں صبح صبح میس میں ناشتہ کرنے جا رہی تھی تو کوئی مجھ سے پیچھے سے آ کر لپٹ گیا۔ میں نے چیخ کر اپنے آپ کو چھڑایا۔ یہ شگفتہ تھی۔ اپنے مخصوص بے وقوفی انداز سے ہنستی ہوئی۔ دفعتاً سارے گزشتہ واقعات میرے ذہن میں مشین گن کی گولیوں کی طرح تڑتڑاتے کے ابھرے

میں نے ناشتہ نہیں کیا.... کیونکہ ڈیوٹی پر پہنچنے میں چند منٹ باقی تھے اور میں شگفتہ سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے اپنے کمرے میں گھسیٹ لائی۔ معلوم ہوا کہ شگفتہ نے بڑی کوششوں اور بڑی سفارشوں سے اس ہسپتال میں اپنا تقرر کروایا ہے۔

"تم نے خط نہیں لکھا' میں بڑی فکر مند ہو رہی تھی۔" میں نے گذشتہ واقعات کو یاد کر کے اس سے شکایت کی۔

اور یہ سنتے ہی شگفتہ کے چہرے پر خوف کا ایک سایہ چھا گیا۔

"نہیں میں وہ باتیں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اللہ کتنی خوفناک مصیبت تھی۔" اس نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا۔ اور میرے تفصیل سے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"میں جب تم سے رخصت ہو کر چلی تو آگے پل کے قریب رات کے اندھیرے میں' اس نے دو آدمیوں کے ساتھ میرا تانگہ

روک لیا۔ وہ لمبے لمبے خاکی کوٹ پہنے ہوئے تھے ۔۔۔۔۔ اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا ۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا نیچے آ جاؤ۔ خدا جانے برقعے میں وہ مجھ کیسے پہچان گیا تھا۔ بہرحال میں نے انکار کیا۔ تم سوچ سکتی ہو کہ سنسان رات کے اندھیرے میں سنسان سڑک پر میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ میں نے سوچا کیا کروں؟ مگر سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ میں زاروقطار رونے لگی۔ آخر میں نے ہمت کر کے پوچھا تم کیا چاہتے ہو۔ وہ کہنے لگا تم نے میری بے عزتی کی ہے میں تم سے نکاح کروں گا۔ اس کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچنے لگا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر روتے ہوئے اسے التجا کی کہ وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے وہ شرافت سے بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں اپنے گھر جا رہی ہوں تو وہ میرے گھر جا کر میرا رشتہ میرے باپ سے مانگے۔

وہ کچھ سوچ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے کہا اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ پستول دیکھ لو۔۔۔۔ میں تمہارا گھر دیکھنے تمہارے ساتھ چلوں گا۔۔۔۔ ڈولی میں وہ میرے پاس بیٹھا اور راستے بھر شوہروں کی طرح وہ مجھ سے پان اور کھانے کو پوچھتا رہا۔۔۔ میری بڑی التجاؤں کے بعد وہ میرے گھر سے ذرا فاصلے پر تانگے سے اترا اور جب تک میں اتر کر گھر میں نہ داخل ہو گئی وہ میرا پیچھا کرتا رہا۔۔۔ اب گھر میں بھی میرا برا حال ہو گیا۔ جب بھی میں گھبرا کر کھڑکی سے جھانکتی تو وہ میرے گھر کے سامنے ہی کسی دکان پر بیٹھا نظر آتا۔۔ دوسرے دن وہ ابا کے پاس آیا۔ لیکن ابا کو جب معلوم ہوا کہ وہ سید نہیں ہے تو ابا نے اسے ڈانٹ دیا۔ اور اس نے جواب میں میرے ابا کا سر پھاڑ دیا۔ ابا خون میں نہا گئے

شگفتہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھنا چاہا، پھر کیا ہوا؟ مگر میری ہمت نہ ہوئی' کیونکہ وہ یہ قصہ کہتے ہوئے ضرورت سے زیادہ اداس اور اداس ہو گئی تھی اور خود میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ چند منٹ خاموشی رہی۔

چانک شگفتہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایک اچھی خبر سنو؟"

"ابا کو کئی مربعے زمین الاٹ ہو گئی' یوں چٹکی بجاتے میں کام بن گیا۔" شگفتہ نے میرے چہرے کے قریب چٹکی بجا دی۔ "ابا بڑے خوش ہیں۔ اب دیکھو کتنے سال سے درخواستیں بھرتے تھے۔۔۔۔۔ ہماری زرعی زمین رہ گئی تھی ہندوستان میں۔"

میں چونکی۔

"پھر تم یہاں ہوائی جہاز کے شہر میں نوکری کرنے کیوں آ گئیں؟ تم تو کہتی تھیں تمہارے ابا کو زمین مل جائے گی تو۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں تو اسی کی کوششوں سے ابا کو زمین ملی ہے۔" شگفتہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ "اس نے تحصیل دار سے کہا زمین شاہ

صاحب کوئی الاٹ ہونی چاہیے ورنہ کوئی مردوں کا اس کی بکی دلوں ہو یوں کہتی ہیں کہ اس سے یہ بعید بھی نہ تھا وہ دوسروں کے لیے ایسے کام کرنے سے نہیں چوکتا۔" شگفتہ کہے گئی۔

"مگر کس کی کوشش سے بھئی" میں الجھ گئی اور مجھے ڈیوٹی پر پہنچنے کی بھی جلدی تھی گھنٹی بج چکی تھی۔

"فضل دین بھئی۔ فضل دین۔" شگفتہ میری کوڑھ مغزی پر ایک دم چڑ چڑ گئی۔

"کون فضل دین؟"

"چہ کیا دماغ پایا ہے۔ ساری رام کہانی سن لی۔ اب پوچھتی ہو رام مرد تھے یا عورت..... ارے فضل دین ہوائی جہاز والا۔"

وہ بڑی زور سے ہاتھ جھٹک کر چلائی۔

میں سناٹے میں آ گئی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس نے شگفتہ کے ابا کا سر پھوڑنے کے بعد کئی مربعے زمین کا پھایا کس طرح چپکا دیا۔ کہانی کے بیچ سے اوراق پھٹ کر غائب تھے۔

میں نے سر پر سوں سے ٹوپی ٹانکتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

"ارے بابا میں پوچھتی ہوں تمہیں تو نوکری سے نفرت تھی جب تمہارے ابا مربعوں والے ہو گئے تو پھر..... ؟"

"اُفوہ کہہ تو دیا کہ زمین باکولی ہے اس سے مجھ کیا فضل دین کہتا ہے مجھے اپنے لیے خود کمانا چاہیے اس سے اپنی بکلی بیویوں بچوں کا تو پورا نہیں ہوتا۔" "تو وہ میرے لیے کہاں سے قارون کا خزانہ کھود لائے؟"

"شگو!..... شگو" میں بچھ کر چیخ پڑی۔ "تو تم نے..... آں؟"

"ہاں آں!" اس نے جلدی سے سر جھٹک کر جیسے وہ بالکل معمولی سی بات کا اعتراف کر رہی ہو۔

میں کمرے میں نہ رک سکی..... میں رکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

"نیو نیو اس میں محسوس کرنے کی کیا بات ہے؟" "نیو سنو تو۔ فضل دین نے ابا کو سمجھایا کہ لڑکی جس کے ساتھ بدنام ہو جائے پھر لڑکی کو اسی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ سارے خاندان والے یہی کہتے تھے۔ ہوا زی نے بھی ابا کو یہی سمجھایا تھا۔" وہ تیزی سے بولتی ہوئی میرے برابر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر میرے قدم نہ رکے۔ اچانک اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

"نیو سنو دیکھ لینا اب میں کسی ایسے کے ساتھ بدنام ہوں گی جسے تم بھی بر نہ سمجھو گی۔" شگفتہ نے اپنے ٹھنڈے پسیجے ہوئے ہاتھوں میں میرا ہاتھ زور سے دبایا اور سامنے سے آتے ہوئے فورتھ ایئر کے ایک طالب علم کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

مگر میں سچ کہہ دوں یہ ہنسی کتنی عجیب سی تھی۔ یہ شگفتہ کی ہنسی نہیں تھی مجھے لگا جیسے کسی شیطانی ہنگی نے بڑھ کر شگفتہ کی ایک بانہہ کھینچ دی ہو۔

◆◆◆

ایک سفر ایک اشتہار

ریلوے پلیٹ فارم پر دور دور تک بکھرے ہوئے مسافروں کی نظریں اس سمت لگی ہوئی ہیں جدھر سے گاڑی آنے والی ہے۔ قلی بے تحاشہ چڑھتے ہوئے مسافروں کی مشکلات کے پیش نظر زبردست ہونے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ارے ہاں سامان چڑھانا کوئی مذاق تو نہیں۔ بچے سفر کی مشکلات سے بے خبر مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹھیلوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے ہیں اور بڑے لوگ انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر ریل میں جگہ گھیرنے کے گر بتا رہے ہیں۔ عورتیں برقعوں کی ڈوریاں کس رہی ہیں جیسے روایتی کمر ہمت کسی جاتی ہے۔

"گاڑی آرہی ہے۔ وہ دیکھو روشنی۔" پلیٹ فارم پر پھیلے ہوئے انسانی سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا ہے۔

مگر نہیں ... یہ کوئی اور اندھیری رات کا مسافر ہے۔ اس کا راستہ جدا ہے۔ دوسرے پلیٹ فارم پر قیامت برپا ہوگئی ہے۔ اور ادھر ابھی انتظار ہے۔ دل دھڑک رہے ہیں۔ آنکھیں پھڑک رہی ہیں۔ عورتوں کے کولہے بچوں کو دلا دلا کر تھک گئے ہیں اور ہاتھ سے پانی کی بھری ہوئی صراحیاں چھٹی جا رہی ہیں۔ لوگ کھڑے کھڑے ٹہلتے ٹہلتے تھک چکے ہیں۔ پلیٹ فارم کے پختہ فرش پر اکتائے ہوئے مسافروں کے تھوک اور ناک سے پھسلن بڑھ گئی ہے۔ ایک ننھا سا بچہ رپٹ کر گرا۔ اور اس کے قریب سے بڑی بے نیازی کے عالم میں ایک خاتون کا ریشمی غرارہ ناک تھوک کے دھبوں کو ہموار کرتا گزر گیا۔ زمین پر گھسٹتا ہوا غرارہ ہی تو خوبصورتی ہے۔

وقت بھی جیسے گھسٹ رہا ہے۔ گاڑی لیٹ ہے۔

اور جب صبر کی حد ہو گئی تو گاڑی آ گئی۔ کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مگر لوگوں کے منہ کڑوے ہو گئے۔

ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اترنے والوں کے چہرے یوں اترے ہوئے ہیں جیسے انہیں سرکس والے موت کے کنویں میں کودنا ہے۔ چڑھنے والے ڈبوں کی طرف یوں لپکے جیسے شکاری کتا درخت پر سے اترتی ہوئی بلی پر جھپٹ رہا ہو۔ تھرڈ کے بیسیوں ڈبوں کی طرح کے ایک ڈبے پر انسانوں، بستروں اور صندوقوں کا ہجوم حملہ آور ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مسافر خالی ہوتی ہوئی سیٹوں پر بستر پھیلا چکے ہیں۔ لمبا سفر کر کے آئے ہیں اور ابھی رات کا سفر باقی ہے۔ اکثر کا اس سے بھی زیادہ۔ پرانا بیڑا اور پرانا مسافر نئے آنے والوں کو آتے دیکھ کر بڑبڑائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے پرانے مسافر "جگہ نہیں" کا نعرہ بلند کر کے ایک ہی پرچم تلے متحد ہو گئے ہیں۔ پھر بھی دروازے

سے سامان اچھل رہا ہے' کھڑکیوں سے انسان اور پوٹلے درآمد ہو رہے ہیں۔ جو اندر گھس چکے ہیں وہ پرانے مسافروں میں سے ہو گئے ہیں۔ کھڑکیاں کھڑکیں پھر کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ جگہ نہیں ... جگہ نہیں۔ پھر بھی جگہ بنا رہے ہیں۔ سامان رکھنے کے اوپری تختوں پر لوگ بندروں کی طرح چپک رہے ہیں۔

"دروازہ بند کرو اب' ڈبے کے آخری کونوں میں سمٹے ہوئے مسافر گلا پھاڑ رہے ہیں۔

"خو تمہارے باپ کا ڈبہ ہے۔" ایک پٹھان دروازے میں تن کر چلاتا ہے۔ "ابی ادھر ہمارا لوگ آئے گا۔"

"ارے.... عورتیں' زنانہ ڈبہ دیکھو۔" دروازے کے قریب والے لوگ شدید احتجاج کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے لوگ ذرا بھی تفریح کے موڈ میں نہیں۔

"زنانہ ڈبے میں جگہ نہیں۔" عورتوں اور بچوں کے سالار قافلہ منمنائے۔

"زنانہ ڈبے میں جگہ نہیں تو پھر عورتوں کو لے جاؤ' نامحرموں میں دھکے کھلوانے لے آئے۔" ایک داڑھی والا فی الفور فتویٰ صادر کرتا ہے۔

عورتوں اور بچوں کا سالار قافلہ مرعوب ہے۔ عورتیں سہم کر اس کے قریب سمٹی کھڑی ہیں۔ بچے ماؤں کے برقعوں سے چپکے سہمی ہوئی چڑیوں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کا سالار سامان کا ٹھکانا کرنے کی فکر میں ہے۔

"ارے جناب ذرا آنکھیں کھول کر کیا کوڑا لاد رہے ہو میرے اوپر۔" پرانے سوٹ' راج کپور ٹائپ مونچھ اور دلیپ کمار اسٹائل بالوں والا نوجوان احتجاجات کی پوٹلی لڑھکا دیتا ہے۔

"کوڑا ہو گے تم۔" سالار قافلہ کی ترکی ٹوپی کا پھندنا غصے سے جھوم گیا۔

"ذرا ہوش میں سالے۔" جواب ملا۔

"چپ رہ۔" جواب الجواب تھا۔

ترکی ٹوپی گر گئی۔ "مائیں بہنیں" اپنے سالار کو بچانے کے لیے رونے چلانے لگیں۔ بہت سے کھڑے ہوئے لوگ بیچ بچاؤ کرنے کو جھپٹے۔ عورتوں کے برقعے کھنچ گئے۔ جسم چھل گئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر چیخیں مارنے لگیں۔ ہنگامہ اپنے عروج پر تھا کہ "خوبائی لوگ" کا موجودہ گروہ ڈبے میں داخل ہو گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ گھیرنے لگے۔ مار پیٹ خود بخود ختم ہو گئی۔

"خوبائی لوگ" کا گروہ ہر دو آدمیوں کے بیچ میں اپنا ایک آدمی بٹھانے کی فکر میں سارے ڈبے میں پھرنے لگا۔

"خان ادھر جگہ نہیں۔ یہ لڑکا بیمار ہے۔" بیٹھے ہوئے لڑکے کے پاس کھڑے ہوئے باپ نے نرمی سے کہا۔

"خو بیمار اے۔ تو لیٹا کیوں ہے؟" بوڑھے پٹھان نے غصے سے پوچھا۔

"بیمار اس واسطے لیٹا ہے۔" لڑکے کے باپ نے جواب دیا۔

"ام ہوتا بیمار اے تو سفر کیوں کرتا۔" خان کی آنکھیں چمکیں۔

"لڑکے کو علاج کے واسطے لے جا رہے ہیں...... اے خان لڑکے کو مت چھیڑو اس کے پھوڑے ہیں۔" باپ کی آنکھیں بھی چمکیں۔

"تمھی خدا کا کیسے نہیں ام ٹکٹ نہیں لیا؟"

"ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔"

"خنزیر کا بچہ تمہارا ٹکٹ لیٹنے کا نہیں اے۔"

"زبان سنبھالو خان۔"

خان نے کہنے والے کا منہ سنبھال دیا۔ یک بار پھر بڑ بونگ مچ گئی۔ کئی پٹھان ادھر ہی لپکے۔ بیمار لڑکے نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ دوسرے بھی چیخنے لگے۔ پولیس پولیس

پولیس نہیں آئی۔ جیم خانے کی طرف سے بھیک مانگنے والے دو لڑکے اندر گھس پڑے۔ اور انہوں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر

تیموں کی فریاد گانا شروع کر دی۔

خوف سے تھراتے ہوئے بیمار لڑکے کا بستر دوسرے مسافر نے ہمدردی سے سمیٹ دیا۔ بیمار اپنے باپ کی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا ہے اور باپ اپنا تھپڑ کھایا ہوا گال لیے ایک طرف کھڑا ہے۔

"خو یہ ام کو جگہ نہیں اے۔" دروازے کے قریب والا پٹھان چلایا۔ دروازے کی کھڑکی میں سے کود کر آنے والے سے کہہ گیا۔

"دوسرا ڈبہ دیکھو۔" ارد گرد کے مسافر برافروختہ ہو کر چیخے۔

"پھر میں کہاں جاؤں بھائیو۔ میں نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔ دوسرے ڈبے والے بھی کہتے ہیں دوسرا ڈبہ دیکھو۔"

"جہنم میں جاؤ۔ اوپر کی سیٹ پر سامان کے بیچ میں ٹھنسے ہوئے نوجوان داڑھی والے نے قرات فرمائی۔

"جہنم میں جاؤ تم" اور نئے مسافر نے عاجزی چھوڑ کر اپنا ٹین کا بکس اوپر رکھا۔ بلند آشیاں مولوی نے اپنا پاؤں دبے پر ٹھن

کے بکس کو ایک لات رسید کی اور دو مسافروں کے سر پر گرا۔ ایک مسافر کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی نئے پرانے مسافر نوجوان مولوی کو مارنے دھونسنے لگے۔ اور وہ تھا کہ اپنی زد میں آئے ہوئے ہر سر پر بیٹھے ہی بیٹھے لاتیں اور گھونسے برسا کر تمام بلند آشیاں مسافروں سے دو دو ہاتھ کرنے لگا۔ دفعتاً تمام نیچے والے مسافر بھڑ گئے۔ "سامان رکھنے کی جگہ سے اترو" ان کا نعرہ بن گیا۔ پورے ڈبے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ عورتیں خوف سے چیختی ہوئی سنڈاس میں قلعہ بند ہو گئیں۔ پوٹلیاں گیندوں کی طرح اچھلنے لگیں اور صراحیاں پھوٹ گئیں۔ پورے ڈبے میں پانی بہنے لگا۔

اور پھر اس ہنگامے کے عروج پر پچھلے سے تین مسافروں کی ایک ٹولی اندر گھس آئی اور ساتھ ہی سامان۔ آپس میں لڑنے والے اس اجنبی طاقت کو دیکھ کر ایک دم سست پڑ گئے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کو بھاگے۔ نوجوان مولوی کے پاس اچک کر زخمی ماتھے والا گھس گیا۔ دوسرے کھڑے ہوئے لوگ اپنے اپنے سامان پر بیٹھ گئے۔ نئے مسافروں نے اطمینان سے اپنا سامان سنڈاس کے دروازے پر جمالیا اور اس پر بیٹھ گئے۔

"اے جی ادھر سے سامان ہٹاؤ" کیا سنڈاس میں کسی کو نہیں جانا ہے؟" سبھی مسافروں کا مشترکہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھائیو جب آپ کو ضرورت ہوگی تو ہم سامان ہٹا لیں گے۔ اب بتاؤ آخر ہم کدھر جا کر بیٹھیں۔"

"جہنم میں" نوجوان مولوی اور زخمی ماتھے والا ایک زبان ہو کر بولے۔

اور اس سے پہلے کہ جواب الجواب کی نوبت آتی۔ اچانک عورتوں اور بچوں کے سالار قافلہ ڈبے کے ایک کونے سے ترکی ٹوپی کا پھندنا نچاتے اٹھے۔

"ارے لوگو میری عورتیں اور بچے سنڈاس میں ہیں۔" سالار نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فریاد کی اور اس اطلاع سے مسافروں میں قہقہے پھوٹ پڑے۔ ہنگاموں میں لوگ عورتوں کو بھول ہی گئے تھے۔

سنڈاس میں جانے کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

"مجبوری ہے بھائی نہیں کریں گے پیشاب . . . . بچاریاں اندر اطمینان سے تو ہیں باہر کہاں دھکے کھائیں گی۔"

سنڈاس کا دروازہ گھیر کر بیٹھنے والے مسافر مطمئن ہو گئے۔

"لوگو میری عورتیں" دور سے سالار قافلہ ایک بار پھر پکارے۔ اور پھر ٹرین چل پڑی۔ اور جب ٹرین چل پڑے تو آپس کے گلے شکوے رک جاتے ہیں۔

سنڈا اس کے سامنے بکسوں کے نیچے پر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں آنکھیں جھپکتے ہوئے مسافروں پر ایک نظر ڈالی اور کھنکھار کر اردو کا ایک اخبار اپنے چہرے کے سامنے پھیلا کر شروع کر دیا۔ ٹرین ہلتی ڈولتی بھاگی جا رہی ہے۔ بیمار لڑکا گاڑی مڑی بنا ڈبے کے آخری کونے میں بیٹھا کراہ رہا ہے۔ اس کے پھوڑے ٹپک رہے ہیں۔ درد بخار سے آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس کا باپ دور کھڑا ٹرین کے جھٹکوں میں جھول رہا ہے اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے پٹھان نسوار حلق سے نکال کر تھوک رہے ہیں۔

بیمار لڑکا لیٹنا چاہتا ہے۔ اس کا جی ڈوب رہا ہے۔ باپ اس کے قریب نہیں وہ سب کے منہ دیکھتا ہے۔ سب اپنے آپ میں مست ہیں۔ لڑکے کی اکتائی ہوئی نظر سنڈا اس کے سامنے صندوقچیوں کے انبار پر بیٹھے ہوئے اخبار بین مسافر تک پہنچتی ہے۔ مسافر کا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا ہوا ہے اور اخبار کی پشت پر آدھے صفحے کے اشتہار میں ایک تصویر چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک نیم دراز آدمی کی تصویر ہے جو سگریٹ سلگائے ہوئے سکون سے پڑا ہے.... یہ تصویر دیکھ کر لڑکے پر آرام سے لیٹ جانے کی خواہش پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہے ..... لیکن وہ بالشت بھر جگہ میں سکڑا ہوا بیٹھا ہے۔ اور اس کے پھوڑے دکھ رہے ہیں۔ اس لیے وہ خود کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔

آہا کیسی اچھی تصویر ہے۔ اسکول میں جب وہ تھا تو اس سے اچھی تصویری ڈرائنگ کر سکتا تھا .. لڑکے نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ اب وہ اسکول چھٹ جانے کے غم میں مبتلا تھا۔ بیماری کی وجہ سے اس کا اسکول چھٹ گیا .. اور جو لڑکے اسکول چھوڑ دیتے ہیں وہ جاہل رہ جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں جب وہ اسکول سے بھاگتا تو ابا اسے یوں ہی تو سمجھاتے۔

مگر لڑکے نے گھبرا کر سوچا۔ وہ تو اب بھی پڑھ سکتا ہے۔ اور بیمار لڑکے نے چپکے چپکے بیٹھے ہوئے آدمی کے اشتہار پر موٹا موٹا لکھا ہوا تیزی سے پڑھ ڈالا۔

”ٹکٹ خرید کر اطمینان سے سفر کیجئے“

◆◆◆

گائے

جب اختر میاں گھنگھروؤں اور جھالروں سے آراستہ یکے سے اترے تو حویلی کا وہ پھاٹک آسمان سے گرتی ہوئی رات کے اندھیرے میں سیاہ معلوم ہو رہا تھا۔ حالانکہ پھاٹک کے قریب حال ہی میں لیمپ کا کھمبا دوبارہ لگا تھا۔ یوسف بھیا نے ٹاؤن ایریا کمیٹی کا ممبر ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اس حویلی سے رشتے داری کے باعث یہاں روشنی کا انتظام کروا دیا۔

"سالے لیمپ میں تیل نہیں ڈلواتے اب" اختر میاں نے پھاٹک سے گزرتے ہوئے کسی اینٹ سے ٹھوکر کھائی تو بڑبڑائے۔ ان کے قدموں کی مانوس چاپ سن کر احاطے کے کونے میں بندھی ہوئی بھینس اور بیلوں نے زور سے سوں سوں کر کے بھوسا اڑا دیا اور زنانہ ڈیوڑھی سے لگی ہوئی لالٹین کی مردہ روشنی میں سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ زنانہ ڈیوڑھی کے قریب ٹوٹی ہوئی خالی ناند سے منہ پھیرے بوڑھی مرجلی گائے کسی خیال میں مست آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اختر میاں کے جوتوں کی آواز سے یوں بےتابی میں لڑکھڑا کر اٹھی جیسے پوچھ رہی ہو "پہنچا آئے؟" مگر اختر میاں کی بے رخی دیکھ کر وہ دوبارہ خالی ناند پر منہ مار کر مراقبے میں چلی گئی۔

سامنے والے برآمدے کے آگے دادا اپنے بھیگے پلنگ پر لیٹے حقہ پی رہے تھے اور نائی کا چھوکرا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

"پہنچا آئے؟" دادا نے بھیگے کھرے پلنگ پر اپنی ننگی پیٹھ رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اختر میاں نے شیروانی کے بٹن مروڑ کر جواب دیا۔ وہ دو ایک منٹ رکے۔ مگر دادا نے اور کچھ نہ پوچھا۔

"ہونہہ! انہیں اور کچھ پوچھنے کی کیا غرض پڑی ہے؟" اختر میاں اندر ہی اندر کھولتے چپ چاپ مڑے اور ڈیوڑھی کی طرف چل دیے۔ اندھیرے میں ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی کھاٹ سے گھٹنا ٹکرایا تو ان کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگیں۔ مگر دادا جو موجود تھے۔ بہرحال دادا نے اس بڑھاپے میں بھی اپنے ہاتھ سے کسی کو کوئی اختیار نہ دیا تھا۔ حتیٰ کہ گالی تک بکنے کا۔ پھر بھلا کسی کی کیا مجال کہ اونچی آواز سے بھی گھر کے اندر بول سکے۔ اختر میاں نے گھٹنے کی چوٹ سے سلسلاتے ہوئے دانت اور مسوڑھے ہونٹوں سے بھینچے اور وہیں کھاٹ پر ٹک گئے۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے میں گھنگھروؤں کی تانیں سی ان کے کانوں میں بج رہی تھیں۔ اور ان کے دل میں عجیب سی مایوسی، عجیب سی جھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

"یہ دنیا یہ دنیا کچھ بھی تو نہیں' کسی کا بھروسہ نہیں لعنت!" انہوں نے گھٹنا پکڑ کر سوچا اور ان کا گلا بھر بھر نے لگا۔

چند منٹ بعد وہ ہلکا سا لنگڑاتے آنگن میں داخل ہوئے' آنگن میں ہمیشہ کی طرح پرانی چوکی پر دھواں دیتی چمنی کی لالٹین جل رہی تھی اور باورچی خانے والے دالان کے سامنے کریموں کے باورچی خانے کی گز بھر اونچی حد بندی پر مٹی کے تیل کی کچی بدبودار روشنی دے رہی تھی۔

ن کی اماں شاید کچھ پکا رہی تھی۔ دالان کی دیواروں اور کٹاؤ دار محرابی دروں میں لٹکے ہوئے چھینکوں پر آگ کی روشنی ہمیشہ کی طرح تھرک رہی تھی۔ اختر میاں دھم سے کھرے پلنگ پر گر پڑے۔ ڈربے میں مرغیاں کڑکڑائیں' جیسے وہ بھی پوچھ رہی ہوں "پہنچ آئے انہیں جو ہمیں صبح صبح باسی روٹی مل کر ڈالتی تھیں۔"

"آ گئے میرے لال پہنچ آئے؟" ن کی ماں باورچی خانے کی ننھی سی دیوار کے پیچھے سے ابھر کر لپکیں اور ایک دم ناک سڑ سڑا کر رونے لگیں اور پھر روتے روتے قریب پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ماں کا دکھ اختر میاں کے اوپر ہی اوپر سے گزر گیا۔ ان کی ناک میں صرف ماں کے پسینے کی بو آئی انہوں نے بڑا اجنبیت سے اپنی ماں کو دیکھا جو لالٹین کی مدھم روشنی میں بڑی دبلی پتلی نظر آ رہی تھیں۔ چوڑی دار تنگ پاجامہ ان کی پنڈلیوں پر جھریوں کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اور سونے کی کیل والی لمبی ناک تلے سے وہ بار بار ناک پونچھ رہی تھیں۔

"گھر کیسا کھانے کو دوڑتا ہے میرے اللہ" ان کی اماں نے رو کر بین کیا اور تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا جیسے وہ اللہ میاں سے فریاد کر رہی ہوں کہ بیٹی بھی دی تو ایک' اور سے بھی اپنے ہاتھوں سے جدا کر کے دوسروں کو سونپنا فرض بنا دیا تو نے۔ جوانی کا رنڈاپا دو بچوں پر کٹا۔ اے اللہ کیا بگڑتا تیرا جو رنڈ پے سے پہلے دو چار بچے دے دیتا۔ آج کلیجہ یوں نہ پھٹتا جو گھر میں اور بھی کوئی بچی ہوتی۔

تاروں بھرے آسمان کے تلے سے ایک چمگادڑ پنکھ پھیلائے پروں کا سناٹا بکھیرتی امرودوں کے باغ کی سمت منہ اٹھائے گزر گئی۔ ان کی اماں نے ایک لمبی سانس لے کر پاندان کھڑکھڑایا اور آنسو پونچھ کر تمباکو کی ایک چٹکی منہ میں ڈال لی۔

"کھانا کھا لو اختر میاں۔ اچھا پہلے منہ دھو لو سفر سے لوٹے ہو۔" ان کی ماں نے پاندان چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا اور لکڑی کی گھڑونچی پر سے لوٹے میں پانی انڈیل کر آنگن کے ایک کونے میں پڑی ہوئی چوکی پر رکھ دیا۔

اختر میاں کی تو بھوک اڑی ہوئی تھی دل میں کوئی کانٹا کھٹک رہا ہو اور انسان بیٹھ کر حلق سے نوالے اتارے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے

کچلے ہوئے پاؤں میں کوئی نیا جوتا ٹھونسنے بیٹھ جائے۔

"مجھے بھوک نہیں" اختر میاں نے بھرائی آواز میں کہا۔

"کیوں بیٹا کیا بات ہے؟" اماں بے تاب ہو گئیں "لے اب میں تجھیں روؤں گی۔ تو رنج نہ کر۔"

اماں کے یہ خوش فہمی سے لبریز الفاظ اختر میاں کے کانوں کو چھیل کر دماغ میں چبھے۔ سنسنا کر سارا خون دماغ میں بھنور بن گیا۔ انہیں شدید غصہ آیا کہ اماں ابھی تک انہیں بچہ ہی سمجھتی ہیں جو ماں کے آنسو دیکھ کر خود بھی رونا شروع کر دیتا ہے اور اس وقت تک چپ نہیں ہوتا جب تک کہ ماں کے آنسو نہیں خشک کرا لیتا۔

"میں جوان ہوں عقلمند ہوں سب سمجھتا ہوں۔" اختر میاں نے جی ہی جی میں خود کو اطمینان دلا دیا۔

دراصل یہی تو ساری مشکل تھی کہ وہ اب اپنی گرہ سے سوچنے سمجھنے لگے تھے۔ خود وہ اُنیس سال کی عمر ان کے حساب سے کم نہ تھی۔ اور پھر قصبے بھر میں کون تھا جو انہیں نہیں جانتا تھا۔ دادا کی پچھلی زمینیں ضبط ہو گئیں۔ مگر پھر بھی وہ گزارے بھر کی زمین اور حویلی والے اختر میاں تو تھے ہی۔ لوگ بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے۔ مگر ان جیسے بھی بہت تھے جو کہیں نہ گئے۔ وہ اب بھی جب قصبے کے بازار میں پان منہ میں دبائے ترچھی ٹوپی سر پر رکھے نکلتے تو پرانے باشندے "اختر میاں سلام" ضرور پکارتے ان کی دیکھا دیکھی نئے آنے والے بھی انہیں مانوس نظروں سے دیکھنے لگے۔ کچھ ڈھنگ ہی ایسا تھا اختر میاں کا کہ خواہ مخواہ لوگ مرعوب ہوتے۔ بزرگوں جیسی باتیں بڈھوں جیسے مشورے قصبے میں کوئی ان سے مشورہ مانگے نہ مانگے۔ مگر موقع پا کر وہ مشورہ ضرور دیتے۔

"میں تو کہتا ہوں۔" اختر میاں پان کی پیک تھوک کر ہمیشہ اس شان سے بات شروع کرتے کہ خود ان کی نظروں میں اپنی وقعت بڑھ جاتی۔ یہ علمیت اور ہر معاملہ میں حرف آخر کہہ دینے کی صلاحیت خداداد تھی۔ ورنہ پڑھنے لکھنے سے تو ان کی صحت کراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ یوں ہی نہ تھا۔" اندھیری اُمس بھری رات میں تاروں بھرے آسمان تلے پلنگ پر پڑے پڑے انہوں نے پھر سوچا اور ان کا دل گہرے درد اور ناقابل فہم اذیت سے پُر ہو گیا۔

"یہ عقل میں نے تجربوں سے سیکھی ہے، واللہ گھاس کھود کر تھوڑی۔" اختر میاں نے آنکھیں بند کر کے اپنی زندگی کی مڑی تڑی پگڈنڈیوں پر پلٹ کر نظریں ڈالیں جس پر طرح طرح کے پھول قسم قسم کے کانٹے سرنہوڑے پڑے تھے۔

دادا کنجوس تھے۔ وہ اپنی نسل کو اپنی زندگی میں کوئی خفیہ رشتہ ناتا سمجھتے تھے۔ مگر کوئی کہاں تک کسی کی موت کا انتظار کر سکتا ہے۔

اختر میاں بڑی بیوہ ماں کے ایک ہی بیٹے تھے۔ قصبے کے مڈل اسکول کے زمانے میں ہی وہ چلاتے "ہمیں تو پیسے دو اماں" اور ماں بی ڈبی ڈبائی رقمیں نکال کر ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ قصبے کا بازار مختصر سا سہی مگر ضرورت کی ہر چیز مل جاتی۔ فرض کرو بازار میں اپنے کام کی چیز نہ سہی تو پھر گھر تو کہیں نہیں گئے۔ کبھی کبھی ضرورت پر لوگ گھر کی چیزیں بھی اٹھا کر اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔

لیکن اختر میاں اپنے گھر اور خاندان کی روایتوں کے معاملے میں ہمیشہ سے بہت پکے تھے۔ گھر میں جب وہ اپنی مرجھلی سی بڑی بہن کو چاروں طرف سے بند آنگن میں چلتے پھرتے دیکھتے تو انہیں عجیب سا اطمینان ہوتا۔ جیسے کسی نقب زن کو اونچی دیواریں محفوظ دیکھ کر خوشی ہو سکتی ہے۔

"آپا کہاں چلیں؟" اختر میاں بہن کو ٹوکری اٹھائے ڈیوڑھی کی طرف جاتا دیکھ کر چلاتے... بہن ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی اور بھنی بڑی بڑی گائے کی معصوم آنکھوں سے بھیا کو دیکھتی "گیا کو بھس منڈا لوں؟" وہ دھیرے سے پوچھتی۔ بوڑھی گائے کو ہمیشہ وہ ہاتھ سے چارہ ڈالتی تھی۔

"تو آپا تو چارہ ڈالنے جا رہی تھیں؟" اختر میاں اطمینان کرتے اور بہن حیرانی سے منہ کھولے انہیں دیکھتی رہتی۔ چھوٹی سی کسی ہوئی چوٹی سے نکلے ہوئے ننھے ننھے بکھرے ہوئے بال، خشک خشک ہونٹ اور کانوں میں پڑے ہوئے سونے کے جھمکے ہر چیز ساکت سی ہو جاتی۔ صرف بڑی بڑی گائے جیسی آنکھیں حلقوں میں موہوم سی حرکت کرتی رہ جاتی۔

"اچھا تو پھر جاؤ نا" اختر میاں کی نظریں جھک جاتیں اور وہ مطمئن ہو کر قینچی سگریٹ جلا لیتے۔ لیکن آج ان کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ آج انہیں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے گھر میں بھی نقب لگنے لگی تھی۔ واپسی میں راستے بھر وہ اپنے "آپ سے لڑے تھے۔ توبہ توبہ..... مگر ثبوت جو تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا منہ پیٹ ڈالیں۔

"بیٹا رنج نہ کرو لو ذرا سا کھا لو۔" اختر میاں کی اماں پیتل میں روٹی، سالن کا کٹورا اور پانی کا مراد آبادی گلاس دھرے آئیں۔

"میں نہیں کھاؤں گا" اختر میاں تقریباً چیخے۔

"اے بیٹا اتنا رنج نہیں کرتے" ماں کا دل خون ہونے لگا۔ انہیں پہلے کیا معلوم تھا کہ اختر بہن کو رخصت کر کے اتنا رنج کرے گا تو وہ سسرال والوں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑتیں کہ لڑکی کو جلدی میکے بھیجیں۔

"اے بیٹا خط لکھوا دوں گی کہ اسے جلدی میکے لائیں۔ لو اب کھاؤ" ماں نے پچکارا۔

"مجھے نہ چھیڑو وہ کبھی نہ آئے مجھے کیا غرض؟" اختر میاں چلائے۔ ماں کھسیا کر رہ گئیں۔ "کھانا نہیں

کھاؤں گا۔ مجھے بھوک نہیں" اور اختر میاں نے بازو میں منہ چھپا کر کروٹ بدل لی۔ شیروانی تلے انہیں اپنے جسم پسینے کے قطرے رینگتے محسوس ہوئے اور وہ ایک دم اٹھ کر دالان میں چلے گئے۔

اماں نے پریشان ہو کر کھانا پلنگ پر رکھ دیا اور خود دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ گھٹنے پر کہنی جما کر ہتھیلی رکھ کر وہ لالٹین کی اداس روشنی میں اپنے بیٹے کو دیکھنے لگیں جو دالان میں کھونٹی پر شیروانی لٹکا رہا تھا۔ یہ بیٹا جو ان کی سمجھ میں کسی طرح آتا ہی نہ تھا۔ جب تک بہن گھر سے رخصت نہ ہوئی تھی۔ وہ یہی بڑی بہن کو یوں سخت نظروں سے دیکھتا جیسے بڑا بھائی ہو۔ اور اب کہ بہن کو رخصت کر کے آیا ہے تو چھوٹی بہنوں کی طرح رنج کر رہا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتا اور نہ کوئی بات کرتا ہے۔ لو بھئی بہنیں بھی سدا کسی کے گھر بیٹھی رہتی ہیں۔ اللہ نہ کرے کبھی کسی بدنصیب کی بہن سدا اپنے بھائی کے گھر رہے۔ .... پاکستان سے لڑکی کے سسرال والوں کا خط ذرا دنوں نہ آتا تو دل میں ہول پڑ جاتی۔ نکاح کر کے ہی تو گئے تھے وہ لوگ پاکستان کہ بھئی پتا ٹھور ٹھکانا کر کے دلہن رخصت کریں گے۔ بہتوں کا سنا کہ پاکستان جا کر ایسے بدلے کہ دلہن کی صورت بھی دیکھے بغیر طلاق لکھ کر بھیج دی۔ لو نہ دعویٰ نہ مہر۔ بیٹھے قسمت کو روتے رہو۔ سنا ہے۔ پاکستان میں ایک سے ایک صورت شکل اور دولت والے رشتوں کی بھرمار دیکھ کر لوگوں کی نیت بدل جاتی ہے۔ لوگوں کے دماغ چڑھے آسمان پر ہیں۔ وہاں اپنے خاندان اور ذات برادری کی لڑکیاں پسند ہی نہیں" تمہیں۔ اے ہمارے داود کے بڑے بھائی نے آخر پاکستان ہی میں شادی کی نا۔ کیا گوری چٹی سی ہے۔ سنا ہے پڑھی لکھی بھی ہے۔ کیا اپنے دیور سے گٹ پٹ کر رہی تھی۔ حق بات کہوں میری بچی سے صورت شکل میں بھی اچھی ہے۔ اللہ کا شکر ہے افسر دولہا پاکستان جا کر ہمیں بھولے نہیں۔ دیر سے ہی مگر آ تو گئے اپنی دلہن رخصت کرانے۔ ... نہ آتے تو ....؟ پاکستان جانے والوں کا بھروسہ ہی کیا ہے۔ یہ اختر میاں خود رات دن ڈراوے دیتے تھے اور اب بہن چلی گئی تو مارے رنج کے کھانا بھی نہیں کھاتے۔

ماں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھیں اور انہیں اپنے بیٹے کی اس ادا پر پیار بھی آ رہا تھا۔

اختر میاں دالان سے نکلے تو پلنگ دری اور تکیہ لیے ماں نے جھپٹ کر بستر بچھا دیا۔ اختر میاں ایک گلاس پانی چڑھا کر بستر پر پڑ رہے۔ ماں نے لالٹین کی بتی اور نیچی کر دی۔

گھر کیسا ہو گیا۔ تم نے اسے بھی یاد کر کے روئے نہیں۔" ماں نے ذرا کڑھتے ہوئے گھر کے سناٹے میں اکتا کر پوچھا۔

"نہیں" اختر میاں نے زور سے جواب دیا اور ان کے سامنے اپنی بہن کی بڑی بڑی سیدھی ڈھیلوں والی آنکھیں آ گئیں جو بار بار اپنے میاں کی طرف اٹھتیں اور جھک جاتی تھیں۔

"ہاں بیٹا بہن کو سمجھاتے بھی کیا خود ہی کلیجہ منہ کو آ رہا ہوگا۔ میں نے کہا تھا دلی سے اسے پائل ورشا کی دلا دینا دلا دی تھی؟" اماں نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

"ہوں" اختر میاں نے جواب دیا اور ایک زوردار سانس لی۔

"اللہ اتنی گرمی، دیکھو اور دو برقعے میں غیر عورتوں کی وجہ سے منہ بھی نہ کھول سکتی ہوگی" اماں نے بڑے درد سے تصور کیا اور بانس کا پنکھا اٹھا کر اپنے اوپر جھلا۔

اختر میاں تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے کھانا کھاؤ گے؟" اماں چونکیں۔

اختر میاں کا جی چاہا کہ پٹاخے کی طرح دھوں سے پھٹ کر دھواں بن جائیں = تو گویا اماں سمجھ رہی ہیں۔ کہ انہیں دفعتاً بھوک لگ آئی ہے!

"یا اللہ یہ مائیں اتنی سادہ کیوں ہوتی ہیں، اگر میں انہیں بتا دوں تو؟" اختر میاں نے بات اپنے کلیجے میں گھونٹ لی اور دوبارہ تاروں بھرے صحن کے آسمان تلے اپنے پلنگ پر چت لیٹ گئے۔ ان کے خون میں چنگاریاں سی اڑ رہی تھی۔

بیٹے کی خاموشی سے تنگ آ کر اماں کمرے کے پلنگ پر ایک لوٹا پانی چھڑک کر لیٹ رہیں۔ اور پنکھا جھل جھل کر اپنی بیٹی کو یاد کرنے لگیں۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو باپ نے کیا منہ بنایا تھا کتنے دن تک پلٹ کر صورت نہ دیکھی تھی، جب ذرا ہاتھ پاؤں چلانے لگی تھی تو ماں نے اس کے ہاتھوں پیروں میں ننھی ننھی گھنگھریوں والی چوڑیاں اور پازیبیں پہنا دیں۔ ہلتی تو چھن چھن گھنگھرو بولتے۔ چند ہی دن میں باپ بھی اسے گود میں اٹھا کر چومنے لگے۔ جب باپ مرے تو وہ چھوٹی سی تھی۔ مگر ماں کو روتے دیکھ کر ایک منٹ کو بھی ماں کا پلو نہ چھوڑا اور اس کے بعد ہمیشہ وہ اس گھر میں بیوہ ماں کا ایک چھوٹا سا ثبوت بن کر رہی۔ یہاں تک کہ وہ اس گھر سے پچیس سال کی عمر میں روتی دھوتی رخصت ہوگئی۔

تمام دن وہ گھر کا کام کاج کرتی، لیکن جب سے وہ جوان ہوئی تھی، کئی بار ماں اسے بوجھ جان کر خوامخواہ جھڑک دیتی۔ مگر وہ کیسی گائے جیسی بھولی بھالی آنکھوں سے ماں کو دیکھتی کہ دوسرے لمحے ماں تلافی کر دیتی اور اب وہ اپنے گھر کی ہوگئی۔ اس کا گھر بھی کتنا دور تھا۔ ماں کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اختر میاں تفصیل سے سفر کی بات بتائیں۔ مگر اختر میاں جب سے آئے تھے چپ تھے۔

"اماں نے بانس کا پنکھا ہاتھ بڑھا کر اختر میاں پر جھلا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹے تھے اماں نے سوچا تھکا ہوا تھا، سو گیا

مگر اختر میاں سوئے نہیں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے اور اندر ہی اندر اذیت سے تڑپ رہے تھے۔

رات گزرتی گئی۔ باہر کوئی آوارہ کتا رویا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر ہر طرف دیکھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سارا گھر انہیں بڑا پراسرار معلوم ہوا' جیسے ہر دیوار پر سے بھوت گردنیں جھکائے اندر جھانک رہے ہوں' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سامنے کی دیوار پر گیند کی طرح سمٹی ہوئی بلی باہر کود گئی۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ روئیں روئیں سے پھوٹ پڑا تھا۔

اختر میاں نے سوچا کہ اگر وہ چپ رہیں گے تو شاید پورے کے پورے اپنے پسینے میں بہہ جائیں گے۔

"اماں سو گئیں؟" اختر میاں نے آواز دی۔

"آں ۔ ... نہیں تو بیٹا" اماں کا دبلا پتلا جسم سرسرا کے پلنگ پر تہہ ہو کر بیٹھ گیا۔

"اماں آپ کیا سنانا چاہتی تھیں ... منجھلی باجی ریل میں مردانے ڈبے میں بیٹھی تھیں۔" اختر میاں نے ایک دم جیسے اگل دیا۔ ماں نے نظر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

"اچھا اور سنیے ریل چلی تو ان کی جرأت دیکھیے بھابی نے کہا برقعہ اتار دو دلہن' جب اترنا تو پھر پہن لینا۔" اختر میاں کی آواز بلند ہو گئی۔ ڈربے میں ایک مرغی کڑکڑائی۔ ماں نے سر جھکا کر پنکھے کی ڈنڈی دانتوں تلے دبالی۔

"اماں آپا کو آپ نے ہر وقت نگاہ میں رکھا تھا نا۔" اختر میاں نے سوال کیا۔ اور ماں نے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر بیٹے کو دیکھا

"بولیے نا۔ میں سب سمجھتا ہوں میرے آگ لگ گئی۔ آپ بہت بنی ہوئی تھیں۔" اختر میاں نے اونچی آواز سے کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے تو' تیری زبان میں کیا کیڑے بلبلا رہے ہیں ذرا سنوں تو کی؟" ماں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"میں کہہ رہا ہے تو' تیری زبان میں کیا کیڑے بلبلا رہے ہیں ذرا سنوں کی؟" ماں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"میں کہنا نہیں چاہتا' مگر آپ نے سن لیجئے باجی نے اتنے مردوں کے سامنے اپنے ہاتھوں برقعہ اتار دیا یا سنا کچھ؟"

"تو جس طرح اس کی سسرال والوں نے کہا' کیا۔ تمہیں کیا؟" ماں نے دیر سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں.... یہ میں جانتا ہوں۔ مگر اماں آپا ذرا نہ شرمائیں۔ آنکھیں بھی نہیں جھکائیں۔ آپ کیسی تھیں اماں؟" اختر میاں پھٹی ہوئی آواز میں چلائے۔ مگر ماں اسی طرح بیٹھی رہیں۔ ان کی کوئی بنیاد نہ ملی۔

اختر میاں نے مایوس ہو کر لیٹ جانا مناسب سمجھا۔

یا اللہ یہ مائیں اتنی سادہ کیوں ہوتی ہیں۔ اختر میاں کیا سوچ رہے ہیں۔ آخر وہ یہ سمجھتی کیوں نہیں۔ اختر میاں کی آنکھوں سے

گرم گرم آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ کانٹا ابھی تک کھٹک رہا تھا۔ وہ بدستور پرسکون تھیں انہوں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔

گزرتی ہوئی رات میں ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا ہلکورے مارتے گیا۔ احاطے میں دادا زور سے کھانسے اور پھر انہوں نے اسی پیانک دلال مرتے پر تھوکا۔

ویران سے پڑے بھوسے کی خالی ناند پر بوڑھی مرغی کائے منہ مار کر ڈکرائی۔ جسے آج کسی نے بھوسہ نہ ڈالا تھا۔

"اس کم بخت کو کوئی نہیں خریدتا۔ قصائی تک نہیں۔" اختر میاں نے اپنا دھیان ہٹانے کی غرض سے سوچنا شروع کیا۔

مگر یہ نہ سوچا کہ وہ گنور کھاں والے جو جوان پر سوار ہیں

◆◆◆

بھاگ بھری

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی۔ میڈیکل کالج کے زمانے میں میں نے اپنے آپ پر روپوں کی کیسی کیسی بارش ہوتے نہ دیکھی تھی۔ اپنے بڑے بڑے پروفیسروں کی لمبی لمبی کاریں دیکھ آدمی اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر جب ڈگری لے کر اس بازار میں آئی تو معلوم ہوا کہ گلی کے اندر حقیر سے کمرے پر بورڈ لگا کر بیٹھنے سے وہی دولت واپس آنا مشکل ہے جو بہوؤں کے زیورات بک بک کر فیسوں اور کتابوں پر خرچ ہوئی... آگے چل کر میں نے کیا رخ اختیار کیا یہ ایک الگ قصہ ہے جس کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری نہیں ہاں تو ان دنوں جب پہلی بار مجھے دور دراز کے ایک گاؤں میں زچگی کا ایک کیس کرنے کی دعوت ملی تو میں کافی خوش ہوئی۔ بظاہر میں نے منہ بنایا اور اپنے بے شمار مریضوں کی پریشانی کا ذکر کیا لیکن جب سیدھے سادے چھیل چھبیلے پیغامبر نے میرا بھاؤ ایک دم بڑھا دیا تو میں فوراً تیار ہو گئی دو سو روپے روز کے کم نہیں ہوتے۔ میں حیران رہ گئی کہ شہر کی دوسری چلتی ہوئی ڈاکٹرنیوں سے بچ کر یہ میرے پلے کیسے پڑ گیا۔

میں نے جلدی سے اندر جا کر والدہ سے ذکر کیا لیکن وہ خوش ہونے کی بجائے کچھ پریشان ہو گئیں۔ کہ بھلا دور کی بات ہے جوان کنواری لڑکی ہے کو ڈاکٹر ہو پھر بھی والدہ کی اس "پھر بھی" سے میں بھی ذرا پریشان ہوئی لیکن پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی میں نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ دوڑ کر سائیکل پر جائے اور کالج میں کم از کم چودن کی چھٹی کی درخواست دے آئے اور ساتھ ہی میں نے گھر کی پرانی ملازمہ مائی کو سفید شلوار کرتا پہنا کر بطور نرس ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ جب میں واپس اپنے مطب کے اجڑے کمرے میں گئی تو یہ بات بھی فوراً طے ہو گئی کہ نرس کو دس روپے روز ملیں گے۔

پھر میں نے پوچھا کہ "وہاں ٹرین یا بس کس وقت جائے گی؟"

"کار ساتھ لایا ہوں" جواب ملا۔

اور میں یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ دیہات سے شہر تک پہنچتے پہنچتے کار کہیں اتنی بے کار نہ ہو گئی ہو کہ راستے میں پریشانی اٹھانا پڑے۔ لیکن جب میں اپنے دو محافظوں کے ساتھ والدہ کو دعائیں پڑھتے چھوڑ کر گلی طے کر کے سڑک پر آئی تو تازہ بتازہ کیڈی

لگ دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ ضرور بدل گیا ہوگا   میں چونکی کہ میں نے فیس ورزیادہ کیوں نہ لی۔

راستے میں میرے چھوٹے بھائی نے کرید کرید کر کئی بار یہ معلوم کیا کہ ہم ضلع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں' جاگیردارنی مصر تھیں کہ لاہور سے ڈاکٹرنی بچہ جنانے آئے   بڑے عارہ توں کی بھی رہتی تھی۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے مختلف دنیا میں وارد ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہماری منزل تھی۔

بڑی سی بیٹھک کے دروازے پر پیلی پڑتی دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راشن تقسیم ہو رہا تھا اور دس بارہ آدمی ان کتوں کی زنجیروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ہماری آمد پر وہ چونکے لیکن پھر کتوں کی زنجیروں پر جت گئے۔ . . . اسی پیلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر میرے دو سو روپے روز کے داتا ملک گل نواز آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے...... سفید سلک کی تہمد اور نیلی سلک کی قمیض سر پر بھیر کلاہ کی بھاری پگڑی، ور کلائی پر باز ..... ملک کے ہاتھ پر رکھی ہوئی تازہ تازہ فاختہ کے پر کھیر کھیر کر گوشت نوچ رہا تھا   ۔ یہ وقت باز کے راتب کا بھی تھا۔

لیڈی ملک کے اس مالک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی' مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی۔

"ڈاکٹرنی صاحب بڑی تکلیف فرمائی آپ نے' میں آپ کو خوش کر دوں گا۔" ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے میں کسی کتاب میں دیکھی تھی۔۔ ماتھے تک پیچ در پیچ بڑی سی پگڑی' بڑی گھنی مونچھیں' کرسی پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ پر باز بٹھائے.....   بس "ہنگ کیا مانگتا ہے" کہنے کی کسر تھی۔

زنان خانے کا ماحول لباس ورسجاوٹ کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا عموماً ہمارے پرانے شہر کے بڑے گھروں میں ہوتا ہے صحن میں رنگین پیڑھیوں پر کافی سے زیادہ عورتیں رنگین تہمد اور موٹی ریشمی کنارے والی چادریں لپیٹے منتظر شکلیں بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھیس سے ڈھکے ہوئے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت فکر مندی بیٹھی نسوار سڑک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کی بڑی بوڑھی ہوں گی۔ حقیقتاً بھی ملک کی والدہ بڑی ملنگنی تھیں   مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی لیکن وہ امید پوری نہ ہوئی میں ٹھٹکتی ہوئی پلنگ کے قریب رک گئی۔

بڑی ملکنی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دوشالے کا پلو سرکا کر گردن سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے جی میں دعا کی کہ اللہ ان سب عورتوں کے دردزہ ہونے لگے۔

”مریض کہاں ہے؟“ میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت سے گھورنے لگیں۔

”بیمار کہاں ہے؟“ اب کے میری بی بی نے انتہائی کرخت زبان میں سوال کیا۔

اللہ کا نام لو بیمار کہاں؟“ ایک عورت نے دونوں طرف چھدی ہوئی ناک کی پھنگیں جھکا کر بڑی ہی کرخت آواز میں جواب دیا...... سب کی معاندانہ نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

میں نے سمجھا میں دیر میں پہنچی ہوں اس لیے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں.... شاید بے چاری ختم ہو چکی.... اور میں افسوس میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک کی صوفوں سے ٹھنسی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی۔

”مجھے افسوس ہے ملک صاحب میں مریضہ کو نہیں دیکھ سکی۔“ میں نے دیکھا کہ اس فقرے سے میرے بھائی کے چہرے کا رنگ یوں اڑ گیا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو ظاہر ہے کہ میرے بھائی کو تعلیم کے لیے فیس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ مگر ملک صاحب کے پھیلے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”اوہ ڈاکٹرنی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر نہیں کیا تھا کہ عورت ڈاکٹرنی بدلی ہے۔“ یہ کہہ کر ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

”مگر ملک صاحب اب اندر جانے سے کیا فائدہ“ میں نے گردن جھکا کر کہا۔

”ڈاکٹرنی صاحب آپ برا نہ مانیں بی بی دراصل میری والدہ رسم و رواج کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں اس لیے میں نے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ ذرا شرما کر بولے... اور میں کچھ نہ سمجھ کر الجھن کے ساتھ ہولی۔

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی میں جھک جھک شروع ہو گئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بناتی اور بیٹے سے الجھتیں۔ ”بیمار... بیمار... اللہ بیمار کہتی ہے۔“

یہ قصہ میری سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا۔ ”بڑی ملکنی کو آپ کی یہ

بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے محل کی زچہ کو" بیمار" کہہ دیا۔ زچگی آپ جانتی ہیں کہ بڑی مبارک چیز ہے۔" وغیرہ وغیرہ

"وہ ۔ سامنے محل میں ہے۔" ملک نے ایک لمبے سے کمرے کے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے گوہر مقصود کا پتہ دے رہے ہوں اور میں بجائے ہنسنے کے تعمیل کر دی گئی۔

صرف ایک دروازے والے لمبے سے اندھیرے کمرے میں زچہ کو دیکھنے سے پہلے مجھے کھڑکیاں اور روشندان ڈھونڈنے کے لیے نظریں دوڑانا پڑیں اور پھر مایوس ہو کر میں ان عورتوں کی طرف متوجہ ہو گئی جو اس کمرے میں موجود تھیں۔ ایک سر کی بڑھیا ہونے والی ماں کا پیٹ پکڑے پلنگ پر چڑھی بیٹھی تھی' دو اس جیسی کئی عورتیں اس کے ہاتھ پاؤں دو سر دبا رہی تھیں۔ سب نے مجھے اس طرح دیکھا کہ میں نے زچہ کے بجائے محل کی آرائش دیکھنا شروع کر دی۔ کمرے کے ہر کونے میں سجے ہوئے رنگین پلیٹ اور خوبصورت کھیس۔ دیواروں پر ہر قسم کے برتن آئینے اور پنکھے۔ تو یہ محل ہے۔ میں نے سوچا۔

زچہ تیس پینتیس سال عورت تھی۔ جو اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین تھی۔ اگر اس کے درد زہ نہ ہو رہا ہوتا تو کافی خوبصورت نظر آتی۔

میں نے اپنی مائی سے مخاطب ہو کر کہا کہ زچہ کو فوراً اس گھٹے اور گھٹے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔

مائی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور ہڑ سا مچ گیا۔ انگلیاں ناکوں اور ہونٹوں پر پہنچ گئیں اور ہٹر میں بڑی ملکی دہنی ہوئی آنکھیں۔

میری تجویز دیوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی۔ کیونکہ اس قسم کا کمرہ زنان خانے کا "محل" کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو اسی جگہ اپنے بچے کو جنم دے۔

"عورتیں کمرہ خالی کر دیں۔" میری دوسری تجویز بھی نامنظور ہو گئی۔ .... کیونکہ غیر عورت کے ہاتھ میں زچہ کو سونپ دینا ان کے نزدیک حماقت ہے.... ۔ لہٰذا میں نے مائی سے کہا کہ وہ زچہ کے پاس کھیس کی اوٹ کرے تاکہ میں مریضہ کا معائنہ کر سکوں

پہلی زچگی تھی۔ مریضہ نے بتایا کہ "بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن پورے ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی نو مہینے پورے ہی نہ ہوئے۔ ایک فقیرنی کہتی تھی بی بی جان رہے گی نہ یہ بچہ۔ میم صاحب دونوں کو بچاؤ۔ بڑا انعام دیں گے۔" مریضہ درد اور خوف سے سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ہے۔ یہ سن کر ممنونیت سے مریضہ کے آنسو نکل آئے اور ناک سے رطوبت بہہ آئی رومال سے اس کے آنسو پونچھ چکنے کے بعد ناک پونچھنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ ہیرے کی بڑی بڑی کیلوں سے

تھے ڈھکے ہوئے تھے۔

میں نے دینے کو تسلی دے دی مگر یہ قصہ سن کر خود پریشان سی ہو گئی۔۔ بچی کی عمر کی وہ دوڑا مشکل سے ہوتی ہے اور پھر زچہ کو درد بھی بڑے بے ڈھنگے تھے اور بچے کے قلب کی حرکت سست۔ میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا ورنہ واپسی کے لیے لیڈی لک تو کیا خاک ملے گی۔

رات آ گئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں۔ .... اور باری باری مریضہ کا جسم دباتی رہیں... . مائی نے ایک دفعہ چپکے سے کان میں کہا بھی مریضہ کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کہتی ہیں' یہ ڈاکٹرنی مفت خوری ہے' ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے... .. میں نے مائی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مریضہ زور سے کراہنے اور ہونٹ کاٹنے لگی تو میں نے سب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں چیخیں اور پلنگ کے پاس دو اینٹیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں۔ تا کہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیٹھ جائے۔

"بسم اللہ خیر اللہ۔ مریضہ ان کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور میں یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے چیخ پڑی۔

"سب چھوڑ دو بھاگ جاؤ یہاں سے' تم لوگ اسے مار ڈالو گی۔" عورتیں اس مداخلت پر پھر شور مچانے لگیں۔ مائی نے مریضہ کو بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا اور مجبوراً بغیر کسی اوٹ کے بچہ سب کے سامنے ایک کمزور سی آواز میں رونے لگا۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں آ گئیں باقی دروازے میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت خراب ہے۔ میں نے بلیڈنگ کم کرنے کے لیے اسے انجکشن کھیوں کے نرغوں کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں ڈر سے کراہیں' زچہ کو غش آ گیا تھا۔ اچانک باہر بندوقوں کے فائر ہونے لگے اور پھر ڈھول نقاریاں بجنے لگیں۔ اس کے بعد رسموں اور شگونوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی بار میری توجہ زچہ کی طرف سے ہٹ ہٹ گئی۔

ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ ساری چیزیں دلچسپ تھیں' مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لیے دوستانہ نہیں تھا' حالانکہ میں نے کئی رسموں میں دوسری عورتوں کو دیکھ کر روپے بھی دیے لیکن چونکہ مجھے قدم قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے جھگڑنا بھی پڑا تھا اس لیے میری دلجوئی اوپری اوپری رہی۔

رات بھر ڈھول بجی زچہ کو پوری نیند لینا چاہیے تھی کیونکہ اسے بخار تھا۔ مگر وہ اس ہنگامے میں تنی دلچسپی محسوس کر رہی تھی کہ میں مجبوراً خاموش ہو جاتی صبح جب میں ناشتے کے لیے ملک صاحب کے بلاوے پر بیٹھک میں گئی تو میرے بھائی نے بتایا کہ باہر کی

رات بھر آتش بازی چھوٹی اور ملک کی سینکڑوں مزاروں نے ناچ گا کر صبح کی اور ملک کو بچے کی پیدائش میں بڑی نذریں ملیں
میں ان نذروں والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔
لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہو۔
ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سویرے ہی سے بادل آنا شروع ہو گئے۔ میں نہانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر منوں غلاظت لپٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی.... یہ تو میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ اس گھر میں میری سب سے تاتی ہے اس لیے میں نہانے کے لیے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا۔ رات بھر کی جگائی کے بعد بخار کی شدت میں تھوڑی سی نیند لینے کے بعد جب زچہ نے میری طرف کروٹ لی وراس کی آنکھیں ہیروں کی کیلوں کے ساتھ چمکیں تو میں نے اس سے کہا کیو نہانے کے لیے گرم پانی مل جائے گا؟"
"بسم اللہ ضرور نہادی۔" اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ "بھاگ بھری سے کہو میم صاحب کے لیے پانی گرم کر دے۔"
زچہ کو انجکشن دینے کے بعد میں نے دائی سے کہا کہ سوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔
"کپڑے تو کی تمہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے۔" زچہ نے میٹھی ادا سے مسکرا کر کہا۔
ور مجھے بہت برا لگا' خدا جانے یہ گنوار ملکنی مجھے کوئی دائی خدمتگار سمجھتی ہے جو بیٹا جننے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔
"ہم ڈاکٹر ہیں ملکنی' اپنی مقرر فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں۔" میں نے غرور سے منہ بنا کر جواب دیا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔
"میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے پھر ہم تو بھی کو کچھ دیں گے اللہ نے یہ دن دکھایا ہے۔"
"اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا میں تو... "
تنے میں ایک دس بارہ برس کی لڑکی بھدر بھدر اندر آ گئی۔ خوب صورت تندرست چمپئی سا رنگ' ماتھے پر مہین گندھی ہوئی مینڈھیوں کی محراب' کانوں میں چاندی کے بندے یہ بھاگ بھری تھی۔
"ہم اسے بھی جوڑا دیں گے بیٹا جو ہوا ہے" زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔
ور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم شرمانے لگی۔

"پانی رکھو، یہ بھاگ بھری! میم صاحب کو غسلخانے لے جاؤ۔" زچہ نے اس سے کہا۔ اور میں نہانے چلی گئی۔

نہاتے ہوئے میں جھنجھلا کر سوچتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں، کسی کی پوزیشن تک کو نہیں جانتے۔ جوڑا دے گی مجھے زچہ! جب میں نہا کر سر پر تولیہ لپیٹے نکلی تو گیلے بال سکھانے کے لیے صحن میں بیٹھ کر آتی جاتی دھوپ میں سستانے لگی۔ بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور دوڑ کر مٹی کے کنگروں والی انگیٹھی لا کر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت بھاگ بھری میرے دل کو بھا گئی۔

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ عورتوں پر عورتیں امڈی چلی آ رہی تھیں۔ اس وقت پھر گانے بجانے کا پروگرام تھا۔

چانک ملک صاحب کھانستے کھنکارتے زنان خانے کی طرف آئے۔ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا، زچہ و بچہ کے بارے میں دو ایک باتیں دریافت کیں۔ اور پھر بڑی ملکنی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔

"بھاگ بھری! بھاگ بھری ملک جی نہائیں گے، تولیہ باہر غسلخانے میں رکھ آ......" بڑی ملکنی نے حکم دیا۔

اور بھاگ بھری اسی طراری سے بھدر بھدر بھاگتی مردانے غسلخانے کی طرف چل دی۔

گانے بجانے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں بور ہونے لگی۔ میں اطمینان سے سونا چاہتی تھی میرے خیال میں زچہ کو بھی سکون سے سونا چاہیے تھے۔ لیکن کوئی بس نہ چلا.... میں نے اس وقت سوچا کہ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ دیہات صحت بخش قبریں ہیں۔ مگر میرے اللہ یہ قبریں کتنی پرشور ہیں۔ کتنی متعدی جیتی لاشیں۔ کتنی بیک نیت ہے۔ میں تو ہوں ہی شہر کا کیڑا! مگر شرط بدکر کہہ دوں کہ شہر کے مرغے یکے تنک کو یہاں سے آ کر تو مراقبے میں جا کر جان دے دیں۔ میں نہایت تنگی سے سوچتی رہی، سوچتی رہی، مجھے اپنے دورے کے دو سو روپیوں کا دھیان تک نہ آیا۔ اور پھر جیسے موت کے مراقبے میں جھونک کھا گئی۔ در حقیقت مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔

چانک بھاگ بھری روتی، گھسٹتی میرے پاس سے گزری اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا وفعتاً وہ ڈگمگائی اور زمین پر گر پڑی۔ اس کا نیلا تہمد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی... کائیں کائیں شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک دم باورچی خانے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آ کر بہت سریلی آواز میں رونے بین کرنے لگی۔ یہ بھاگ بھری کی ماں تھیں۔

بھاگ بھری نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"ہائے! ملک جی! ملک جی! وے!" بھاگ بھری نے ماں کی طرف ہاتھ پھینک کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں پھر زور زور سے

بین کرنے لگی۔

ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا۔ میں ایک کنواری لڑکی بین کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ مائی مجھے کپکپاتا دیکھ کر سہارے سے زچہ والے کمرے میں لے آئی۔ اچانک صحن میں بڑی ملکانی کی دبنگ آواز شور کرنے لگی۔

مائی دوبارہ خود لینے باہر چلی گئی۔ میں سن سی بیٹھی رہی

تھوڑی دیر بعد ذرا سی خاموشی طاری ہو گئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھی

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے قصہ مختصر کر کے سنایا کہ بڑی ملکانی بھاگ بھری کی ماں کو روک رہی تھی۔ کہ کچھ والے گھر میں رونا مت ڈالو .... لیکن جب وہ اپنی بیٹی کی حالت کے بین ہی کرتی گئی۔ تو بڑی ملکانی آپے سے باہر ہو گئیں۔ کہ تیری لڑکی خود مستانی ہوئی ہے۔ تو یہ رکھ کر وہاں رکی کیوں۔؟ مرو ہے کیوں کرے۔ اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دہائی دینے والی آئی۔ وہ دن بھول گئی جب تیرا خاوند کھیتوں پر ہوتا تھا اور تو ملک جی کی بیٹھک میں ہوتی۔ .. بھاگ بھری کی ماں نے رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی بڑی ملکانی۔ وہ بھی جل گئیں کون ہیں مریم بیبیاں۔ جنہیں تو پکار رہی ہے۔ اس پر وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی بھاگ بھری کی ماں جب رونے سے باز نہ آئی۔ تو ملکانی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ جاتے ہوئے وہ بھاگ بھری کو لے جانا چاہتی تھی۔ مگر جواب ملا "نہیں جائے گی آج کام بہت ہے حویلی میں۔ . سب رشتے ناطے والے جمع ہیں۔ ایسی کونسی موت آ رہی ہے بھاگ بھری کو......."

"ہائے وہ دنیا جوں سے ترتر ہے" توبہ میری" کیسے بے وقوف لوگ ہیں" خوامخواہ بھاگ بھری کی ماں کو اور غصہ دلایا" وہ ایسے غصے میں گئی ہے کہ پولیس لائے گی" دیکھ لینا" مائی نے "ختم شد" کے طور پر ایک زوردار آہ کھینچی اور سوچ میں غرق ہو گئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے زچہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور سنجیدہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں اس کا منتوں اور مرادوں کا پہلا بچہ گنڈوں اور تعویذوں سے گندھا پڑا تھا۔

میں نے سوچا اف انسان کے ساتھ شیطان کیوں لگا ہوا ہے۔ اب یہ پہلا بچہ دیکھو اب باپ کے لیے جیل کا دروازہ کھلا ہو ہے خبر جانے مجھے زچہ پر کتنا ہی رحم کیوں نہ آئے" میں تو سچی گواہی دوں گی۔ . . مجھے ہی مجھے دو سو روپے روز کے ملا کرتے ہوں اس کے بعد باہر صحن میں زور زور سے ڈھول دھمکنے لگا۔ اور کسی گیت کے بول گونجنے لگے۔

میں اس موقعہ پر ڈھول کی آواز سے ہول گئی۔ گیت کے بول سن کر اداس لیٹی ہوئی زچہ کو جیسے ہوش آنے لگا۔ اور اس نے

مینڈھوں سے لگتا ہوا میں آہستہ سے بچے پر جھکا دیا اور سے ہولے سے چوم کر موہوم طور پتے پر مسکرائی ایسی محتاط مسکراہٹ جیسے وہ مکڑی کے جالوں جیسی ہو اور وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا" بچے کی قسمت بھی کیسی ہے۔"

"نصیبوں والا ہے جیوے میرا لال" زچہ نے چونک کر جواب دیا۔

میں نے سوچا مجھے بچے کے بارے میں کسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ ماں کا دن بڑی سے بڑی مصیبت اور تباہی کی ذمہ داری بھی اپنے بچے پر نہیں ڈالے گا... مگر پھر بھی میں نے اپنی قانون دانی سب کی سب اس کے سامنے اگل دی۔

وہ تعجب اور خوف سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتی رہی۔ اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بچے کو چومنے لگی بخار سے پتہ جانے کیا سوچ کر زچہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں خاموش ہو گئی حویلی کی انگنائی میں ڈھول کے ساتھ گیتوں کے بول لہراتے رہے ... ایک عورت اندر آئی اور اس نے زچہ پر جھک کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکی وہ چلی گئی

میں نے زچہ کا ٹمپریچر لیا۔ بخار اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ بچے کو بھی بخار تھا میں اب یہاں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا... کہ میں دوائیں دے کر رخصت ہو جاتی۔ مگر مجھے اپنے پاؤں میں یک زنجیری بندھی معلوم ہو رہی تھی ظاہر ہے یہ زنجیر کون سی تھی؟

تھوڑی دیر بعد وہی عورت آئی جو دراصل زچہ سے گھسر پھسر کر گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ بھاگ بھری تھی۔ بھاگ بھری کی آنکھوں میں وہ شرم نہیں تھی جو میں نے پہلی بار اس کمرے میں آتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی وہ کواڑ کا سہارا لیے چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میم صاحب اس کا بھی علاج کرو" زچہ نے میری طرف لجاہت سے دیکھ کر کہا اور میں اس دیہاتی جاگیرداری کی عظمت کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

بھاگ بھری کی تکلیف کا جو بھی مداوا ممکن تھا۔ میں نے کیا۔ بھاگ بھری اس وقت کتنی بے حس ہو رہی تھی۔

یک دن اور گزر گیا .. دودھ اترنے کی وجہ سے زچہ کا بخار بہت تیز ہو گیا۔ وہ بار بار غافل سی ہو جاتی لیکن اسی دن میں واپس چل دی۔ شاید میں زچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور رک جاتی' لیکن اسی دن بھاگ لینے میں میری ماں کا شدید اصرار شامل تھا

قصہ یوں ہوا کہ میں صبح صبح اپنے بھائی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے لیٹے ہوئے دیوان خانے میں مربے اور پراٹھوں کا ناشتہ کر رہی تھی اور ملک صاحب مجھ سے زچہ بچہ کی خیریت پوچھنے کے بعد باہر دھوپ میں اپنے مرغوب موڈ میں دھوپ لے رہے تھے۔ اور ان کے شکاری کتوں کو صبح کا راتب تقسیم ہو رہا تھا۔ قریب ہی کہیں ڈھول نفیریاں بج رہی تھیں۔ اور اس لمحے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن اور رہنا چاہیے۔ چہچے بن رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی اوٹ سے نکل کر بھاگ بھری ماں آتی نظر پڑی۔ جاڑے کی دھوپ میں اس کا سیاہ تہمد سرخ سبز کرتہ اور گہری زرد چادر چمک رہی تھی۔ وہ دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر یک بڑا تھال تھا۔ جو گوٹا لگے سرخ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھی وہ بھی کچھ نہ کچھ سر پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ اور مرد بھی تھے۔ بعض ناچ رہے تھے۔ اور بعض ڈھول نفیریاں بجا رہے تھے۔ بھاگ بھری کی ماں کی قیادت میں یہ جلوس بالکل قریب آ گیا۔ راتب پر جھگڑے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اچھلتے پھاندتے مردوں کی ہاؤ ہو سے ملک صاحب کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا باز ایک دم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔۔ اور سب کے بعد اکڑتے بڑے گھوڑے کی لگام ایک بچے کی طرف اچھال کر تھا تیار ملک صاحب کی طرف بڑھا۔

حویلی کی ڈیوڑھی سے عورتیں سیلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سے ریشمی کپڑوں والیاں دیوان خانے میں بھی گھس پڑیں۔ میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھا کہ بھاگ بھری کی ماں نے تھال اتار کر ملک صاحب کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

"بچے کے کپڑے آئے ہیں" کا شور اندر سے باہر تک برپا تھا۔ میں ایک دم مائی کو ڈھونڈنے اندر بھاگی۔ آنگن خالی تھا۔ زچہ خانے میں زچہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور بھاگ بھری کی مینڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔۔۔۔ ۔۔ وراس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ درد زہ میں مبتلا ہو۔۔۔۔ ۔۔۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"بدتمیز نے پانی بستر پر گرا دیا۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

اور اس کا چہرہ ایک دم یوں پرسکون ور آسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی بچہ جن کر فارغ ہوئی ہو ۔ بھاگ بھری کے دونوں گالوں پر انگلیوں کے سفید نشان ابھرے ہوئے تھے اور بستر یا کمرے میں پانی کا نام تک نہ تھا۔

میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈ کر اس سے گھر پھر کی وہ شدت سے میری ہم نوا ہوئی ور ہم فوراً چلنے کو تیار ہو گئے ۔۔ مجھے

ان حالات میں یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں اکیلی گھر میں ہوں۔ ایسے گھر میں جس کی دیواریں گر چکی ہوں۔

گھر پہنچ کر تین دن کے چھ سو روپے والدہ کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بڑے زور کی بحث شروع ہو گئی۔ صحیح یا غلط؟ مطلب یہ کہ میں نے فوراً چلے آنے میں حماقت کی یا نہیں۔ والدہ کہتیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی کہتا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگ گئیں۔

اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو۔ میں یہ بات بتا دوں کہ کرتے ٹوپی کے جس جلوس کی قیادت بھاگ جبری کی ماں کر رہی تھی۔ وہ تھانیدار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

◆◆◆

موت اور دودھ

وہ مئی تھی اور رات کالی۔ ہوا بھی کافی خوشگوار تھی لیکن ایسے موقع پر ہوا کی سبک رفتاری تک پراسرار بن کر تاریکی اور ویرانی کو گہرا کر رہی تھی۔

وہ دونوں اجڑے کھیتوں کے بیچ میں ایک پگڈنڈی پر رک رک کر چل رہے تھے۔ راہ سے ذرا بھی ادھر ادھر پاؤں پڑتا تو کٹی ہوئی فصل کا کوئی کھونٹا پاؤں تلے آ جاتا اور وہ اس طرح جھجک کر پگڈنڈی پر پلٹتے جیسے پاؤں تلے سانپ آ گیا ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو چودھری کا پاؤں ایک کھونٹے پر پڑ کر موچ کھا گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بڑی تکلیف کے ساتھ رک رک کر لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے رحمت کو بھی مجبوراً آہستہ روی اختیار کرنا پڑ رہی تھی۔

وہ دونوں گاؤں کے قریبی منڈی سے اپنی تازہ ستھری فصل کو چند نوٹوں میں تبدیل کر کے لوٹے تھے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی وہ تیز تیز اپنے گاؤں چل پڑے تھے۔ مگر اچانک فصل کی باقیات نے چودھری کی ایڑی تلے آ کر ان کی راہ کھوٹی کر دی۔ سورج کب غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرے میں ویسے بھی بھوت نکل کھڑے ہوتے ہیں اور پھر اس مہنگائی اور بھوک کے زمانے میں اگر جیب میں چند کوڑیاں بھی ہوں تو لٹیروں اور ڈاکوؤں کی شکلیں بھی ہر طرف تاریکی میں سے امنڈ پڑتی ہیں۔ رحمت ایک قسم کا کمزور سا آدمی تھا وہ تو بس بہادری کی باتوں کا مرد تھا میدان تو بہادری دکھانے کے موقع اسے زندگی میں کم ہی ملے تھے۔ اس کے قدم اندھیری رات میں تیزی سے اٹھنے لگتے مگر چودھری کی لاٹھی کی دھمک جلد ہی اسے ٹھٹکا دیتی۔ مشکل تو یہ تھی کہ چوروں اور اندھیروں کے علاوہ وہ چودھری سے بھی تو ڈرتا تھا۔

"ایک دم چپ کیوں ہو گیا رحمے۔ کوئی بات کر بھائی" چودھری نے تھوڑی دور چل کر ہولے سے کراہ کر کہا۔

"آ ۔ ہا ۔ ہا ہاؤ ۔" رحمت نے زبردستی ایک زوردار جمائی لی اور اپنی پگڑی کھول کر چلتے چلتے دوبارہ باندھنے لگا۔

"نیند آ رہی ہے۔" وہ بیزاری سے بولا منڈی سے یہاں تک اس نے کافی بک بک کی تھی اب وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا

چاہتا تھا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ مٹی پر جوتوں کی گھسر گھسر صاف سنائی دینے لگی۔ اور چودھری کی لاٹھی کی دھمک تو بم کے گولے کی طرح فضا میں پھٹ رہی تھی۔ رحمت کا جی چاہ رہا تھا کہ اب تو بس یونہی چپ چاپ چلتے جائیں۔ پاؤں کی چاپ تک نہ ہو چودھری کے ہانپنے کی آواز تک کان میں نہ آئے۔ اور پھر اچانک ان کا گاؤں آ جائے۔

چراغ کی اکا دکا روشنیاں دور جگنوؤں کی طرح چمکتی دیکھ کر چودھری نے اندازہ لگایا کہ اب وہ نور پور سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ہیں۔ نور پور جہاں چودھری کا چچا زاد بھائی رہتا تھا۔ اور جس سے اس کی اتنی دشمنی تھی کہ بس چھری کو پائے تو دشمن کو نہ پائے اور دشمن کو پائے تو چھری کو نہ پائے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ منڈی میں ملا تھا۔ جہاں انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح زور سے کھنکھار کر زمین پر بیک وقت تھوک دیا.... اور یہ دیکھ کر منڈی کے بیوپاری خوفزدہ ہو گئے تھے۔ مگر اس وقت دونوں میں سے ایک کے پاس بھی غالباً چھری نہ تھی۔

پر اس وقت نور پور میں کوئی چھریوں کی کمی ہو گی؟ چودھری کے رونگٹے یقیناً اس وقت کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ مگر وہ اپنے دل میں بھی یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ بزرگوں کی پالی پوسی دشمنی کی یہ ہتک کیونکر گوارا کر سکتا تھا پھر وہ خود کوئی معمولی آدمی تو تھا نہیں جوانی کے دنوں میں وہ تن تنہا ایک خوفناک چیتے سے بھڑا تھا۔ جس پر اسے تحصیلدار نے سرکار کی طرف سے دو سو روپے انعام دلوایا تھا۔ اس سے گاؤں میں سب دبتے تھے۔ اس نے زمانے کے بڑے سرد و گرم دیکھے تھے اور ان سے بہادری کے ساتھ نمٹا تھا۔

اور اب اس بڑھاپے میں وہ کیسے بزدل بن سکتا تھا؟

چودھری ایک لمحے کو رکا اور ایک گہری طویل سانس لی۔ جیسے اب تک اس نے جی بھر کر سانس نہ لی ہو رحمت نے دیکھا کہ چودھری آپ ہی آپ اپنے دانتوں تلے کچھ پیس رہا ہے۔ اور اس کی سفید داڑھی اندھیرے میں ہل رہی ہے۔ رحمت کو یہ معلوم کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ اب وہ جن روشنیوں کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ نور پور ہے۔ جہاں چودھری کا چچا زاد بھائی رہتا ہے۔

رحمت نے دب کر سوچا "ہنہ" میں کون چودھری کا سالا ہوں.... اچھا ہے اب کم از کم وہ نور پور سے نکل کر دو آبادیوں کے بیچ میں آ جائیں گے۔ اپنا گاؤں پھر کیا دور رہ جاتا ہے مگر یہ سب سوچنے کے باوجود رحمت کو اب تک اپنے خون میں کوئی چیز مل کر رینگتی محسوس ہو رہی تھی...... خوف!

"یوں کہ رات کا ابتدائی حصہ تھا نور پور روشن نظر آ رہا تھا

"لوگ تو آخر گلیوں میں ہوں گے' بھی گھروں کے دروازے بند ہوئے ہوں گے   نور پور والوں کو تو پتہ ہی ہوگا کہ میں بے چارہ پناہ گیر ہوں۔" رحمت دیکھتا رہا تھا مگر پھر بھی وسوسوں کی یلغار نہ رکی تھی۔ . "دشمن تو اندھا ہی ہوتا ہے" اس کا جی چاہ رہا تھا کہ تیز قدموں سے وہ آگے نکل جائے مگر.   چودھری ابھرا آخر چودھری کے بیٹے پوتے بھی تو گاؤں میں ہیں اور اسے اسی گاؤں میں بسر کرنی ہے۔

چودھری "کوئی مزیدار بات کرو' کوئی قصہ کہانی......." اب کے رحمت کھنکھار کر بولا۔

"رحمتے' مزیدار باتیں تو جوانی کے ساتھ بھاگ گئیں" چودھری نے آہ بھر کر کہا اور پھر یک دم بڑے بے تکے پن سے دایاں ہاتھ فضا میں لہرا کر اپنے بازو کی قوت کا اندازہ لگایا۔

"لیکن بھائی' ابھی ان ہاتھوں میں اتنی طاقت ضرور ہے کہ جھگڑے سے نکلے جوان کا گلا یوں گھونٹ دیں" چودھری کی آواز رحمت کو یک دم مصنوعی سی لگی۔ اور وہ ڈر کر رک گیا۔

"کیوں رک گئے؟...   چل رحمتے یہ تو بتا کہ جب تو نے گاڑی میں گھس کر لوٹ مار کرتے ہوؤں کو نیچے دبا کر دھونسنا شروع کیا تو انہوں نے تجھے کچھ نہ کہا؟ چودھری نے اپنا خون گرم کرنے کے لیے خون بہنے کی باتیں شروع کر دیں۔

"اتنی جان تو تھا کہ بس میں دشمنوں کے نیچے سانس روک کر . . ." رحمت بوکھلا کر یہی بات کہہ گیا   . . اور چودھری اتنی زور سے قہقہہ مار کر ہنسا کہ رحمت کا جی چاہا کہ بس چودھری کی پڑی پسلی توڑ دے۔ کم بخت ایسے برے موقعے پر جب کہ خود بھی سامنے خون بہنے کا امکان ہو مزے لے لے کر خون اور لاشوں کی باتیں کرنا چاہتا ہے۔

"میرے شیر' چل آ میں تجھے ایک چھوٹی سی بات سناؤں.. ." چودھری ایک دم سنجیدہ ہو گیا "میں اگر بادشاہ ہوتا تو اس بہادری پر"

چودھری بات ادھوری چھوڑ کر کھنکارنے لگا۔ اب اس کے قدم نسبتاً زیادہ تیز اٹھ رہے تھے ان کی اتنی بھاری تھی دل بھی بھارے تھے لیکن جانیں بھاری نہ تھیں۔ باوجود اس کے وہ اب نسبتاً زیادہ تیزی سے خطرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کہتے ہیں جب قلوپطرہ نے شکست کھائی تو سانپ سے ڈسوانے سے پہلے وہ اپنے تخت پر جا براجی کچھ یوں ہی چودھری کا حال بھی ہو رہا تھا خطرے کے منہ میں یوں بے بسی سے داخل ہونے سے پہلے وہ اپنی مضبوطی اپنی بڑائی اور رعب کے دور عروج کا ایک واقعہ یاد کرنا چاہتا تھا۔ جس میں خود اس کا اپنا بھی ایک رول تھا۔

دراصل نور پور اس کے حواس پر چڑھا چلا آ رہا تھا اور وہ پانے کو قطعی تیار نہ تھا۔

تب چودھری نے اپنے بجھتے ہوئے خون میں چنگاریاں بھونکنے کی غرض سے کہنا شروع کیا۔

''جن زمینوں پر اب تم پناہ گیر ہل چلاتے ہو پہلے وہاں کئی ہندو کاشتکار کھیتی کرتے تھے۔ کچھ مہاجنی کرتے تھے۔ ان میں کچھ بزازی کرتے' کچھ پرچون بیچتے' کوئی کوئی سنار تھا۔ ایک آدھ پساری اور کچھ سرکاری کارندے۔ یہی کوئی تیس چالیس کے لگ بھگ گھرانے تھے۔ .... مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہمارے گاؤں میں کبھی کوئی گائے یا بچے کا جھگڑا اٹھا ہو۔ پر جب ہمارے ملک کو بھائیوں نے پاکستان انگریزوں سے منوایا تو پھر دونوں طرف مارا ماری کا رستہ شروع ہوا میرے گاؤں کے کچھ منچلے افواہیں سننے اور اڑانے میں لگے تو میں نے ایک دن سارے لونڈوں کو بلا کر کہہ دیا کہ'' بچو! خبردار جو میرے جیتے جی کسی طرف نظر اٹھائی۔ پہلے سے اکیلا اتر چکا ہوں جو مجھے نہیں مانتا سامنے آ جائے ورنہ اپنا عمل آزما لے۔''

''ایسا کیوں کیا چودھری؟'' رحمت نے پہلو سے پوچھا۔

''وہ ہمارے ہی گاؤں کے تو تھے' میں نے سوچا کہ جب ان کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو دیکھا جائے گا۔'' چودھری نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ ''تو ہاں پھر ہوا یہ کہ ہندوؤں کو پتہ لگ گیا کہ چودھری مار کٹائی کے حق میں نہیں۔ خوفزدہ لوگ باہر نکلنے لگے اور صاحب یہ کہ میرا نام جپن کر پرنام کرتے۔ دکانیں کھلنے لگیں ان کی عورتیں پانی بھرنے نکلنے لگیں۔ بچے بچوں میں مل جل کر کھیلنے لگے۔

''پھر جی ایک دن یہ ہوا کہ میں اپنے چوبارے میں بیٹھا رات کے کھانے کے بعد حقہ پی رہا تھا۔ میرا جی خوب مزے مزے سے میرا جسم دبا رہا تھا۔ اس حالت میں ایک ذرا جھپکی سی آ گئی۔ اتنے میں نیچے سے پکار پڑی'' چودھری دوڑیو ہم تو لٹ گئے۔

''میں نیند میں جلدی نیچے اترا۔ دیکھا تو لنگڑا صمدو کئی نوجوانوں کی ٹولی بنائے سرداری شان سے آگے کھڑا ہے۔ جب سے صمدو کو فوج سے چھٹی ملی تھی وہ ہمیشہ سرداری کی بھوک میں مرتا تھا' مگر چودھری کے آگے کس کا چراغ جلتا! میں غصے میں گالی بکتے بکتے بچا چونکہ مجھے جلدی ہی پتہ لگ گیا کہ دیارام کی حویلی میں کچھ بڑی خاص قسم کی گڑبڑ ہے۔ ہندوؤں کے سارے گھرانے اندھیرے پڑے ہیں۔ لیکن دیارام کی حویلی میں سب سے اونچے چوبارے تک روشنیاں ناچ رہی ہیں.... میں چونکا کہ پتہ نہیں' کہیں حویلی میں باہر کے ہندو آ کر تو نہیں جمع ہو گئے اور ہم پر حملہ کرنے کی تیاری نہ کر رہے ہوں۔ اگر ایسی کوئی گڑبڑ ہوئی تو سمجھو چودھری کے منہ پر کالک لگ جائے گی اپنے گاؤں میں کسی کلمہ گو بھائی کو سوئی بھی چبھی تو مر جانے کی بات ہو گی۔

''میں یہ سوچ رہا تھا اور صمدو اپنی ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر کہہ رہا تھا کہ چودھری! ہندوؤں کے سارے گھر اندھیرے اور خاموش

پڑے ہیں ـــــــ کافر اپنا سب کچھ لے کر چل دیئے ـــــــ دوسرے گاؤں والے ہمیں کیا تو کہیں گے کہ ادھر اپنے گھر کو بھاگی سب چھوڑ چھوڑ کر آ رہے ہیں اور ادھر

"اس "ادھر سے ادھر" کے الٹ پھیر نے مجھے چکرا دیا۔ میں لوگوں کے ساتھ ہو لیا' جن کی تعداد لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ راستے میں تارا کشن بزاز کا مکان پڑا۔ میں نے دروازے پر لات ماردی۔ مگر وہ پہلے ہی کھلا پڑا تھا۔ اس لیے میں اپنے ہی زور میں اندر تک پہنچ گیا ... سب ساز و سامان جوں کا توں تھا مگر کوئی جاندار اندر نہ تھا۔ راستے میں جتنے ہندوؤں کے گھر ملے' سب کا یہی حال تھا۔ لوگوں نے لوٹنا شروع کر دیا۔ میں اس حالت میں انہیں منع نہ کر سکا۔ ہندوؤں کے یوں چپ چپاتے دم کر دے کر نکل جانے کا مطلب میرے ذہن پر چھچڑ بن گیا۔

"جب میں حویلی کے دروازے پر پہنچا تو لوگوں کی ایک بہت تھوڑی تعداد میرے ساتھ تھی میں نے کسی کے ہاتھ سے تلوار چھین کر حویلی کے بڑے دروازے پر ماری۔ چمکتے ہوئے پیتل کے پترے بج اٹھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

"دیا رام دروازہ کھول اندر کیا تیاری کر رہے ہو بے ایمان۔ کافر ... " میں چنگھاڑا اور حویلی کے اندر روشنی کے بھنور گھٹتے بڑھتے رہے میری ناک میں گھی جلنے کی بو آ رہی تھی۔

"ہم نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ ابھی دروازہ نہیں ٹوٹا تھا کہ دیا رام دروازہ کھول کر ہانپتا ہانپتا سامنے آ گیا وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا "تم ہو چودھری بابا ہم سمجھے دو آ گئے۔"

میں نے چیخ کر پوچھا "کون ہو کے پٹھے آ گئے ہیں میں پوچھتا ہوں سب کہاں بھاگ گئے اندر کیا تیاری ہو رہی ہے۔"

یہ سن کر دیا رام جس نے اپنا پکوڑی جیسا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ "تم آ کر دیکھ لو چودھری ...... پر اکیلے تم ہمارے باپ کے برابر ہو ...... " یہ کہہ کر اس نے بے تابی سے مجھے اندر کھینچا۔ میں نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر رحم آ رہا تھا۔

"چودھری اکیلا اندر نہیں جائے گا" کئی لوگ میرے پیچھے چیخے "تم بھی ہم سے ڈرتے ہو چودھری؟" دیا رام نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے للکارا "تم جانتے ہو رحمت میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں تو تین خونخوار چیتے سے لڑ چکا ہوں اور دو سو روپے سرکاری انعام.......

چودھری دیکھ رہا تھا کہ اب وہ نور پور کی آبادی کے پہلے مکان کے سامنے سے جلد ہی گزرنے والے ہیں۔ نور پور کی

روشنیاں کتنی تیز روشنی دیتی تھیں کہ چودھری نے آج سے پہلے اس بات پر کبھی غور نہ کیا تھا۔

"پھر کیا ہوا چودھری؟" رحمت نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں سب کو باہر ٹھہرا کر دیا رام کے ساتھ اندر چلا گیا"

"اندر کیا ہو رہا تھا؟" رحمت نے پھر بولنا ضروری سمجھا۔

"یار بتاتا تو ہوں کہ اندر بڑی گرم ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ میں اندر پہنچ کر دیپ چند حواس کھو بیٹھا۔ صحن میں لکڑیوں اور اپلوں کی ایک چتا جل رہی تھی.... ۔ ہر طرف لکڑیاں بکھری تھیں جنہیں لوگ اٹھا اٹھا کر چتا پر پھینک رہے تھے۔ ۔ ... وہاں سارے ہندو جمع تھے ان کے چہرے آگ کی روشنی میں بھی زرد نظر آ رہے تھے.... ۔ چتا میں بہت سی چیزیں چٹخ چٹخ کر جل رہی تھیں.... ... اور وہاں مجھے پانچ عورتیں اور کچھ چھوٹے چھوٹے بچے نظر آئے۔ کچھ اپنے باپوں کے کندھوں سے لگے سو رہے تھے۔ اور کچھ نسبتاً بڑے دیا رام کی سوکھی سڑی بڑھیا ماں کے پاس پتھر کے بت سے بنے بیٹھے تھے عورتیں ایسی ہی سنوری تھیں جیسے بیاہ میں آئی ہوں ۔ ۔ وہ سب مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو بت سے بن گئے۔

"میری سمجھ میں کچھ نہ آیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ اتنے میں دیا رام میرے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا

"چودھری تم نے ہماری حفاظت کی مگر ہمیں معلوم ہے کہ آج رات نور پور والے ہم پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ بالکل پکی بات ہے۔ پھر چودھری جی ہماری خاطر اپنے مسلمان بھائیوں سے تو نہ لڑو گے ہم مرنے کو تیار ہیں۔ پر عزت کے ساتھ۔ نہ ہم تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ بنا، کچھ سنوار رہے ہیں ۔" اتنا کہہ کر دیا رام نے میری طرف دیکھا' نور پور والوں کا نام سن کر میرا خون کھول اٹھا ... میں سمجھ گیا کہ میری ضد میں میرے چچا زاد بھائی اپنا کام کر رہے ہیں مگر میں اس وقت کچھ نہ سمجھ سکا کیا کروں۔ مجھے چپ حیران کھڑا دیکھ کر دیا رام نے پنڈت کو ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے زور سے کہا "جلدی کرو جنجھٹ ختم ہو ...." اور دوسرے لمحے لوگ لپک کر عورتوں کی طرف بڑھے۔ ایک عورت دیوانوں کی طرح اپنے آپ کو نوچنے لگی۔ دوسری زمین پر لیٹ کر سر پھوڑنے لگی۔ ... اور دو عورتوں کو چند لوگوں نے مل کر اوپر اٹھایا۔ ۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں کے چہرے بڑے بھیانک ہو رہے تھے یہ عورتیں میرے ہی گاؤں کی تھیں میں نے انہیں سینکڑوں دفعہ گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہوگا مگر انہیں پہچان نہ سکا۔ اور دوسرے لمحے وہ دونوں عورتیں اکٹھی چتا پر اچھال دی گئیں۔ اتنے میں تیسری دیوانی عورت پکڑی آئی۔ سر پھوڑ کر بے ہوش ہو جانے والی بھی چپ چاپ لوگوں کے ہاتھوں پر پڑی تھی۔ چیختی ہوئی دیوانی عورت کو بھی دھکا دے چتا پر اچھالا گیا مگر وہ اتنی دور اور

نفرت سے جھٹکی گئی تھی کہ اس کا جسم چتا کے اس پار پنڈت فرش پر گر کر بچ گیا تھا اس دوران میں بے ہوش عورت ہاتھوں پر سے غائب تھی۔ دیوانی عورت کی چیخ پکار سے دہل کر سوئے ہوئے بچے بھی باپوں کے کندھوں سے سر اٹھا کر رونے لگے ..... اب ایک عورت بچی تھی، جب اسے لوگوں نے پکڑا تو وہ سب کے ہاتھوں جھٹک کر خود کھڑی ہو گئی میں اسے فوراً پہچان گیا وہ موہن چند ستا کی دوسری بیوی تھی اس کا چہرہ ویسا تھا جیسا کہ ہمیشہ نظر آتا تھا۔ بس جیسے اسے ذرا غصہ آ گیا ہو۔ چہرے پر بس ایک نئی جھلک تھی اس کی گود میں اس کا چار پانچ مہینے کا بیٹا تھا۔ پنڈت چیخا۔

"جلد کر چیز نہیں تو وہ پہنچ جائیں گے" یہ کہہ پنڈت نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ تو وہ پھر تنک کر ایک طرف ہو گئی اور چیخ کر بولی۔

"خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا" اس کا بچہ بے چین ہو کر رونے لگا۔

"وہ دھیمے دھیمے اطمینان سے قدم اٹھاتی اسی مغرورانہ انداز سے ہم تک آئی اور صاف آواز میں پوچھا "تو بچ گئے کہ نہیں؟"

میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ وقت کیوں پوچھ رہی ہے . یہ بات تو سبھی کو معلوم تھی"

"تو بج گئے.. ..... جلدی کر بہن۔" دیا رام چیخا۔

"کیوں میں اپنے ننھے کو دودھ کسی وقت پر نہ دوں؟" وہ تیکھی آواز میں کہتی سب کی طرف سے پیٹھ پھیر کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بچہ چپ ہو گیا۔ وہ دودھ پی رہا تھا۔

"یہ اس وقت دودھ پیتا بچہ ہمارے گاؤں کا پہلا بچہ تھا جو قصبے کے ہسپتال میں پیدا ہوا تھا۔ سنا تھا کہ میموں نے موہن چند کی عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالا تھا مرتے مرتے بچی تھی اس کے باوجود جب وہ ایک مہینہ ہسپتال رہ کر گھر واپس آئی تو معلوم ہوا کہ وہ بچے کو اتنا پیار کرتی ہے کہ کوئی حد نہیں۔ یہ بالکل میموں کے طریقے سیکھ کر آئی ہے وہ بچے کا منہ کبھی نہیں چومتی بلکہ پاؤں چومتی ہے۔ دودھ بے سسر کے رہانے کی گھڑی دیکھ کر وقت پر دیتی ہے غرض ایسی ایسی باتیں کہ ہمارے گاؤں کی ماؤں نے کبھی سنی تک نہ تھیں اور اس وقت چتا کے قریب بیٹھ کر بھی وہ وقت پر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" رحمت نے تھوک سے اپنا کنٹھ کا تر کرنے کی کوشش کی۔

پھر موہن چند نے سسکتے ہوئے اس کی بانہہ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ پر وہ خود اٹھ کھڑی ہوئی اور چتا کی طرف چلی۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور وہ اب گرمی سے تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔ موہن چند بچے کو لینے کے لیے جھپٹ کر اس کے سامنے آ گیا لیکن وہ تیزی سے راستہ بدل گئی اور

چتا کے قریب پہنچ کر شعلوں میں گھل مل گئی۔ بچے کی یہ ہمت دیکھ کر بہت سے لوگ دوڑے لیکن آگ نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔

"چتا میں بیٹیاں جلتی ہیں، بیٹے نہیں ۔ اس وجہ سے وہ سب چیخ چیخ کر رونے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس رات حملہ تو نہیں ہوا البتہ رات کے اندھیرے ہی میں خدا جانے کیسے چند فوجی وہاں پہنچ گئیں۔ اور پھر وہ سب ان میں گھس گھس کر ادھر کو چل دیے۔

چودھری ایک دم چپ ہو گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کا خون رگوں میں لاوے کی طرح دوڑ رہا ہے۔ اس نے اندھیری رات میں پلٹ کر پیچھے دیکھا وہ شان سے مرنا چاہتا تھا۔

ایک مریل سا کتا ان کے پیچھے چل رہا تھا رکتے ہوئے مسافر کو دیکھ کر اس نے ایک نہایت کمزوری "چخ" کی اور پھر بیزاری سے پلٹ کر چل دیا۔

باتوں باتوں میں وہ کتنی تیزی سے نور پور کی آبادی سے باہر نکل چکے تھے۔

دوران ان کے اپنے گاؤں کے پہلے کنوئیں پر جلتے چراغ کی لو کتنی صاف لرزتی نظر آ رہی تھی۔

◆◆◆

محبت اور

باہر خوب زور وشور سے آندھی چل رہی تھی۔

لیمپ کی مدھم سی روشنی میں کمرہ خوابناک معلوم ہو رہا تھا۔ ماں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی بند دروازے کی طرف بڑھی لیکن اچانک پلٹ کر لیمپ کی بتی اونچی کر دی۔

"میری بچی! میرا تو کلیجہ پھٹا جا رہا ہے... تم اس طرح نہ سوچو میں پھر کہتی ہوں ہائے مجھ جنم جلی کے منہ سے ایسی باتیں کیوں نکل گئیں" ماں نے گڑگڑا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک کے ساتھ ایک بار پھر آنسو امڈ آئے۔ وہ شام سے ہی اپنی بیٹی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک اس نے دکھوں کی لمبی سی داستان چھیڑ دی تھی۔ اور اب آٹھ بجنے والے تھے۔ اس داستان کا عروج آٹھ بجنے ہونے والا تھا۔ کیونکہ وہ ٹھیک اسی وقت اس کی بچی سے ملنے آنے والا تھا۔

لڑکی ابھی تک برف کی سل کی طرح منجمد بیٹھی تھی۔ مگر جیسے قطرہ قطرہ کر کے پگھل رہی تھی۔ لیمپ کی سونی روشنی میں اسے اپنی ماں کا چہرہ خوبصورت اور جوان لگ رہا تھا۔ دہانے کے گرد گہری ہوتی ہوئی قوسیں اور کنپٹیوں پر جھریوں کے مہین جال غائب سے تھے۔ گلشتی رنگ کے پپوٹوں تلے کپکپاتے ہوئے آنسو اور خشک ہونٹ۔ اسے اپنی ماں ایک خوبصورت نغمے کی موت پر لکھے ہوئے مرثیے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

"میری بچی! میں کہتی ہوں۔ میں زندہ ہی کیوں رہی۔ میں پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی جو آج اپنی اولاد کی خوشیوں پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھی ہوں" ماں بین کرتے ہوئے آواز سے رونے لگی۔ اور پھر قریب کی پولیس چوکی پر آٹھ کا گجر سن کر پاگلوں کی طرح بھاگ کر کمرے سے نکل گئی۔

"اف پتہ نہیں مجھے آپ کتنا چھوٹا سمجھتی ہیں۔ میں اندھی ہو گئی تھی۔ آپ نے مجھے آنکھیں دیں۔ میں آپ پر سے قربان امی جیتے تو سہی۔" لڑکی کی مضبوط آواز تیز طوفانی آندھی میں ذرہ ذرہ ہو کر بکھر ہو گئی۔

لیکن ماں واپس نہ آئی لڑکی نے جیسے ایک دم تھک کر آنکھیں موند لیں۔ آندھی بدستور غرا رہی تھی۔ بند کھڑکیوں پر تھپے

ننھے کنکر بج رہے تھے اور کھلا ہوا دروازہ کبھی دھڑ سے بند ہو جاتا اور کبھی اچانک کھل کر خاک دھول اور سوکھے پتوں کا پاک ریلا اندر چلا آتا۔

لڑکی میں چلنے تک کی سکت نہیں تھی، لیکن اسے اپنا رواں رواں حساس اور بیدار معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اپنے تمتماتے ہوئے چہرے پر خاک کے ذرات تک کا لمس محسوس ہو رہا تھا، ٹھنڈے سوندھے، چبھتے ہوئے ذرات اس کے جواں چہرے کو وحشیانہ انداز سے چھوتے اور پھر وہاں سے ہو کر جلد پر گر جاتے۔

پتہ نہیں کیسے تصورات کی کڑیاں جھنجھنا کر ٹوٹتی ہی چلی گئیں، تمتمایا ہوا چہرہ نازک سی موم بتی بن گیا اور خاک بے وقعت ذرے جیسے جاگتے پتنگے!

آندھی کا جوش و خروش بڑھتا ہی گیا اور بجلی تھی کہ چمکی پڑتی۔

"اب شاید ہی وہ اس گھر وقت گھر سے نکل سکے، آندھی بھی تو غضب کی ہے۔" لڑکی نے الجھنوں کی طرح بے دلی سے سوچا، اور پھر خود کو آندھی کے طلسم میں کھو دیا۔ اسے، آندھیوں میں چلتی ہوئی تیز ہواؤں سے عشق بھی تو تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے گونجتے گرجتے، بولتے گاتے موسم میں بہک کر سوچا کرتی "بس ایسے ہی سہانے سے میری زندگی میں کوئی بڑی خوبصورت، کوئی بڑی غیر معمولی بات ہو گی!

اور اس وقت ایک غیر معمولی بات ہو گئی۔ تیزی سے بند ہوتے ہوئے دروازے کے پٹ بیچ ہی میں ٹھہر گئے اور وہ دور کرتے ہوئے پٹوں کے درمیان تنا ہوا کھڑا تھا گلابی سا چہرہ، گرد دھول سے اٹے ہوئے بال۔

"آندھی، طوفان، جنگل، سمندر، موت اور زندگی۔ میں اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھکراتا تیری آواز کی بازگشت بن کر تجھ تک پہنچوں گا۔ ایک بھولی بسری نظم کے چند مصرعے لڑکی کی یادداشت سے ابھر کر کمرے کی فضا پر چھا گئے۔

لڑکی نے جلدی سے اپنے چہرے پر نثار ہو کر مرنے والے خاک کے ذروں کو رگڑ کر آنچل میں دفن کر لیا۔ لیکن فضول ہی تو؟ ذرا دیر پہلے اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے چہرے پر لڑکے کی نظر بھی نہ پڑنے دے گی۔ لڑکی کے ہاتھوں سے ریت سی آ گئی۔

لڑکے نے اپنی پیٹھ کواڑوں سے لگائے لگائے ہاتھ اونچا کر کے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ اور اس کا چوڑا تندرست سینہ اس زاویے سے اور بھی جاذب معلوم ہونے لگا۔

لڑکی کے سینے پر جیسے کسی نے انگلی رکھ دی۔ وہ تیزی سے پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

آندھی پھر بپھر کر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

کمرے میں خاک کے ذرے ناچ رہے تھے' لیمپ کی بتی بس یوں ہی لرز رہی تھی۔

"میں آ گیا" لڑکے نے بے ہودہ دردوں سے بھرا ہوا مضبوط ہاتھ لڑکی کے کندھے پر رکھ دیا۔

بھاری آواز اتنی نرم' اتنی گداز' اور اتنی دھیمی بھی ہو سکتی ہے؟ لڑکی سے پہلے کسی اور نے پوچھا اور پھر اس نے خود سے بھی تو پوچھا کہ کیا تو یہ ہاتھ کبھی جھٹک سکتی ہے؟

"چپ رہو۔ چپ رہو بھئی۔" لڑکی نے خود کو ڈپٹ دیا۔

"ارے کیا ہوا بھئی۔" لڑکا گھبرا کر ہکلانے لگا۔

لڑکی گھوم کر تیزی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں ذرا دیر کو غیر متوقع سی خاموشی چھا گئی۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی' میں تم سے کچی محبت نہیں محسوس کرتی' اس لیے تم مجھ سے کوئی امید مت رکھو سمجھے!" لڑکی نے پورے سکون سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں...... میں...... " لڑکے کی زبان جیسے لڑکھڑا گئی۔ وہ کانپ رہا تھا۔

"میں کہہ چکی اب تم جاؤ۔" لڑکی نے مضبوط آواز میں پھر کہا' اور منہ پھیر کر لیمپ کی طرف دیکھنے لگی' جس کی بتی کسی خرابی کے باعث موہوم طریقے پر لرز رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے' میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' تمہیں میرے خلاف کسی نے بھڑکایا ہے؟ بتاؤ آخر بات کیا ہے۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم سے چھٹ کر میں اپنی جان دے دوں گا' اگر ایسی ہی بات ہے تو میں کب تک زندہ نہیں رہ سکتا۔" لڑکے نے بے قرار ہو کر گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنا سر لڑکی کی گود میں ڈال دیا۔ اچانک وہ بچوں کی طرح سسکنے لگا۔

"میں کہہ چکی بھئی۔" وہ بیزاری سے اٹھ کر دیوار کی دھندلی سفیدی میں کوئی نہایت اہم تحریر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور یہ انہماک اس وقت تک رہا جب تک کہ آندھی کے ایک تیکھے ہوئے جھونکے نے اسے دیوار کی طرف ایک پتنگ سا نہ دے دیا۔

کھلے دروازے کے پٹ بھی دھماکے سے کھل جاتے اور کبھی پراسرار طریقے پر بند ہو جاتے۔

"وہ چلا گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا؟" لڑکی ہونٹوں کے زاویے بگاڑ کر منمنائی۔ تھوڑی سست گئی' جسم کپکپایا اور وہ ٹھنڈی ٹھنڈی مٹھیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگی' گرم گرم آنسوؤں سے انگلیاں تر ہو گئیں۔ تب وہ ایک ہلکی سی آواز میں رونے لگی۔

تیز ہواؤں کے ساتھ پانی کی موٹی موٹی بوندیں دروازے کے اندر پختہ فرش پر ناچ رہی تھیں۔ لڑکی کا کلیجہ کٹا جا رہا تھا اور وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔ ایسے خوبصورت پرشور دھنک موسم میں یہ کیوں ہوتا تھا؟؟ اس خیال سے اس کے صبر وضبط کا بند پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

ایک ایسی ہی پرشور موسم اور سرگمیں شام کو لڑکی نے لڑکے کی طرف پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ لڑکا بڑی بالکنی کی جالی پر جھکا ہوا تپیلی کی لٹیا سے چلوؤں کی پانی کی کلیاں کیے جا رہا تھا اور رو رو کر منہ دھوئے جا رہا تھا۔ اور تھی کو بخ گرج سے کھنکار اور تھوک رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی پر جھومتے ہوئے بوندوں کے سہرے میں سے جھانک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیسا احمق بور آدمی ہے۔ بھلا ایسے پیارے ٹھنڈے سے میں بالکنی میں کھڑے ہو کر بارش کا تماشہ دیکھنے کے بجائے کوئی یہ حرکت کرتا ہے۔" اور وہ اپنے ننھے بھائی کو گود میں اٹھا کر ہنسی تو ننھا بھی تالیاں بجا بجا کر لڑکے کی نقل کرنے لگا۔

لڑکے نے اٹھا ہوا چلو گرا دیا اور دو ہنستے ہوئے چہرے دیکھ کر بوکھلایا ہوا اندر بھاگ گیا۔ لڑکی کو اس کے بھاگ جانے سے موسم کچھ سونا سا لگنے لگا۔ مگر نہیں اس پہلے سے واقعے کے بعد مطمئن اور آسودہ حال بھورا نوجوان اس سے بھاگ کر نہ جا سکا بھلا ایسے گرم ملک میں ایسے بھیگے بھیگے خنک موسم میں ملی ہوئی نظروں کو دل کے پار ہونے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ لڑکا شرمیلا اور کنوارا تھا اور بڑے اونچے افسر قسم کے چچا کی وجہ سے ایک، بڑی ملازمت کا امیدوار۔ لڑکی تو غریب تھی اور گھر کا ماحول اداس اداس۔ اس نے مار ماری میں بی اے کرنا چاہا مگر فیل ہو گئی اور اب ایک عرصے سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اور اسکول کو ترقی کرتے دیکھ کر ہمیشہ اس وڑسے کا پتی رہتی کہ دیکھوں کب نکالی جاؤں۔ .. لڑکی کے ابا نے ننھے میاں کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی ماں کو طلاق دے کر ایک موٹی سی بیوہ عورت سے شادی رچا لی تھی اور اب ایک بہت معمولی سی رقم اپنے بچوں کے گزارے کے لیے ہر ماہ بھجوا دیتے۔ جسے لڑکی کے چھوٹے بیکار ماموں اپنے پاس رکھتے اور ہر اتوار کو سمجھانے آ کر سب کو فضول خرچی کے خلاف لیکچر دیا کرتے اور ساری مصیبت کا ذمہ دار بچوں کی بدقسمتی کو قرار دیتے۔ لڑکی کے بھائی بہن جب اسکول چلے جاتے اور جب وہ اپنے محلے کے بڑے سے پرائیویٹ اسکول پہنچنے کے لیے برقعے کی اوڑھیا کرنے لگتی۔ تو وہ دیکھتی کہ ماں باورچی خانے سے اٹھ کر تخت پر رکھی ہوئی سلائی کی مشین پر جا بیٹھی۔ اور دن بھر شہر کے درزیوں کے توسط سے آئے ہوئے کپڑے سیتی رہتی۔ اور رو رو کر ہونٹ بھینچ کر زمین پر تھوک دیتی اور شام کو جب وہ اسکول سے بھاگی بھاگی کر کے گھر آتی تو ماں سلائی کی مشین سے اٹھ کر باورچی خانے میں جتی جاتی۔ یہ سارے حالات پیاسے بہت سے دکھ لڑکی کو جیسے جنم جنم کے بے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رکھتے اور اسے ہر وقت اپنے گلے پر ایک گرفت سی اور

آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوتی رہتی

مگر جب یکساں سے عام دنوں سے، الگ کسی دن سورج نہ دکھتا اور رات' ستاروں کا غبار نہ پھیلتا۔ تیز تیز ہوائیں چلتیں یا آسمان سے زمین تک نمی سی نمی پھیل جاتی بوندیاں گاتیں' کواڑ بجتے اور دن سرمگیں ہوتا یا رات گھور اندھیری' گونج گرج ہوتی تو وہ جیسے، پنجے گلے کی گرفت کو جھٹک کر ایک لمبی سانس لے سکتی۔ اس کی مٹھیاں کسی جاتیں اور جلتے ہوئے چہرے پر تیز اور ٹھنڈی پھوار اتنی اچھی لگتی کہ بس۔ ... وہ خوابوں کی جھیلوں پر کنوں کی طرح کھل کر انگڑائیاں لیتی۔ ... وہ پہاڑوں پر ہرنیوں کی طرح کودتی ان کی چوٹیوں تک پہنچ جاتی جہاں بارہ، وہ برف بھی رہتی۔ وہ گھنے جنگلوں میں جا کر گم ہو جاتی جہاں اونچے اونچے درختوں کی جھکی جھکی شاخوں تلے فصلک کر کچھ مزے کی باتیں سوچنے لگتی .... وہ دارجیلنگ پہنچ جاتی جہاں چائے کے ڈھلوان باغوں کو دور دور آسامی لڑکیوں کو اور بازاروں میں پڑے ہوئے اناسوں کے ڈھیروں کو بادل اترا اترا کر چھوتے اور راہیوں کے ساتھ ساتھ بے تکلف دوستوں کی طرح چلتے .... اور وہ جغرافیہ کی لکائی بجھائی سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کی سب سے پرانی آرزو کے مطابق چراپونجی بھی پہنچ جاتی۔ جہاں کی خاک میں بادل دنیا کے سارے بادلوں سے زیادہ پانی ٹپکاتے رہتے۔ جہاں یہ بادل بانس کی جھونپڑیوں میں گھس کر دندنا دیتے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا۔ اور پھر کوئی مضبوط سا ہاتھ بڑھ کر اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھول دیتا۔ اور وہ خواب ہی خواب میں یوں محسوس کرتی جیسے اس کا وجود پگھل رہا ہے، اور بہہ رہا ہے۔

لیکن آج تو جیسے لڑکی کا سارا وجود ہمیشہ کے لیے سمٹ سکڑ کر میدانوں میں پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی تنہا چٹان میں تبدیل ہو گیا تھا' اور اب وہ اس حادثے پر سسک سسک کر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

ور اس کا خوابوں بھرا موسم پنے شباب پر تھا۔

آج شام ہی کی تو بات ہے کہ لڑکی کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ لڑکے نے کتاب میں ایک پرچہ رکھ کر بھجوایا۔ اس میں لکھا تھا۔

"اب ہمیں ہمیشہ اکٹھے رہنے کے متعلق سوچنا ہے آج پی سی ایس کا نتیجہ آ گیا ہے میں کامیاب ہوں۔ میں آج آٹھ بجے تم سے اور تمہاری امی سے ملنے آؤں گا۔"

لڑکی اسکول سے آ کر غسلخانے میں گنگنا کر نہا رہی تھی۔ چھوٹے بھائی نے گھر میں آ کر آپا آپا کا شور مچا دیا۔ اور جب " پا نظر نہ آئی تو لڑکے کی دی ہوئی کتاب ایک طرف ڈال کر ماں کی مشین میں انگلی بند کرنے لگا ۔ ور جب کافی دیر بعد لڑکی غسلخانے سے سیپ کی طرح نکھری ستھری بالوں سے پانی ٹپکاتی نکلی تو ماں نے سلائی کی مشین سے اٹھ کر کتاب اور پرچہ الگ الگ اسے پکڑا

دیا۔ لڑکی پرچہ پڑھتی رہی اور ریشم جیسے بھورے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا پانی نیلی تحریر کو کاغذ پر پھیلاتا رہا۔ ماں سکون سے سلائی کرتی رہی اور بیٹی اس ننھی سی تحریر کو پڑھ ہی نہ سکی تھی۔

ورق الٹنے کی طرح تیزی سے گزرتے ہوئے آسمان پر رینگتے ہوئے سفید سفید بادل کبھی ڈوبتے سورج سے دست و گریبان ہو جاتے کبھی شعاعوں کے دھکے کھا کر افق سے بھی پرے لال لال ہو کر دھنس جاتے۔ چھوٹی سی انگنائی کی دیوار پھلانگتے ہوئے کوے کے پروں پر کبھی سونے کی چمک بکھر جاتی اور کبھی کاجل سے بھی گہری سیاہی۔

اور جب لڑکی اپنے کمرے میں پہنچ کر پلنگ پر چپ چاپ پاؤں لٹکائے بیٹھی تو ماں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ لمبی لمبی انگلیاں گدگدی ہتھیلی میں پیوست ہو گئیں۔ لڑکی کا جی چاہا کہ رخصت ہوتی ہوئی دلہنوں کی طرح وہ بھی ماں کے پہلو میں چھپ کر ہولے ہولے رونے لگے۔ ماں ناراض بھی تو نظر نہ آتی تھی۔ آخر اس نے تنی ادھی ماں کو یہ بات خود ہی کیوں نہ بتا دی؟

ماں نے لڑکی کے قریب بیٹھ کر اسے کندھے سے لگا لیا اور لڑکی سر رکھ کر رونے لگی تھی۔

"دوسرے محلے والے گھر کا لڑکا ہے نا؟" ماں نے پوچھا تھا۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے بہت پیارا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ تم رو رہی ہو اس میں رونے کی کیا بات ہے ساری لڑکیاں ایک دن ماں کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں میں تو بہت خوش ہوں بیٹی تو پرایا مال ہے۔" اتنا کہہ کر ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہونٹ بھینچ کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے آنسو پونچھنے لگی جن کی پوریں سوئی کی نوک نے ادھیڑ کر رکھ دی تھیں۔

"امی اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"میں تو یوں ہی رو رہی ہوں آنکھوں کو آنسو بہانے کی عادت جو ہے میں تو بہت خوش ہوں۔" اتنا کہہ کر ماں اور بھی پھوٹ پڑی۔ اس کا چھریرا جسم سسکیوں سے لرز رہ گیا۔ "سب مرد تمہارے ابا جیسے تھوڑی ہوتے ہوں گے۔ وہ لڑکا تو بہت معصوم معلوم ہوتا ہے وہ تم سے محبت کرے گا تمہارا دل نہیں دکھنے دے گا = میں تو یہ سوچ کر پھولے نہیں سماتی۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا تمہیں ہر قسم کا سکھ دے گا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔" ماں نے رک رک کر یہ سب کہا اور پھر ہلکی ہلکی آواز سے رونے لگی۔

"امی جب آپ خوش ہیں تو پھر رو کیوں رہی ہیں۔" لڑکی نے صد درجہ پریشان ہو کر ماں سے پوچھا تھا اور ماں کے "کچھ نہیں" پر مصر رہنے کے باوجود وہ ماں سے لپٹی رہی اور اس کے رونے کی وجہ پوچھتی رہی۔

اور آخر بڑی دیر بعد ماں نے اندھیرے ہوتے ہوئے کمرے میں ایک حنوط شدہ لاش کی طرح بیٹھ کر اپنے دکھوں کی لمبی تفسیر

داستان چھیڑ دی۔ دھند لکے میں ڈوبے ہوئے کمرے میں اس کی کانپتی ہوئی آواز بڑی پرسوز اور گہری معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی نو عمری بیٹی کو بتایا کہ وہ پیدا ہی بدنصیب ہوئی تھی۔ اس کی ماں اسے جنم دیتے مر گئی اور اس نے باپ کی سختیوں اور سوتیلی ماں کی نفرتوں کے سائے میں بارہ تیرہ سال پورے کئے۔ ابھی اسے مرد کے متعلق سوچنا بھی نہ آیا کہ وہ ایک اٹھائیس سال کے مرد سے بیاہ دی گئی وہ اٹھائیس سال کا مرد جس نے نئی عمر عورت کو صرف کنکھیوں سے دیکھا تھا۔ اس کا شوہر تنہائیوں میں ایک خود غرض وحشی کے روپ میں نظر آتا۔ ساس نند دے کم جہیز لانے کے طعنے اٹھتے بیٹھتے دیتیں۔ اور یہ جلو تیں یہ خلوتیں آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ پر ایک گنگھورے کی طرح اپنے بے شمار پاؤں ڈبوتی ہی چلی گئیں اور بچوں پر بچے ہوتے چلے گئے۔ ماں نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے درمیان یہ ساری باتیں بڑی دردناک تفصیل سے بتائیں۔ اور پھر مجرموں کی طرح آنکھیں جھکا کر بیٹی سے ایک اعتراف کیا! "مجھے یہ نفرتوں اور حقارتوں کی پیداوار گندے کیڑوں کی طرح نالیوں میں بہا دینا چاہیے تھی۔ مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ میں نے ہر طرف سے محروم ہو کر اپنے بچوں سے محبت کی اور صرف ان کی خاطر سب کچھ سہا لیکن۔ تیری عاجزی اتنے صبر و شکر کے باوجود تمہارا باپ مجھ سے دامن چھڑا کر بھاگ گیا"

خاموش بیٹھے بیٹھے لڑکی کا جی چاہا کہ وہ اپنے باپ کی گردن مروڑ ڈالے اسے اپنا محبوب بھی اپنے باپ کی صورت میں نظر آنے لگا تھا........ اور ماں بولتی گئی تھی۔

"لیکن اتنی طویل اذیت ناک زندگی گزارنے کے بعد مجھے تمہارے باپ کی یادگار میں پانچ بچے اور سو روپے ماہوار کی رقم ملتی ہے سو روپے۔۔۔ ماں نے اپنی ادھوری ہوئی انگلیاں اپنے رخساروں پر پھیریں اور آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "اب جتنی رقم ملے گی اس میں تمہارے ماموں سنبھالیں گے تب ہی پیسوں سے پانچ پیٹوں کی آگ بجھے گی اور اسی سے تمہارے تینوں بھائیوں اور تمہاری بہن کے مستقبل کے سارے گھروندوں کے لیے اینٹ گارا مہیا کیا جائے گا ....." یہ ساری باتیں ماں نے اسی طرح بتائی تھیں۔ جیسے کوئی قریب المرگ اپنی اولاد کو اپنے پوشیدہ خزانوں کا پتہ دے رہا ہو اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے پھٹی پھٹی آنکھوں' خشک ہونٹوں اور ادھوری ہوئی انگلیوں سمیت وہ اندھیرے ہوتے ہوئے کمرے میں ایک آسیب نظر آ رہی تھی۔

اور اس وقت لڑکی نے پلنگ سے اٹھ کر لیمپ جلاتے ہوئے بڑے عزم سے کہا تھا "مجھے معاف کر دو امی میں سب دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتی تھی میں اب عمر بھر شادی نہیں کروں گی' مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی .. "مرد ذات سے نفرت ہو گئی "

ماں یک دم گھبرا کر چیخنے لگی' "نہیں نہیں' پاگل نہ بنو۔"

لیکن وہ کہتی رہی۔ "میں اپنی اتی بے بس اتی دکھی امی سے جدا ہو کر کہیں نہیں جا سکتی' میں اپنے بھائیوں اور بہن کے لیے سب کچھ کروں گی...... میں اب تک جھوٹے خواب دیکھتی رہی' میں ایسے خوابوں پر تھوک دوں گی۔"

اور ابھی ذرا دیر پہلے جب ریلے خوابوں سے لدی ہوئی زنانے وار ہوائیں اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔ تو اس نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ خوابناک حقیقت پر سچ مچ تھوک دیا۔ ایک ٹھوکر ماردی' اور وہ بھولا سا لڑکا دل شکستہ ہو کر ایک دم چلا گیا' گونجتے ہوئے اندھیرے کے سارے خواب دردناک چیخیں مارتے اس سے دور بھاگ گئے اور اس کی محبت جو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ ایک بھیانک خواب بن گئی اور اب وہ اس سچی خور بچی کی طرح رو رہی تھی جس نے اپنی گڑیا کو ادھیڑ کر اس کی روئی بکھیر دی ہو۔

"پانی اسی دھڑاکے سے برس رہا ہے اور اب شاید وہ میری زندگی میں کبھی واپس نہ آئے گا۔" لڑکی نے اپنی بھیگی ہوئی مٹھیاں گالوں سے لگا کر کمرے سے باہر اندھیرے میں گھورتے ہوئے بلک کر سوچا۔ اور دوڑ کر بے تابی سے پلنگ پر گر پڑی جیسے یوں پڑ کر سوچنے کی ساری قوتیں معطل ہی تو ہو جائیں گی۔ میلے تکیے میں اس نے اپنا چہرہ ڈبو دیا اور گھٹنے چھاتی سے لگا لیے۔

"چھما چھم برستا پانی آنگن کے پختہ فرش پر کیسے چٹا چٹ بج رہا ہے' ساتھ کے کمرے میں تینوں بھائی بے فکری سے بہن کے ساتھ شور مچا رہے ہیں۔ چھوٹا بھائی مصر ہے کہ سب کو مل کر کوئی اچھا سا گیت گانا چاہیے۔ ماموں شاید ابھی تک گھر نہیں پہنچے' ورنہ وہ بچوں کو اس طرح خوش ہونے پر ضرور ڈانٹتے...... مشین کی آواز نہیں آ رہی۔ امی شاید باورچی خانے میں چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی کچھ سوچ رہی ہوں گی۔ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہیں۔ کہیں وہ رو نہ رہی ہوں...... میں انہیں رونے نہیں دوں گی......" خیالات دبے قدموں اس کے دماغ میں گھسنے لگے۔

"اور میں جو رو رہی ہوں۔" وہ خود اپنی سوچ کے بیچ میں اکڑ کر کھڑی ہو گئی! "تو رو' منع کون کرتا ہے۔" حالات نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس سے کہا۔

"اور جو وہ مر گیا تو پھر۔" لڑکی نے بسور کر سوچا۔ "وہ میرا آخری جواب سن کر چپ چاپ چلا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ میرے بغیر مر جائے گا' اسے مجھ سے محبت تھی' وہ مایوس ہو کر مر جائے گا۔ سب مرد ایسے تھوڑی ہو سکتے ہیں۔"

لڑکی کا کلیجہ جیسے پھٹنے لگا اور وہ تکیہ نوچ نوچ کر سسکیاں ضبط کرنے لگی۔ وہ بار بار کرب سے اپنے پاؤں بستر پر رگڑ رہی تھی۔

اچانک بجلی زور سے چمکی اور پھر دیر تک کڑاکے کی آواز سنائی دیتی رہی...... لڑکی کے کان میں جیسے کوئی پھنکارا۔ "ہو سکتا ہے

تیرے ٹھکرائے ہوئے نے اسی وقت تیسری منزل سے چھلانگ لگا دی ہو یا کچھ کھا لیا ہو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ جب اتنی زور سے بجلی کڑکے تو سمجھو کہیں گری ضرور ہے۔ اور بجلی اس دھرتی پر جبھی گرتی ہے جب کسی مظلوم کی آہ عرش کو ہلا دے"

لڑکی پھڑ پھڑا کر کھڑکی کی طرف بھاگی اور اپنے نامراد عاشق کے گھر کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی جہاں ہر کمرے میں روشنی تھی "ارے اس گھر کے سارے لوگ اب تک جاگ کیوں رہے ہیں؟ ہو سکتا ہے سب اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے سب ابھی خون اور پانی میں بھیگی ہوئی لاش گلی سے اٹھا کا اندر لے گئے ہوں' ہو سکتا ہے اس نے کوئی تیز زہر پی کر ابھی ابھی کلیجے کے ٹکڑے اگل کر آنکھیں بند کی ہوں...... ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہے!" اس کے رویں رویں سے پکار آئی۔ اور اس نے بے تابی سے اپنی کانپتی ہوئی بانہیں کھڑکی سے باہر پھیلا دیں اور جھک کر گلی میں دیکھنے لگی۔ "اس وقت نیچے چھلانگ لگا دوں تو......؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا...... لیکن میری بے کس ماں میرے معصوم بھائیوں اور میری نوعمر بہن کو میری سجی ہوئی ڈولی کی طرح میری میت بھی تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی!

بجلی کی چمک سے لڑکی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ بے چارگی سے کھڑکی کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر رو دی۔ اس کے بالوں کو نم آلود ہوا تہہ و بالا کر رہی تھی اور موٹی موٹی بوندیوں کی چھینٹیں ہوا کے تیز جھونکوں میں اس کے جلتے ہوئے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اس کا دماغ ایک دم ماؤف ہو چکا تھا۔

تیز بوچھار پر بجلی پھر چمکی اور کھڑکی کے ماتھے پر جھومتے ہوئے بوندیوں کے سہرے کے پار اس نے اپنے نامراد عاشق کے گھر کا دروازہ کھلتے دیکھا اور ڈیوڑھی میں بہت سے لوگوں کے ہاتھوں پر سفید سفید کپڑوں سے ڈھکی ہوئی ایک لاش۔

"یقیناً وہ لاش ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں زور سے کھولیں اور پھر دیوانوں کی طرح دوڑ کر اپنے پلنگ پر گٹھری بن گئی۔

"آخر وہ مر گیا نا۔ مجھے نہ پا کر اس نے یہ دنیا ہی چھوڑ دی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا یہ کیوں ہو گیا۔" لڑکی پلنگ پر لوٹ لوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں جیسے اس نے اپنی محبوب کا دامن پکڑ رکھا ہو

"لڑکی بہت دیر تک بے تحاشہ روتی رہی۔

"ہائے تم کیوں مر گئے۔ تم مجھ سے کیوں چھٹ گئے میں تمہیں دور سے بھی دیکھ کر جی لیتی۔ اب کیسے کٹے گی یہ عمر۔" وہ بار بار منہ ہی منہ میں دہرا رہی تھی وہ کبھی اپنے بال کھسوٹنے لگتی اور کبھی گریبان کو جھٹکے دیتی...... اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے جسم کے پرخچے اڑا کر گلی میں اچھال دے اپنی بوٹیاں کتوں کوؤں کو کھلا دے۔

لیمپ کی تھرتھراتی روشنی کم ہو رہی تھی۔ لڑکی کی ماں لیمپ تیل ڈالنا بھول گئی تھی۔

لڑکی روتے روتے مضمحل ہو گئی....... اس کے آنسو بہنا بند ہو گئے اور ہاتھ پاؤں سن سے ہو کر پڑ گئے۔

اور اب اس کے بوجھل دماغ میں وہ خود ابھری۔ ایک خوبصورت نوعمر بیوہ! اس کے کپڑوں میں سیاہ رنگ کی بہتات تھی اور بال کھلے ہوئے۔ ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا ارتے ہوئے بالوں پر۔

ماں نے سلائی کی مشین سے سر اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا۔ ''میری بچی۔ میری لاڈلی میں اور تیرے بہن بھائی تیرے خطاوار ہیں....... مگر یہ تو بتا' تجھے مار کر ہم کیوں جئیں؟

''نہیں میری جان امی....... یہ میرا اور اس کا سودا ہے۔ وہ سچا تھا اور میں بھی جھوٹی نہیں تھی۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکی تھی....... پھر اس نے مجھے دیا اب میں بھی تو اسے کچھ دوں' مزار محبوب پر ساری مسکراہٹیں نوچ کر چڑھا دوں گی اپنی خوشیاں اپنے آنسوں سب اس پر سے نچھاور کر دوں گی۔ اب وہی میرا ماضی ہے اور وہی میرا مستقبل!''

اس کی چھوٹی بہن نے زندگی میں غالباً پہلی مرتبہ فکرمند ہو کر روتے ہوئے پوچھا ''آپا تم کو کیا ہو گیا ہے؟''

اور لڑکی نے بھی ذرا ہونٹوں کے گوشوں میں مسکرا کر جواب دیا ''تم نہیں سمجھتیں؟ میں قدیم داستان عشق کی ایک اور ہیروئن ہوں۔ میں شیریں بھی ہوں اور لیلیٰ بھی لڑکی سہیلیوں نے حیران ہو کر کہا۔ ''تم تو جیتے جی مر گئیں تمہارے بالوں کو کنگھی نہیں چھو سکتی۔ تمہارے جسم کو شوخ رنگ مس نہیں کر سکتے۔ تمہارے ہونٹوں کو مسکراہٹ سے بیر ہے' تمہاری آنکھیں بھی خشک نہ دیکھیں.......''

''میں!....... میں تو اپنے محبوب کی لوح مزار ہوں

دل و دماغ کے صفحات پر ایک اندوہناک مرثیہ لکھا جاتا رہا۔ اور رات اتنی ہی کالی اتنی ہی خوبصورت اتنی ہی گاتی اور برستی رہی۔

اور پھر جب بجلی ایک بار پھر زور سے کڑکی تو لڑکی نے پلنگ پر بیٹھ کر بلکنا رونا شروع کر دیا۔

''نہیں نہیں میں نے اسے کیسے ٹھکرا دیا' میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی' وہ میرے نانا اور میرے باپ کے گناہوں کا ذمہ دار کیوں ہو؟ میں بھی مر جاؤں گی' میں دیواروں سے اپنا سر ٹکراؤں گی' میں اپنا گلا گھونٹ لوں گی۔ میں اپنا گلا گھونٹ لوں گی

وہ نم ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے اپنا گلا بند ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے اور پھولے پھولے سرخ پپوٹے کھل بھی نہ سکتے تھے۔

اس کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے پانی برسنے کی سہانی آواز آ رہی تھی۔ اس نے تقریباً بجھتے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی

میں ذرا سی آنکھیں کھول کر اپنے دوپٹے کا ایک حلقہ بنایا اور گردن میں پہن لیا۔ دوسرے لمحے وہ بستر پر گر گئی۔

لیمپ بجھ گیا۔ تیز ہوا سے دروازے اور کھڑکیاں بجتی رہیں اور آنگن کے پختہ فرش پر بوندیاں بجتی رہیں

اس نے لمبا دھندلا پراسرار سفر طے کرنے کے بعد اللہ میاں کے حضور میں اپنی بوجھل آنکھیں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اللہ میاں کے سامنے اس کی دنیا کے کروڑوں مجبور انسانوں کی داستان کہنا چاہتی تھی۔ اس کی بھیگی بھیگی پلکیں کپکپا کر اٹھیں اور پھر گر گئیں۔ سامنے نور ہی نور تھا۔ خوب چمکیلا نور۔ پسینہ آور نور۔ بارش کی اور دھند پر طنز کرتا ہوا مغرور نور!

لڑکی کا جی جل گیا وہ اللہ میاں ہم جس موسم میں مر کر رو گئے اس سے تو تجھے مس تک نہیں۔ اور اس نے آنکھیں چندھی کر کے اس نور کو بیزاری سے دیکھا۔ سفید دیوار پر روشنائی سے نور کے بڑے سے چوکٹے میں "انور میاں بقلم خود" لکھا صاف نظر آیا۔ اس تحریر پر ہی تو اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے بھلے بھائی انور کے منہ پر ایک تھپڑ مارا تھا کہ تو نے دیوار کیوں خراب کی۔ برسوں سے تو کمروں میں سفیدی نہیں ہوئی اس پر سے یہ روشنائی کے دھبے!

لڑکی نے اپنی زندگی پر تھوڑا متعجب ہو کر بیزاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس پر بیماؤں جیسا سوگ دوبارہ حملہ آور ہو گیا۔ وہ فوراً ہی ایک سسکی کے ساتھ رونا شروع کرنے والی تھی کہ کھانسنے کھنکھارنے کی گونجتی گرجتی آوازیں سن کر وہ بے تحاشا کود کر کھڑکی کی طرف دوڑی

چکیلی ڈھلی ہوئی دھوپ میں پیتل کی لٹیا سورج کی طرح چمک رہی تھی اس کا نامراد عاشق کلیوں پر کلیاں کرتے ہوئے اپنی سوجی ہوئی لال لال آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔

لڑکی نے دھڑاکے سے کھڑکی بند کر دی اور پھر اس بند کھڑکی سے لگ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس کے ہونٹ کانپے بھینچی ہوئی مٹھیاں تھرتھرانے لگیں اور آنکھوں کو بے دردی سے ملنے لگیں اور پھر وہ ہونٹوں کے زاویے بگاڑ کر بچوں کی طرح چلائی "کمینے بے وفا مر جائے اللہ کرے......

اور دفعتاً اس کے پیٹ سے اٹھ کر کوئی شے جیسے گلے میں آ کر پھنس گئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گئی۔

"ہسٹریا کا دورہ ہے" کسی اجنبی آواز کے یہ الفاظ سن کر اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اپنی ماں اور بہن بھائیوں اور ڈاکٹر کی موجودگی سے بے پروا......

"نہیں نہیں......نہیں......" وہ سسکیوں کے درمیان کہتی رہی اور روتی رہی۔

◆◆◆